سہ ماہی اسلام آباد

ادبیات

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
Wasi 16

اکادمی ادبیات پاکستان

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

* * *

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

ششماہی محقق

اکادمی ادبیات پاکستان، محقق کے نام سے ایک تحقیقی وتنقیدی جریدہ شائع کرنے کا اہتمام کررہی ہے۔ جس میں اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں اور اُن کے ادب کے حوالے سے ہائر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) کے طے کردہ قواعد وضوابط کے مطابق درج ذیل زمروں میں تحقیقی وتنقیدی مضامین ومقالات شائع کیے جائیں گے:

۱۔ تحقیق: متنی / موضوعی

۲۔ مباحث: علمی / تنقیدی

۳۔ مطالعہ ادب: اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کا فکشن / شاعری

۴۔ تنقید و تجزیہ: اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کا فکشن / شاعری

۵۔ لسانیات

۶۔ مطالعۂ کتب

خواہش منداہل قلم حضرات درج بالا موضوعات میں سے کسی بھی موضوع پر مقالہ ارسال کرسکتے ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں گزارش ہے کہ:

☆ مقالہ A4 جسامت کے کاغذ پر ایک جانب کمپوز کروا کر بھیجا جائے۔ جس کے متن کا مسطر ۸x۵ انچ میں ہونا چاہیے۔ حروف نوری نستعلیق میں ہوں جن کی جسامت ’۱۲‘ پوائنٹ ہو۔ مقالے کے ساتھ انگریزی زبان میں اس کا عنوان اور خلاصہ (Abstract) (تقریباً ۲۰۰ الفاظ) بھی ارسال کیا جائے۔ مقالے کی ’’ہارڈ‘‘ اور ’’سوفٹ‘‘ کاپی دونوں ارسال کے جائیں۔

☆ مقالے کے عنوان کا انگریزی ترجمہ، مقالہ نگار کے نام کے انگریزی ہجے، موجودہ عہدہ اور مکمل پتہ بھی درج ہونا ضروری ہے۔

☆ ششماہی محقق میں اردو کے علاوہ دیگر پاکستانی زبانوں کے ادب پر بھی مقالے شائع کیے جائیں گے، تاہم اردو کے علاوہ دیگر پاکستانی زبانوں کے ادب پر بھی مقالے صرف اردو ہی میں شائع کیے جائیں گے۔ جن میں تحقیق: لسانیات، تدوین متن و تحقیق متن کے موضوعات، علمی وتنقیدی مباحث، مطالعہ ادب، تخلیقی ادب کے تنقیدی و تجزیاتی مباحث خاص طور پر شامل ہیں۔

برائے ترسیل مقالہ جات:

اختر رضا سلیمی (ایڈیٹر اردو)

Phone: +92-51-9269714

E.mail: ar.saleemipal@gmail.com

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

شمارہ نمبر 109، جولائی تا ستمبر 2016

نگران : پروفیسر ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
مدیر منتظم : ڈاکٹر راشد حمید

مدیر : اختر رضا سلیمی

اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ ۔ ایٹ/ون، اسلام آباد

مجلسِ مشاورتِ متن

ڈاکٹر توصیف تبسم
ڈاکٹر اقبال آفاقی
محمد حمید شاہد
ڈاکٹر وحید احمد

ضروری گزارشات

- ☆ مجلّے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے نگارشات کے ساتھ اپنا پورا نام اور پتہ بھی تحریر کریں۔
- ☆ شاملِ اشاعت نگارشات کے نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آرا کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔
- ☆ نگارشات اِن پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل بھیجی جا سکتی ہیں:

قیمت موجودہ شمارہ: -/100 روپے (اندرون ملک) 40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
سالانہ (4 شماروں کے لیے) -/400 روپے (اندرون ملک) 160 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
(رسالہ اندرون ملک بذریعہ رجسٹری اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔
ڈاک خرچ ادارہ خود ادا کرتا ہے)

طباعت:	علی یاسر	051-9269712
سرکولیشن:	میر نواز سولنگی	051-9269708

مطبع: NUST پریس، سیکٹر H-12، اسلام آباد

ناشر

اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
رابطہ: 051-9269721، 051-9269714
Email: ar.saleemipal@gmail.com
Website: www.pal.gov.pk

فہرست

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو پیش نامہ 9

اعجاز مانگ ہو، وہ ہنر ہو عطا مجھے (عقیدت)

ظفر اقبال میرا رنگِ کلام تجھ سے ہے 11
ناصر زیدی میں حمدِ ربِّ قدیر لکھوں 12
صفدر صدیق رضی میں چلتا رہا اب تک اپنے ہی ارادے سے 13

❖

شاہ محمد سبطین شاہجہانی اے شہنشاہِ عنایت شاہِ خیبر دیکھنا 14
مسرت لغاری میرے نُطق میں ہے جو روشنی 15
اکرم باجوہ، پروفیسر دل کے اجاڑ دشت کو مثلِ بہار کر 16
علی رضا رکھنا مرا محشر میں بھرم رحمتِ عالمؐ 17
عتیق احمد جلوۂ ذاتِ رسالت ساری دنیا پر عیاں 18

❖

اختر عثمان اشک آباد 19

کوئی اندازِ بیاں چھوڑ کے جانا اپنا (غزلیں)

ظفر اقبال بھیجتے ہیں جواب کیا، دیکھو 35
انور شعور نقش اک آدھ یہاں چھوڑ کے جانا اپنا 36
احمد صغیر صدیقی سلسلہ سارا یہ اک عشق کے آزار کا ہے 37
صابر ظفر مرے دیے نے جو تیرے دیے کی لو چھو لی 38
نصرت صدیقی جو آبروئے جلوۂ گلزار ہو گئے 39
محمد حنیف گھومتا ہوں مدار میں اپنے 40
اعجاز گل مرحوم تماشا ایک سا ہر روز کرتے جا رہے ہیں 41
سید نواب حیدر نقوی نسلِ انساں میں محبت کی کمی آج بھی ہے 42

اظہر ادیب	کرچی کرچی ہوا اندر سے پڑا ہے اب کے	43
طارق نعیم	کام جو کرنا نہیں تھا وہ بھی کرنا پڑ گیا	44
محبوب ظفر	یہ جانتا ہوں وفا کرے گا جہان کیسی	45
امداد آکاش	ترے بنائے کو بارِ دِگر بناتے ہوئے	46
اسرار ایوب	دشمن پہ بھی ایسے نہ شبِ ہجر عیاں ہو	47
شیدا چشتی	جب مرے مدِ مقابل تھی بغاوت میری	48
رستم نامی	کسی سے ہمیں پیار ہوتا نہیں	49
ڈاکٹر شکیل پتافی	تمھارے بعد بھی اپنا خیال رکھا ہے	50
شہزاد اظہر	بجھنے کا خوف سانس کی وِقت تو ہے نہیں	51
شہزاد نیّر	اُس حسنِ ہجر یاب کا طرفہ جمال دیکھ	52
ناز مظفر آبادی	ہر رنگ میں وہ شخص ہمارا تھا، ہمارا	53
جنید آزر	کس عرصۂ حیات میں رکھا گیا مجھے	54
تسنیم صنم	رازِ سربستہ یہی ہم نے چھپایا ہوا ہے	55
ممتاز راشد لاہوری	اگرچہ حُسن کی نشو و نما ضروری ہے	56
کاشف حسین غائرؔ	کب اُسے دیکھتے نگاہ بھری	57
حفیظ اللہ بادل	دیکھنے والوں کی آنکھوں ہی میں ارزانی ہے	58
شاہد ماکلی	جو پل بھی یہاں گزر رہا ہے	59
عنبرین صلاح الدین	دِل کہتا ہے دردر ہے اور دِل نہ رہے	60
احمد عرفان	میں نہ کہتا تھا مرے بھائی نہیں ہو سکتی	61
سید کامی شاہ	وہاں سے آئے گا وہ اور میں ملوں گا اُسے	62
نعمان فاروق	اُس نے پہلی بار چھوا ہے	63
فرح جعفری	کبھی دوستوں کی قطار میں، کبھی دشمنوں میں شمار ہوں	64

ہر تحفۂ سخن کو سبو دے دیا گیا (نظمیں)

ڈاکٹر توصیف تبسم	آخری مکالمہ	65
ڈاکٹر احسان اکبر	*پچھتر کروڑ اہلِ ایمان	66
حسن عباس رضا	ماضی کے جھروکے سے جھانکتی نظم	70
سلطان کھاروی	ماہیے	71
محمد مشتاق آثم	قید سے لمبی نہیں ظلم کی عمر	72

غیور حسین بے خوابی میں لکھی نظم 73
عمران ازفر ریشم کاتے سانس 75

یہ وہ قصہ جو ہمارا ہی سنایا ہوا ہے (افسانے)

حسن منظر ادھ کھلے پھولوں کا زمانہ 77
محمد الیاس خاندانی لوگ 88
آغا گل کاغذی دوست 92
حنیف باوا قصہ اس بہری، یخ بستہ رات کا 98
محمود عالی ماکھا حوالدار 102
شاہین کاظمی آخری پنکھ........ 107
معظمہ تنویر قلعہ بند شہزادی 111
محمد جمیل اختر ٹوٹی ہوئی سڑک 121
احمد حسن رانجھا، ڈاکٹر بھوت بنگلہ 124
نازیہ خلیل عباسی کسک 127

مری داستان عجیب ہے (خودنوشت، سفرنامہ)

سلمان باسط کھاریاں اور میرے اساتذہ 133

◆

ڈاکٹر نجیبہ عارف جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال 146
محمد عارف ناران میں --- 162

مصوری

غلام محی الدین وصی حیدر: جمالیاتی شعور کا مصور 173

اُس نے تفویض کیے اپنے مطالب مجھ کو (عالمی ادب)

کم سی آنگ ۔ اوک / اطہر قیوم موجین کا سفر 177
پی ۔ بی شیلے / سید ضیا الدین نعیم نظم 199
منوج کمار پانڈے / خالد فرہاد دھاریوال خزانہ 200
مارگریٹ ایٹوڈ / اعظم ملک خوشگوار اختتام 216

خصوصی گوشہ (عربی ادب) (ا)

دارا عبداللہ / ادریس بابر کوڑا کرکٹ کی یاد / لفظوں کا دھواں 221
موناکریم / ادریس بابر ایک مجسمے کی موت 222

مونا کریم/ادریس بابر	میں اور وہ	224
دارین طاطور/ادریس بابر	مزاحمت	225
دارین طاطور/ادریس بابر	قفس اداس ہے----	227
اشرف فیاض/ادریس بابر	نظمیں (۱۔۲)	229

(۲)

آدم شیر	زکریا تامر: ایک تعارف	230
زکریا تامر/آدم شیر	مجسمہ	231
زکریا تامر/آدم شیر	دوسرا گھر	231
زکریا تامر/آدم شیر	خاموش آدمی	232
زکریا تامر/آدم شیر	اندھا	232
زکریا تامر/آدم شیر	دریا کی خاموشی	233

میرے جذبوں کو میسر تھی قیادت میری (پاکستانی زبانوں سے تراجم)

انگریزی

عالمگیر ہاشمی/الیاس بابر اعوان	چھیاسویں برس کی دہلیز پہ دھرا ایک سانحہ	235
توفیق رفعت/الیاس بابر اعوان	گاؤں کی لڑکی	236

براہوی

افضل مراد/جہاں آرا تبسم	میرا چندا	237

بلوچی

اے آر داد/واحد بخش بزدار	بے نوائی	239

پشتو

ابراہیم رومانؔ/ابراہیم رومانؔ	مٹی کی خاطر	241
ڈاکٹر نصیب اللہ سیماب/اجمیر افغان	بنجارا	244

پنجابی

قیوم طاہر/سید ضیا عالدین نعیم	لفظوں کو تحریر جو کرتے ہیں	249
جمیل احمد پال/سلطان کھاروی	خطا کار	250

چھاچھی

منظور عارف/علی یاسرؔ	پرایا گھر	253

سرائیکی

خواجہ غلام فرید/سید نابش الوری وقتِ جدائی آیا 254
خواجہ غلام فرید/سید ضیاء الدین نعیم کیا حال سناؤں دل کا 256

سندھی

ڈاکٹر رسول میمن/شاہد حنائی گدھوں کی آزادی 257
ڈاکٹر اسحاق سمیجو/حبدار سولنگی وہ 262
آسی زمینی/ابرار ابڑو بوسہ 263

کشمیری

غلام حسن بٹ/غلام حسن بٹ شریف چور 264

گوجری

رانا فضل حسین/رانا غلام سرور سُورن نگریا سونے کا شہر 267

ہندکو

احمد حسین مجاہد/احمد حسین مجاہد بڑے شاہ صاحب کی وصیت 270

آنے والوں کی امانت ہیں تمھاری سوچیں (خصوصی گوشہ: پوٹھوہاری ادب)

مضمون

شیراز طاہر جدید پوٹھوہاری ادب 271

افسانہ

ڈاکٹر رشید نثار/شعیب خالق لمحے بُنتی اجرک 280
شعیب خالق/شعیب خالق زخمِ حجم 283
شیراز طاہر/اختر رضا سلیمی گُھتے 287
علی عدالت/شیراز طاہر ایک چھوٹی سی بڑی کہانی 293
ارشد چہال/اختر رضا سلیمی یادوں کا دریچہ 294
قمر عبداللہ/قمر عبداللہ نمرود کی آنکھ 302
ماجد وفا عابدی/ماجد وفا عابدی نقاب زادی 306
ثاقب امام رضوی/جہانگیر عمران سُونے آنگن 309
شاہد لطیف ہاشمی/شیراز طاہر روشن شیشے پر آنکھ 312
شیراز اختر مغل/شیراز طاہر ڈر 316

منور حسین عاصی/مریم حیات ماگی ڈنگر اور ڈنگر سوچ 318
نعیم اختر اعوان/نعیم اختر اعوان رکی سانسیں 324

شاعری

باقی صدیقی/شیراز طاہر جوبن 327
باقی صدیقی/شیراز طاہر کل 328
اختر امام رضوی/شیراز طاہر پُرا 329
سید طارق مسعود/شیراز طاہر بجھارت 330
شیراز طاہر/شاہد لطیف ہاشمی اُس رات 331
یاسر کیانی/شاہد لطیف ہاشمی مان 332
علی ارمان/شیراز طاہر چیخیں 333
جہانگیر عمران/جہانگیر عمران ڈرتے ڈرتے کب تک جیتے رہیں گے ہم 334
شاہد لطیف ہاشمی/شیراز طاہر آس 335
آلِ عمران/شیراز طاہر اللہ 336
شیراز اختر مغل/شیراز طاہر جلتی ہتھیلی 337
مختار کربلائی/شیراز طاہر یاد 338
حمید کامران/نعمان رزاق نوحہ 339
شکور احسن/شیراز طاہر دائرے 340
عمران عامی/رفاقت رازی نئے نویلے کپڑے لوگ پہنتے ہیں 341
فیصل عرفان/فیصل عرفان خوابوں کی گٹھڑی 342
اختر رضا سلیمی/شیراز طاہر مست جوانی 343
اختر رضا سلیمی/اختر رضا سلیمی صوفی اور شاعر 344

☆ ☆ ☆ ☆

اداریہ

ادبیات کا تازہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس سے قبل ہم نے ادبیات کا ایک خصوصی شمارہ احمد ندیم قاسمی نمبر پیش کیا تھا، جس میں ممتاز شاعر، ادیب، کالم نگار اور مدیر احمد ندیم قاسمی کی ادبی خدمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جسے ادبی اور عوامی حلقوں میں بے حد سراہا جا رہا ہے اور تادم تحریر تحسینی پیغامات موصول ہو رہے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب اس کی کسی کوشش کو سراہا جاتا ہے تو نہ صرف اس کو مسرت کا احساس ہوتا ہے بل کہ کام کرنے کی لگن بھی بڑھتی ہے۔

زیرنظر شمارہ اگرچہ عام شمارہ ہے تاہم ایک حوالے سے یہ خصوصی بھی ہے۔ وہ یوں کہ اس میں ہم نے پوٹھوہاری ادب کے لیے ایک خصوصی گوشہ مختص کیا ہے۔ جس میں پوٹھوہاری کے ممتاز لکھنے والوں کی شعری و نثری تخلیقات کے اردو تراجم شامل کیے گئے ہیں۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ پوٹھوہاری سے تراجم ادبیات کا حصہ بنتے رہے ہیں تاہم اتنے بڑے پیمانے پر پوٹھوہاری سے تراجم پہلی مرتبہ ادبیات کا حصہ بن رہے ہیں۔ صرف ادبیات پر ہی موقوف نہیں کسی بھی ادبی جریدے میں پوٹھوہاری زبان و ادب سے اتنے زیادہ اردو تراجم پہلی مرتبہ ایک ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ادبیات اگرچہ اردو میں شائع ہوتا ہے لیکن یہ صرف اردو زبان کے ادب کا ترجمان نہیں بل کہ تمام پاکستانی زبانوں کے ادب کا ترجمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے اس میں اردو کی طبع زاد تخلیقات کے ساتھ ساتھ دوسری پاکستانی زبانوں کے تراجم بھی شائع ہوتے رہے ہیں اور شاید ہی اس کا کوئی شمارہ ایسا ہو

جس میں دوسری پاکستانی زبانوں کے تراجم شامل نہ ہوں۔

کچھ عرصے قبل ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ادبیات میں باری باری تمام پاکستانی زبانوں کے گوشے بھی شائع کیے جائیں تا کہ اردو ادب کے قارئین دیگر پاکستانی زبانوں کے ادب سے بھی روشناس ہو سکیں۔ اس کا آغاز ہم نے پوٹھوہاری سے کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کی بڑی زبانوں بالخصوص سندھی، پنجابی، بلوچی اور پشتو کے تراجم ادبیات کے علاوہ کئی دوسرے اردو جرائد میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں جب کہ دوسری زبانوں خاص کر سرائیکی، پوٹھوہاری، ہندکو، براہوی، بلتی وغیرہ کے اول تو تراجم چھپتے ہی نہیں اور اگر چھپتے بھی ہیں تو نسبتاً کم تعداد میں۔ ہماری کوشش ہو گی کہ پہلے ہم ان زبانوں کے گوشے شائع کریں، جن کے اردو تراجم عموماً کم کم چھپتے ہیں۔

پوٹھوہاری کے اس خصوصی گوشے کے علاوہ زیرِ نظر شمارے میں عربی ادب کے حوالے سے بھی ایک خصوصی گوشہ مختص کیا گیا ہے جس میں عربی کے چار اہم معاصر شعرا کی دو دو نظموں اور ایک فکشن نگار کی پانچ مختصر کہانیوں کے تراجم شامل ہیں۔

ان خصوصی گوشوں کے علاوہ اردو کے ممتاز شاعروں اور ادیبوں کی طبع زاد تخلیقات کے ساتھ ساتھ دیگر پاکستانی زبانوں؛ سندھی، پنجابی، بلوچی، پشتو، براہوی، گوجری اور ہندکو اور عالمی ادب سے تراجم کے تحت بھی کچھ تراجم شاملِ اشاعت ہیں۔

اس شمارے کا سرورق ممتاز مصور وصی حیدر نے خصوصی طور پر بنایا ہے جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔

امید ہے حسبِ سابق آپ کو ہماری یہ کاوش بھی پسند آئے گی۔ ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

ظفراقبال

میرا رنگِ کلام تجھ سے ہے
گم شدہ سا یہ نام تجھ سے ہے

حمد یوں ہی نہیں کیا کرتا
کوئی مجھ کو بھی کام تجھ سے ہے

اور کوئی شناخت ان کی نہیں
یہ دریچے، یہ بام تجھ سے ہے

شور ہے دل میں ہر گھڑی ہر وقت
اور یہ رونق تمام تجھ سے ہے

میری ترجیحِ اولیں رہنا
یہ گزارش مدام تجھ سے ہے

جس کی قسمت میں بھی اسیری ہو
دانہ تجھ سے ہے، دام تجھ سے ہے

اس ہوس کا خُمار تیرے طفیل
اس ہوا کا خرام تجھ سے ہے

گریۂ ہجر کے ہیں سب اوقات
صبح تجھ سے ہے، شام تجھ سے ہے

کیوں نہ ٹھہرے اُمیدوار ظفرؔ
رحمتِ خاص و عام تجھ سے ہے

☆☆☆☆

ناصر زیدی

میں حمد ربِّ قدیر لکھوں
نذیر لکھوں، بشیر لکھوں

دلوں کے تُو حال جانتا ہے
تجھے نہ کیوں میں خبیر لکھوں

نہیں ہے تجھ سا کوئی کہیں بھی
میں ہو کے تیرا اسیر لکھوں

بہت سے ہیں نام تیرے مولا
تجھے میں قادر، قدیر لکھوں

ہیں سارے حالی ترے، موالی
ہر ایک کا دستگیر، لکھوں

نظر ہو اس سمت بھی کرم کی
میں خود کو تیرا فقیر لکھوں

تو ربِّ عالی، ہے سب کا والی
تجھے میں ناصرؔ، نصیر لکھوں

☆☆☆☆

صفدر صدیق رضی

میں چلتا رہا اب تک اپنے ہی ارادے سے
آیا ہوں تری جانب اک اور ہی جادے سے

پیراہنِ عصیاں میں اک تنگِ بدن ہوں میں
تُو ڈھانپ مجھے یا رب رحمت کے لبادے سے

باطل کے مقابل جو بے تیغ بھی لڑتا ہے
سالار بناتا ہے تُو اُس کو پیادے سے

ہر آن میسر ہے جب تیری عطا یا رب
ہر پل ہے خطا ممکن اس آدمی زادے سے

ہر چند ادق ہے تُو میرا ہی سبق ہے تُو
میں یاد تجھے پیہم رکھوں گا اعادے سے

☆☆☆☆

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

اے شہنشاہِ عنایت شاہِ شبرؓ دیکھنا
خستہ حالوں کی طرف سلطان و سرور دیکھنا

مجھ تہی داماں گدا کو کاش پھر سے ہو نصیب
گنبدِ خضریٰ کی جانب آنکھ بھر کر دیکھنا

اُن کے قدموں کی شعائیں تاجِ شاہی ہیں مجھے
اے شہنشاہو! ذرا میرا مقدر دیکھنا

ظلم کی تاریک راہوں پہ پڑے ہیں اُمتی
دیکھنا ان کی طرف مہرِ منور دیکھنا

نورِ ایماں سے دلوں کے جام ہیں خالی حضور
میرے آقا اس زبوں حالی کا منظر دیکھنا

کھیتیاں ایمان و دیں کی پھر خزاں آثار ہیں
ابرِ رحمت نکہتِ سَرو و صنوبر دیکھنا

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں اہلِ دل مغموم ہیں
اس طرف بھی مالکِ محراب و منبر دیکھنا

☆☆☆☆

مسرت لغاری

میرے نُطق میں ہے جو روشنی
ترےؔ اسمِ پاک کی بھیک ہے

تریؔ خاکِ پا کا ہے معجزہ
یہ جو جاں ملی، جو اَماں ملی

ترےؔ تذکرے کی عطا ہے یہ
مرے فکر و فن کو جِلا ملی

تراؔ عشق تھا مرا ہم سفر
سدا تیرےؔ در پہ پنہ ملی

☆☆☆☆

پروفیسر اکرم باجوہ

دل کے اجاڑ دشت کو مثلِ بہار کر
آقائے دو جہاں کی ثنا بار بار کر

رازِ حیات آپؐ کے نقشِ قدم میں ہے
جو آپؐ کا ہے راستہ وہ اختیار کر

مطلوب گر ہے مرتبہ حُبِ رسولؐ کا
پونجی یہ جسم و جان کی اُن پر نثار کر

بارِ دگر جو دیکھتا ہے شہرِ آرزو
اپنی نگاہِ شوق کو پھر بے قرار کر

شوقِ وصال میں ترا دل بھی تڑپ اُٹھے
چشمِ طلب کو ایسے کبھی اشک بار کر

اُنؐ کے بغیر کون ہے محشر میں آسرا
ہے مغفرت کی آرزو تو اُنؐ سے پیار کر

اکرم شبِ حیات سے باہر نکل گیا
نعتِ نبیؐ کی روشنی دل میں اُتار کر

☆☆☆☆

علی رضا

رکھنا مرا محشر میں بھرم رحمتِ عالمؐ
رہ جاؤں نہ محرومِ کرم رحمتِ عالمؐ
کس طرح سے حق آپؐ کی مدحت کا ادا ہو
اس سوچ میں ہوں عمر ہے کم رحمتِ عالمؐ
کب دوسرے نبیوں کو عطا ہو سکا سرکارؐ
جو آپؐ کا ہے جاہ و حشم رحمتِ عالمؐ
ہمت بھی تو اب چھوڑ گئی ساتھ ہمارا
سہہ سہہ کے زمانے کے ستم رحمتِ عالمؐ
دنیا میں بھی ہو پیشِ نظر آپؐ کا اُسوہ
محشر میں بھی رہ جائے بھرم رحمتِ عالمؐ
ایسا بھی ہوا آپؐ کی چاہت میں کئی بار
اشکوں سے ہوئی نعت رقم رحمتِ عالمؐ
اب اس کے سوا پاس مرے کچھ بھی نہیں ہے
کچھ بھی نہیں جز دیدۂ نم رحمتِ عالمؐ
میں آپؐ کی نسبت ہی لیے پھرتا ہوں سرکارؐ
ہے آپؐ کی عظمت کی قسم رحمتِ عالمؐ
بخشش کی ضمانت ہے حضور آپؐ کی مدحت
اس آس پہ تھاما ہے قلم رحمتِ عالمؐ
آلودگیِ دل سے رہائی مجھے مل جائے
پلنے لگے خواہش کے صنم رحمتِ عالمؐ
اک عمر سے احساسِ خطا ساتھ ہے میرے
مدت سے ہوں میں وقفِ الم رحمتِ عالمؐ

عتیق احمد

جلوۂ ذاتِ رسالت ساری دنیا پہ عیاں
جس سے نسبت پانے والے ایں جہان و آں جہاں

چاہت اس ذاتِ گرامی کی بنی سوزِ نہاں
جس کی توصیف و ثنا میں خود خدا رطب اللساں

یوں بسے محبوبؐ رب احساس میں اور سوچ میں
پھول میں جیسے ہو خوشبو جسم میں ہو جیسے جاں

سوچ کی تاریکیوں میں آپؐ اک روشن چراغ
جلتے صحراؤں کی دوپہروں میں جیسے سائباں

ہر گدا بابِ نبیؐ پہ شاہِ ہفت اقلیم ہے
جن کے قدمینِ مبارک سے مشرفِ آسماں

ان سخی ہاتھوں سے کوثر کا ملے ہم کو بھی جام
حشر کے دن پیاسی دنیا کے جو ہوں گے میزباں

☆☆☆☆

اختر عثمان

مرثیہ

طبعِ چراغ ساز، شفق رَو ہے اِن دنوں
ماہِ ولائے فکر میں کیا لَو ہے ان دنوں
مضمون ایک نکتے میں سَو سَو ہے ان دنوں
مولا کی مہر، مہ بھی مہِ نَو ہے ان دنوں
سلماں کے اِشتیاق سے قنبر کے حِلم تک
لفظوں کا قافلہ ہے رواں بابِ علم تک

مولا! جہاں ہوں دعبل و وائل بھی تنگ دست
واں دسترس دکھائے مرا دستِ حق پرست
تبریز کے قدومِ مبارک میں ہو نشست
خود کو عناں گسستہ کہے انوریٔ مست
تیغِ قلم کو جنگ کا میداں ہو ایک ہاتھ
جامِ ولائے بوذر و سلماں ہو ایک ہاتھ

یا رب متاعِ باغِ سخن گُل بہ گُل رہے
درویش پر عنایتِ ختمِ الرسلؐ رہے
نکتہ بہ نکتہ سرِّ بیاں سب پہ کھل رہے
ہر سطر پر نوازشِ مولائے کُل رہے
اعجاز ماند ہوں، وہ ہنر ہو عطا مجھے
رضواں بتائیں شاعرِ آلِ عبا مجھے

لازم ہے پہلے ذکرِ حسینانِ کائنات
جن کے لیے وجود میں آئے ہیں معجزات
جن کے طفیل موت پہ حاوی ہوئی حیات
سایہ گُناں ہے جن پہ رسولِ زمن کی ذات
پہلے جو بنتے دیکھتے تھے عالمین کو
مدّت سے انتظار تھا جن کا زمین کو

مدحت ہے ایک بحرِ عمیق اے شہِ شہاں
بندہ الست سے ہے غریق، اے شہِ شہاں
اے سَم زدہ حسن کے رفیق، اے شہِ شہاں
اے خواجۂ انیس و خلیق ، اے شہِ شہاں
ہو اِذن تو یہ بحر ہے کیا، اَوج موج کیا
تنہا سہی فقیر مگر اصلِ فوج کیا

شعبان ہے ظہورِ حسینانِ کعبتین
شعبان مومنین کی لَو، سب کا نُورِ عین
شعبان ہی میں آتی وہ چندرماں کی رَین
جس میں زمیں پہ آئے جگر گوشۂ حسین
ہم باربار کہتے ہیں ”یا قائمؑ! العجل“
بس ورد کرتے رہتے ہیں ”یا قائمؑ! العجل“

شعبان تو مہینہ ہی ختم الرسلؐ کا ہے
شعبان تو خزینہ ہی مولائے کُل کا ہے
شعبان، فاطمہؑ کی دعا ، دَور گُل کا ہے
شعبان ہی میں نکتہ سخیِ سُبُل کا ہے
انوارِ کربلا کا ظہور اِس میں ہو گیا
قائمؑ کے دَم سے نور ہی نور اِس میں ہو گیا

کھاتے ہیں رشک حضرتِ یوسف بھی اِس جگہ
جُود و سخا یہیں ہے ، تلطّف بھی اِس جگہ
شادی بھی ہے یہیں پہ ، تاسف بھی اِس جگہ
جائز نہیں اگرچہ تکلّف بھی اِس جگہ
پھر بھی درود پڑھنا اصولِ اصول ہے
اور کیوں نہ ہو متاعِ علی و رسول ہے

شعبان تیرے جوف میں اُترا زمن کا چاند
پہلا اور آخری ہے یہ ذُوجِ حسنؑ کا چاند
گویا جسے غروب نہیں اُس چلن کا چاند
نُورِ مہِ جمالِ خدا، پنجتن کا چاند
واللہ کیا جلال ہے، کیا اِس کی جُوت ہے
ظلمت بھلے کہیں بھی چھپے موت، موت ہے

تشریف اِسی میں لائے تھے عبّاسؑ با وفا
شبیرؑ کو ملا علی اکبرؑ سا معجزہ
اُترا اِسی مہینے میں اصغرؑ سا جاں فزا
قاسمؑ سا گُل قبا بھی سرِ شاخ کھل اٹھا
اِس میں ہی با شرف مرے مولا تقیؑ ہوئے
جلوہ کناں امامِ علیِ نقیؑ ہوئے

شعبان بُولہب کے کلیجے میں تیر ہے
ابتر کو یہ مہینہ جہنّم نظیر ہے
کوثر کی اِس میں باس، مہینوں کا پیر ہے
شعبان ہی تو حُجتِ شاہِ شہیر ہے
جس میں حسنؑ کو بھائی ملا دِن اسی میں ہے
زینبؑ کی آرزو متمکّن اسی میں ہے

قائمؑ اِسی میں اُترے تھے نرجس کی گود میں
سِرِ عسکریِ بے کس و مُفلس کی گود میں
کیا نُور جلوہ گر ہوا خُوش جس کی گود میں
ماں کے سوا وہ جاتے بھلا کس کی گود میں
غیبت صغیر ہو کہ کبیر اِس میں شک نہیں
ہاں، خوانِ مصطفیٰؐ و علیؑ بے نمک نہیں

اُتریں اِسی مہینے میں خود بھی وہ باشرف
جن کی ثنا ہے اِنس و ملائک میں ہر طرف
وہ جن کے دُکھ میں اشک فشاں ہیں دُرِ نجف
دو بھائی ہیں امام پہ تابع ہیں جُوں خلف
خطبے ہیں اُن کے جیسے کہ تلمیح پڑھتے ہیں
عبّاسؑ اُن کے نام کی تسبیح پڑھتے ہیں

یہ رات جس سے مانگتے ہیں دِن بھی روشنی
سورج کو مات کرتی ہے اس شب کی چاندنی
یہ رات سیّدہؑ کی کنیزی میں ہے غنی
گیارہ کا نُور ایک ہُوا اور یہ بنی
پڑھ لو اگر غلامِ علیؑ و رسولؐ ہو
اعمال کے بغیر بھلا کیا قبول ہو

لفظوں کی روشنی مہ و خور سے لیے ہوئے
حاضر ہوں بارگاہ میں ڈر سے لیے ہوئے
مولا! یہ چند بین ہیں، سر سے لیے ہوئے
کچھ بند، جھولیوں میں ہیں پر سے لیے ہوئے
ای آسمان تاب! خدا را قبول کن
این نذر حرف و صوت جدا را قبول کن

کفشی رہے امیر و کبیر اِس مقام پر
کیا کیا غنی ہوئے ہیں فقیر اِس مقام پر
فائز رہے ہیں حضرتِ میر اِس مقام پر
پڑھتے رہے انیس و دبیر اِس مقام پر
تم آئے تو وہ بزم خیالوں میں بس گئی
بجھتے ہوئے چراغ کی لو کچھ اُکس گئی

مقصودِ قبلتینؑ ہے اور یہ فقیر ہے
زہراؑ کا نورِ عینؑ ہے اور یہ فقیر ہے
بے احتساب دَین ہے اور یہ فقیر ہے
لطفِ درِ حسینؑ ہے اور یہ فقیر ہے
یہ ہے کرم حسین علیہ السّلام کا
اک آن میں بڑھا دیا رتبہ غلام کا

کس کی زبان مدحِ شہِ کربلاؑ کرے
درویشِ ہیچ مایہ و بے ہیچ کیا کرے
ہاں ایک وہ، کہ جس کی مدد خود خدا کرے
نعلینِ مصطفیٰؐ پہ دھرے ہونٹ، وا کرے
ہو اِذن اس طرف سے تو مشکل کشائی ہے
ورنہ حقیر سارے ہُنر کی کمائی ہے

میں کون اور مدحتِ شاہِ شہاںؑ کہاں
تاب و توانِ سیرتِ معجز بیاں کہاں
قطرہ کہاں، وہ سلسلہء بے کراں کہاں
موجِ ولا فقیر کو لائی کہاں کہاں
روشن بنامِ صاحبِ نہج البلاغۃؑ ہوں
آخر غلامِ صاحبِ نہج البلاغۃؑ ہوں

بے چہرگی کو حُسنِ نمو دے دیا گیا
کم رُو کو ذوقِ آئنہ رُو دے دیا گیا
سیری کا اِذن ہر لبِ جُو دے دیا گیا
ہر تشنہء سخن کو سبُو دے دیا گیا
پیاسا کوئی رہے تو یہ اس کا نصیب ہے
بس اک درود ، موجہء کوثر قریب ہے

لفظوں میں اُس کلام کی تاثیر ہے تو ہوں
تابندہ روشنائیِ تحریر ہے، تو ہوں
اک خواب اور خواب کی تعبیر ہے تو ہوں
فیضِ قدومِ حضرتِ شبیرؑ ہے تو ہوں
یہ سب صلہ بفیضِ ولائے حسینؑ ہے
خود کچھ نہیں کہا، یہ عطائے حسینؑ ہے

یہ سب مٹھاس اکبرِ شیریں سخن کی ہے
خوشبو جو ہے، یہ قاسمِ گُل پیرہن کی ہے
یہ کاٹ بانٹ غازیِ باطل شکن کی ہے
المختصر کہ سب یہ مدد پنجتن کی ہے
روشن کند ز نور ازل طبع تیرہ را
تابی بدہ کہ ماہ کُنم چشم خیرہ را

طالب رسولِ پاکؐ سے ہوں ہر مدد کا میں   وصف آپ کے ورائے تعلّی ہیں منتقم
دریوزہ گر ہوں صرف علیِ صمدؑ کا میں   بے وارثوں کی آپ تسلّی ہیں منتقم
جاروب کش ہوں پاک حسنؑ کی لحد کا میں   لاریب، آپ ہی متولّی ہیں منتقم
پُرسہ امامِ عصرؑ کو دیتا ہوں جد کا میں   وا چشم و دل برائے تجلّی ہیں منتقم
کیجے قبول پرسہ کہ دل کو سکون ہو   سیراب کن ز آب وصال این تراب را
سینے سے بار بار ٹپکتا ہے خون ہو   ای نور عصرؑ! جلوہ بدہ آفتاب را

ای فخر آسمان و زمین و زمان ، بیا   آنکھیں ہیں انتظار میں یا صاحب الزّماںؑ!
ای تو کہ رشک قامت سرو روان، بیا   آئیں اب اس دیار میں یا صاحب الزّماںؑ!
جان بستہ ام بہ نام تو از دل بہ جان، بیا   اب دل نہیں قرار میں یا صاحب الزّماںؑ!
ای صاحب الزّماںؑ! سوی این جہان بیا   عالم ہے انتشار میں یا صاحب الزّماںؑ!
گوھر ز بحر بردم و در سلک سفتہ ام   فتنہ فرو ہو، آیئے، تعجیل کیجیے
من در مطاف باغ پی تو شگفتہ ام   مولاؑ، روِش جہان کی تبدیل کیجیے

﴿مطلع دوم﴾

جب دشتِ کربلا میں دہم کی سحر ہوئی   پہنچی اذانِ اکبرِ والاؑ حجاز میں
شرقی ورق پہ سطرِ خفی مشتہر ہوئی   خط چشم و گوش کا نہ کھنچا امتیاز میں
شمشیرِ سُرمہ سا سپرِ مہ کے سَر ہوئی   دید و شنید ایک ہوئے ارتکاز میں
گویا کہ درپئے شہِ جن و بشرؑ ہوئی   گریاں تھے سب نماز سے پہلے نماز میں
انصار اٹھ کھڑے ہوئے فرضِ نماز کو   گویا شہِ شہاںؑ رہے شاہوں کے سامنے
دیکھا تیمّمِ شہِ والا حجازؑ کو   تصویرِ مصطفیٰؐ تھی نگاہوں کے سامنے

صیقل کچھ اور ہو گئے آئینہ رو تمام   آگے امامؑ ، پیچھے گہر ہائے صف بہ صف
مٹّی سے تھے اَٹے ہوئے شب رشک مُو تمام   پہلی قطار میں تھے عزیزانِ با شرف
اُن کے طواف میں تھے اِدھر مشک و بُو تمام   اُن کے عقب نشستہ تھے انصار سر بکف
خم تھے نیاز و عجز میں فرق و گُلو تمام   کعبہ کے مہر ، ماہِ مدینہ ، دُرِ نجف
تسبیح میں پُنے ہوئے دارالسّلام کے   ضرغامہ و حبیب و زہیر ابنِ قین تھے
سب تھے ادائے فرض میں پیچھے امامؑ کے   سارے فدائے پائے شہِ مشرقین تھے

محوِ صلات، محوِ خشوع و خضوع میں
اک مقتدی صنوبرِ والاؑ شروع میں
صف دار سرو بعد میں، باہم رکوع میں
یکساں قیام و سجدہ، غروب و طلوع میں
زاری میں سَر اٹھا کے دوبارہ جھکاتے تھے
دو رکعتوں میں رحل صفت بیٹھ جاتے تھے

سجادۂ ورق پہ رہی چشمِ ممتحن
لڑکا کوئی، جوان کوئی اور کوئی مسن
سبزہ کسی کے خفتہ تھا، کوئی صغیر سِن
سرسبز تھے کہ تھے نگراں شاہِ انس و جن
تیغِ قلم سے لکھ گئے سب اپنے بخت کو
خوں دے کے سُرخرو ہوئے دیں کے درخت کو

پڑھتے تھے متّقی جو تحیات میں درود
وردِ زبان رہتا تھا دِن رات میں درود
ہر قول میں سلامتی، ہر بات میں درود
آیات میں اساس تھی ، آیات میں درود
جائیں ہوں اُن چُنے ہوئے اشخاص پر نثار
کوثر پہ جان دیتے تھے، اخلاص پر نثار

تکبیر اُن کا آئنہ، توحید میں پلے
تفسیر اُن کے قلب تھے، تمجید میں پلے
تکفیر اُن سے دُور تھی، تائید میں پلے
تشہیر اُن کو منع تھی، تحدید میں پلے
تلوار اُن پہ موم رکوع و سجود میں
تیر اُن کے تن پہ پھول قیام و قعود میں

ناگاہ چند تیر مصلّوں پہ آ گرے
جانا نمازیوں نے کہ اب اُن کے دِن پھرے
پوری نماز ادا کی، نمازی تھے وہ زرے
گھیروں کو توڑ توڑ کے خود آخرش گھرے
کیا جنگجو لڑے کہ اماں دے کے چل دیے
پائے شہِ حجازؑ میں جاں دے کے چل دیے

سب رہروانِ خلد ہوئے اقربا، رفیق
مشفق، مطیع، معرکہ فرما مگر خلیق
ٹکڑے ہوئے جدال میں نیلم، گہر، عقیق
خوش پوش، خوش کلام، خوش اقبال، خوش طریق
عابس، ھلال، جون، حبیب اب وہاں نہ تھے
حُر و زہیر اور شبیب اب وہاں نہ تھے

کچھ قبل تک دفاع کو سب آس پاس تھے
روشن تھا دِل کہ گوہر و الماس پاس تھے
عونؑ و محمدؑ ایک طرف، پاس پاس تھے
قاسمؑ بھی تھے، اکبرؑ و عباسؑ پاس تھے
بکھری ہوئی تھی دشت میں اب مِلک شاہ کی
ملعون لُوٹ لے گئے کُل مِلک شاہ کی

اصغرؑ تڑپ رہے تھے اُدھر خیمہ گاہ میں
نوخیز گُل بکس گیا پانی کی چاہ میں
قطرہ بھی نہ تھا حرمِ عرش جاہ میں
بے شیر بے امان تھا ماں کی پناہ میں
رونے کو منہ کھلا تھا پہ آواز ماند تھی
کشتِ رسولؐ خشک تھی، بے آب ماند تھی

جب تشنگی کمال ہوئی شیرخوارؑ کو
شبنم کی یاد آنے لگی گُل عذار کو
سینے لگایا ماں نے دُرِ آبدار کو
تکنے لگا وہ چرخِ تغیر شعار کو
فاقوں سے شیرِ مادرِ معصوم خشک تھا
کافور دودھ ہو گیا اور آب مُشک تھا

شہؑ لے کے آئے طفل کو فوجوں کے روبرو
بولے یہ شیرخوارؑ ہے اے فوجِ کینہ خُو
تشنہ ہے تین روز سے یہ دُرِّ خوش گلو
پیاسا ہے اور سامنے بہتی ہے آب جُو
پانی پہ سب کا حق ہے، وہ اپنا کہ غیر ہو
موقع ہے ایک اَور اگر اہلِ خیر ہو

نہرِ فرات قبضہء غاصب سرشت میں
بجتے تھے جام صحبتِ بد عہد و زشت میں
پیاسے گئے عزیز و اقارب بہشت میں
پانی نہیں تھا ساقیِ کوثرؑ کی کشت میں
سیراب فوجِ وحش و چرند و پرند تھی
پانی کی راہ آلِ محمدؐ پہ بند تھی

فرزند ہے یہ سبطِ رسالت پناہؐ کا
ہے شیرخوار خانہء شیرِ الٰہؑ کا
بولو تو کیا قصور ہے اِس بے گناہ کا
پانی ہی کتنا پیتا ہے بچہ چھ ماہ کا
یوں مائیں شیرخواروں کو پانی پلاتی ہیں
دو انگلیاں بھگو کے دہن میں چواتی ہیں

حدّت سے بھُن گیا تھا کلیجہ، جگر جلا
آنسو بھی تو نہیں تھے کہ تر ہو سکے گلا
بے تاب ہو کے سینہء مادر سے منہ ملا
اِس درجہ تشنگی تھی کہ بے ہوش ہو چلا
حیلہ نہ سوجھتا تھا کہ ماں بے حواس تھی
صابرہ تو تھی، پہ رنج میں تصویرِ یاس تھی

سر تک اُٹھا کے طفل سے بولے کہ ارجمندؑ
ہاں، استغاثہ از لبِ تشنہ بکُن بلند
تا سُن سکیں الہ و ملک، اِنس و جاں، پرند
راضی رضائے رب پہ ہیں، جو وہ کرے پسند
اپنی زباں سے کہہ کے یہ کام اِختتام کر
پھر ایک بار امامؑ کی حجت تمام کر

بچّے کا حال دیکھ کے بے خود تھی خوش خصال
خیمے کے در پہ آ کے پکاری بصد ملال
بس کوئی دم اخیر ہے میرا یہ نونہال
کس امتحان میں ہے رسولؐ خدا کی آل
جن کے طفیل عرش سے بادل برستے ہیں
وہ آج ایک بوند کی خاطر ترستے ہیں

یک بار 'العطش' کی صدا رَن پہ چھا گئی
جو سنگ دِل تھے اُن کے دِلوں کو بہا گئی
ساری زمینِ کرب و بلا تھرتھرا گئی
کرسیِ کردگار کے پائے ہلا گئی
سینہ اُبل پڑا پہ نابکار کا
تھا نینوا میں معجزہ پروردگار کا

بولا یہ ایک دَم بنِ کاہل سے ابنِ سعد
سُن، صاف کر رہا ہوں میں تجھ سے یہ قول و عہد
چلّہ چڑھا کے تیر لگا اِس کو مثلِ رعد
اے حُرملہ! ظفر ہے تری اِس عمل کے بعد
تُو اِس گھڑی جو درپئے بے شیرؑ ہوئے گا
عہدہ بڑھے گا، صاحبِ جاگیر ہوئے گا

سردار تھا شقی سپہِ اِبتذال کا
مضروبِ زر، حریفِ محمدؐ کی آلؑ کا
پھینکا نجس نے تیرِ ستم تین بھال کا
وائے، گُلو نشانہ ہوا نیم سال کا
تیرِ سہ شعبہ حلق کے پیچھے نکل گیا
شہ رگ چھدی، بنا کے دریچے نکل گیا

اللہ، صبر حضرتِ والا وقارؑ کا
پیکاں نکال کر پسرِ نامدارؑ کا
چلّو میں خون بھر لیا اُس گُلِ عذارؑ کا
بولے کہ لاکھ شکر ہے پروردگار کا
بندہ خمیدہ سَر ہے جو منشاء خدا کا ہے
ناناؐ بتا گئے تھے یہ رستہ ھدیٰ کا ہے

دیکھو تو بندگی شہِ والا سریرؑ کی
چھوٹی سی قبر آپ نے کھودی صغیرؑ کی
میّت پھر اُس میں آپ اُتاری شیرؑ کی
اُٹھے تو یہ صدا سُنی بے آب و شیرؑ کی
باباؑ کو میں بچا نہ سکا کیا خفیف ہوں
طفلی تو نام کو ہے پہ اصلا ضعیف ہوں

معصومؑ کی صدا جو سُنی زار زار روئے
جی کو ذرا قرار نہ تھا، بے قرار روئے
گریہ تھا رشکِ ابر، بہ اشکِ ہزار روئے
منہ بار بار صاف کیا، بار بار روئے
دیکھا جو آسماں کو اِدھر شاہؑ دہر نے
نوحہ اُدھر بلند کیا نُہ سپہر نے

قبرِ صغیر سِن پہ کیے شاہؑ نے جو بَین
لکھوں تو دن کے منہ پہ اُتر آئے صاف رَین
سُنتے تو ہو گے تم بھی صدا ہائے شور و شَین
ہم آپ کی غریبی پہ قربان یا حسینؑ
مرقد پہ منہ رکھے ہوئے جب شاہؑ روتے تھے
ملعون کھکھلاتے تھے اور شاد ہوتے تھے

خیموں میں آئے حضرتِ سلطانِ بحر و بر
نوحہ کناں تھے اہلِ حرم سب اِدھر اُدھر
ماتم وہ شیر خوار کا، وہ سوختہ جگر
محوِ عزا تھی خلقِ سما، نوعِ دشت و در
سینہ جو چاک تھا شہِ گردُوں اساسؑ کا
ہمشیرؑ سے منگایا تبرک لباس کا

دیکھا جونہی عمامہ و جامہ رسولؐ کا
دل دکھ سے خون ہو گیا پُورِ بتولؑ کا
بر میں زرہ تھی، بند علیؑ اصولؑ کا
حمزہؑ کی ڈھال، دائرہ حسنِ قبول کا
ختم الرُسلؐ کے آئے جو نعلین عین پر
غم کا پہاڑ گر پڑا مولا حسینؑ پر

جب ذُوالفقار آئی شہِ دیںؑ کے سامنے
قبضہ بڑھا حُسینؑ کے ہاتھوں کو تھامنے
بیعت کو اُس کا شوق جو دیکھا امامؑ نے
دستِ عطا بلند کیا گردُوں مقام نے
چھوڑا غلاف، بوسے کو تیغِ دوسر گری
خاکِ قدم پہ منہ مَلا اور پاؤں پہ گری

لو، قیدیانِ راہِ مسبب کو چھوڑ کر
نکلے حرم سے شاہِ زمنؑ سب کو چھوڑ کر
آنکھیں بھر آئیں باقرِؑ خوش لب کو چھوڑ کر
سجادؑ کو ، سکینہؑ کو ، زینبؑ کو چھوڑ کر
ہمشیرؑ نے سوار کیا شاہِ دیںؑ کو
بوسے دیے رکاب کو ، راکب کو ، زین کو

﴿مطلع سوم﴾

چھل بَل میں طور اَور ہُوا ذوالجناح کا
درپیش راستہ تھا اُسے پھر فلاح کا
سینہ کُھلا تھا، کام نہ تھا اِنشراح کا
محتاج تک نہیں تھا کسی کی صلاح کا
وہ آسماں شناس تھا واقف زمین کا
ایسا ہدیّہ تھا ختم المرسلینؐ کا

شہؑ نے لگام تھام کے حُجت اخیر کی
نیت مگر تھی اَور سپاہِ شریر کی
بھالا تھا یہ نجس کا، گرہ بے ضمیر کی
لو تھی یہاں سناں کی، وہاں تیغ و تیر کی
حلقے کیے ہوئے تھے شہِ مشرقینؑ پہ
ہتھیار تول تول کے آئے حسینؑ پہ

شفاف یہ کہ دُور تھے خاشاک و خس تمام
اُٹھے جو اُس کے نعل، ہوئی دسترس تمام
آغاز کا محل تھا کہ گھوڑے تھے بس، تمام
خَر ہو گئے تھے سامنے اُس کے فرس تمام
وہ جانتا تھا کون سخی، مُتقی ہے کون
کس کس کو شرحِ صدر ہوئی اور شقی ہے کون

نکلی غلاف چھوڑ کے تیغِ دودم اُدھر
اہلِ خشم کٹے اِدھر، اہلِ درم اُدھر
کیا باڑھ تھی کہ کھیلتی تھی یم بہ یم اُدھر
پانی اِدھر بہم تھا، مہیا تھا نَم اُدھر
اک گھونٹ جس نے اُس کا بھرا سیر ہو گیا
سب اقربا تھے پاس مگر غیر ہو گیا

میدان میں جلال سے آیا علیؑ کا لال
ختم الرسلؐ کی آلؑ سے آیا علیؑ کا لال
بچھڑا جو اپنے لالؑ سے آیا علیؑ کا لال
بولی سپہ ''خیال ہے، آیا علیؑ کا لال
کیا دُور ہے بنائے جو سُرمہ سپاہ کو
سب مِل کے روک لو شہِ گردُوں پناہ کو''

وہ جو صفوں کے بیچ تھے، اطراف کٹ گئے
تفریقِ شرق و غرب مٹی، صاف کٹ گئے
اسلاف قطع ہو گئے، اخلاف کٹ گئے
سمتیں تمام ہو گئیں، اکناف کٹ گئے
تھے فوجِ بدخصال کے ٹکڑے اِدھر اُدھر
بھاگے پلید موڑ کے مکھڑے اِدھر اُدھر

تلوار کیا تھی، برق گری تھی ہجوم پر
یکساں تھی اس کی آنچ خصوص و عموم پر
آفت جدا جدا تھی شقی اور شوم پر
سیلی تھی نامیانِ رَے و شام و روم پر
کس کی ہے ڈھال، کس کی زرہ جانتی تھی وہ
کس کس مقام پر ہے گرہ جانتی تھی وہ

چل چل کے بھی وہی تھی، برابر کسی ہوئی
طوبیٰ کے تھی دوشاخے کے اوپر کسی ہوئی
پل بھر عدو کے دِل میں تھی، پل بھر کسی ہوئی
اتری تھی عرش سے وہ سراسر کسی ہوئی
کیسے بیان کیجیے اُس آن بان کو
یوں ہے کہ اُس کے لمس کی حسرت تھی سان کو

لمسِ رسولِ پاکؐ و علیؑ اس کے ساتھ تھا
اصلِ اصولِ بت شکنی اس کے ساتھ تھا
ردّ و قبولِ حُسن و فنی اس کے ساتھ تھا
حاصل وصولِ پنجتنی اس کے ساتھ تھا
بدر و حنین کون، یہ تیور ہی اور تھے
کچھ فردِ جرم چڑھ گئے کچھ زیرِ غور تھے

چہرے چھپائے پھرتے تھے زوردار و نامدار
کٹ کٹ کے گر رہے تھے نمودار و نامدار
کاوے میں پس گئے تھے غلودار و نامدار
دستِ حسینؑ تھا ہی وضودار و نامدار
یکساں مکالمہ تھا اسے خاص و عام سے
بیعت تھی وہ حسین علیہ السّلام سے

یزداں مزاج عرش سے اتری ڈھلی ہوئی
دستِ خدا سے زینتِ دستِ علیؑ ہوئی
ایک ایک معرکے میں برابر چلی ہوئی
مولا علیؑ کے ہاتھ کی تھی وہ پلی پوئی
تھی خانہ زاد ازل سے شہِ مشرقین کی
بچپن سے جانتی تھی طبیعت حسینؑ کی

جن زہریوں کے جی تھے ہرے، یاد تھے اُسے
بدر و احد، فرار پرے، یاد تھے اُسے
جو دِل تھے انتقام بھرے، یاد تھے اُسے
ایسی دولپ تھی سب شُجرے یاد تھے اُسے
اتری لہو میں تیغ و سپر کاٹتی ہوئی
ایک ایک پر اٹھی تھی وہ لب چاٹتی ہوئی

روحیں روانہ ہوتی تھیں اُس کے خیال سے
واقف تھی تیر و تیغ سے، مغفر سے، ڈھال سے
گر گر کے سَر اٹھاتی گروہِ رزال سے
کیا سرخرو پلٹتی تھی ہر ہر جدال سے
آخر کو پاس رکھنا تھا اِک پاک ذات کا
تھا اُس کا منہ دھلا ہوا زہراؑ کے ہات کا

عالی مقام، عرش نسب، منصف و خلیق
سبزے پہ تھے فریفتہ مونگے، گہر، عقیق
لب ہائے خندہ ور گہے سادہ، گہے عمیق
فرمانروائے حرب، یداللہ کی رفیق
جو منہ کو آئے جنگ میں وہ گوشت پوست تھا
اتنا معاملہ تھا مگر دوست، دوست تھا

پشتوں سے جانتی تھی وہ ہر بدشعار کو
قہر و غضب میں جانے نہ دیتی وقار کو
بے ڈھال روکتی تھی، خطاکار وار کو
رُکتی تو سجدہ کرتی تھی پروردگار کو
وہ دیں شناس اور زمانے سے آشنا
تھی جود و اِتقا کے گھرانے سے آشنا

ایسی کشیدہ سَر کہ تنی کی تنی رہی
لے لے کے بھی خراج غنی کی غنی رہی
غور تھا انی پہ اور انی کی انی رہی
دولہا بنے حسینؑ، بنی کی بنی رہی
ایسے ازل کے ساتھ کو تھامے ہوئے چلی
قبضے میں ان کے ہاتھ کو تھامے ہوئے چلی

کیا کیجیے ثنا کہ وہ اصلاً اصیل تھی
میدان میں قضائے کمین و رزیل تھی
تیغوں میں سَربلند تھی ، گردُوں مثیل تھی
گویا نبیؐ و آلِ نبی کی وکیل تھی
پرّاں سرورِ قربِ شہِ مشرقین میں
قبضہ تھا محو بوسہِ دستِ حسینؑ میں

سر شانہء عریس پہ رکھتی تھی بار بار
سرخی حیا کی رخ سے ٹپکتی تھی بار بار
بوئے شہِ زمن سے مہکتی تھی بار بار
لب وا تھے اور پھر بھی جھجکتی تھی بار بار
سرگوشیوں کی تاب نہیں تھی عروس کو
غیظ و غضب سے دیکھ رہی تھی جلوس کو

کھولے جگر تو آپ سویدا تھی داغ میں
مصروف تھی سیاہ دِلوں کے سراغ میں
ایسے ٹہل رہی تھی وہ زخموں کے باغ میں
شعلہ لپکتا پھرتا ہے جیسے چراغ میں
آہستگی میں بھی وہ مزاجاً شتاب تھی
قامت میں رشکِ سرو تھی ، بُو میں گلاب تھی

دو لب دکھائی دیتے تھے گھونگھٹ کی آڑ سے
گُل بیل سر اٹھاتی ہے جیسے دراڑ سے
جوں غنچے جھانکتے ہوئے سوسن کی باڑ سے
بیری نمود کرتی ہے جیسے پہاڑ سے
جڑ کوئی بھی ہو پھولنے پھلنے نہ دیتی تھی
اطراف میں کسی کو نکلنے نہ دیتی تھی

تن اس کا کٹ کے رہ گیا جس پہ ذرا تنی
منہ پھیرا جس نے ہو گئی اس کے لیے غنی
سب زخم چاٹتے تھے کہ ہیرے کی تھی کنی
پوشاکِ احمریں میں دل آرا دلہن بنی
سرخی کا پھر بھی روپ میں نام و نشاں نہ تھا
سایہ تھا اور دھوپ میں نام و نشاں نہ تھا

زاغانِ تیرہ بخت کو گویا غلیل تھی
شاخِ گُلو تک آئی تو آکاس بیل تھی
کیا اس کی چال ڈھال تھی، کیا ریل پیل تھی
سیلی تھی اَوج مَوج پہ، ایسی ڈھکیل تھی
غاصب چپک رہے تھے سروں کو فرات پہ
پانی بہم تھا ناموروں کو فرات پہ

مینار تو کھڑا تھا مگر لات اتر گئے
گھوڑوں پہ جو چڑھے تھے وہ قد کاٹھ اتر گئے
میزاں یونہی تُلی رہی اور باٹ اتر گئے
روکے تھے گھاٹ، موت کے سب گھاٹ اتر گئے
چار آئنہ کٹے تھے کہ چار آٹھ ہو گئے
درپے جو تھے خیام کے خود ناٹ ہو گئے

قبضے میں پھڑ پھڑا کے ستم کوش اُڑ گئے
کھوجے نشان ایسے کہ روپوش اُڑ گئے
مجنون اہلِ عقل ہوئے، ہوش اُڑ گئے
حُجت جنہیں نہ بھائی تھی وہ گوش اُڑ گئے
کٹ کر سروں سے دُور لَویں کانپتی رہیں
آنکھیں نکل گئی تھیں، بھنویں کانپتی رہیں •

یہ شان پرتوے کی، سما و سمک پہ تھا
گویا ابھی زمیں پہ، ابھی نہ فلک پہ تھا
سَو جان سے ہلال نثار اس جھلک پہ تھا
صندل کا شاخچہ بھی فدا اس لچک پہ تھا
وہ تیغ تھی، تبر تھی، چھری تھی، سنان تھی
خم کھا کے استوار ہوئی جوں کمان تھی

قبل از وغا جو رستم و اہلِ تپاک تھے
مٹّی میں منہ چھپائے ہوئے اب وہ خاک تھے
لشکر کے سب نشان ہزیمت سے چاک تھے
کاٹی ہوئی سپاہ کے دَل ہولناک تھے
ایسے لپک رہی تھی وہ اپنی ترنگ میں
سب منتہی تمام تھے آغازِ جنگ میں

مردُم کے عین بیچ بناتی تھی وہ جگہ
پھر کیا بھلا کہیں نظر آتی تھی وہ جگہ
کر کے اشارہ موت بتاتی تھی 'وہ جگہ'
اس کو فرس، فرس کو دکھاتی تھی وہ جگہ
قبضوں کو کاٹتی رہی سرکار کی طرح
تانے رہی وہ دائرہ پرکار کی طرح

پہلو بدل بدل کے وہ ایک ایک کو پڑی
کٹ کر وہیں پہ مَر گیا اک ضرب جو پڑی
دو کو چہار، پانچ کو دَس، اک کو دو پڑی
ہاتھ اِس نجس کا قطع ہوا، اُس کی کھوپڑی
دل میں کبوتری سی وہ ٹھکی، اتر گئی
چلّہ چڑھا رہا تھا کہ چٹکی اتر گئی

خورشید کی شعاع، سِناں پہ سوار تھی
خم ہو گئی کماں کہ وہ جاں پہ سوار تھی
مقتل کے بیچ پیر و جواں پہ سوار تھی
جانے کہاں پیادہ، کہاں پہ سوار تھی
سَن سَن کا ساز موت کے آہٹ سمان تھا
دشتِ مصاف آن میں مرگھٹ سمان تھا

ڈھالوں پہ رات چھا گئی، سب پھول کٹ گئے
فولاد میں تھے جسم پہ ٹکڑوں میں بٹ گئے
جنگوں کے پیش رَو صفتِ ابر چھٹ گئے
بجلی چمکتے دیکھی تو پانی سے ہٹ گئے
عبّاسؑ یاد تھے شہِ والا صفاتؑ کو
پیاسے نے آنکھ اُٹھا کے نہ دیکھا فرات کو

اللہ رے سمندِ شہِ دیں کا وہ جمال
رشکِ غزال چشم تھی، فخرِ اسد جلال
گیسوئے حور ماند پڑیں دیکھ کر ایال
کبکِ دری کو بھول گیا وہ چلن، وہ چال
نعلین دیکھ دیکھ کے خورشید ماند تھا
ایک ایک سُم تراش میں پہلی کا چاند تھا

اک لات ، لات کو جو پڑی ہو گیا دو لات
جکڑا پلک جھپکنے سے پہلے لگا کے گھات
دِن تھا پہ لاتیوں کے سروں پر تنی تھی رات
'یاعلیؑ' کہہ کے کھول دیا کوچہء ممات
کہتا تھا کون جنّتی اور دوزخی ہے کون
خدمت گزارِ ھادیِ دین و نجی ہے کون

وہ اس کی تھوتھنی، لبِ معشوق چر گئے
غنچے سمٹ سمٹ گئے، ٹہنی سے گر گئے
جن کی حیات بات پہ تھی منحصر، گئے
آئے پٹے کلام فصیح اور پھر گئے
اسپانِ بد شعار پہ یوں ہنہناتا تھا
دو پاؤں ان کی آنکھوں تلک لے کے جاتا تھا

آنکھوں میں گھومتے ہوئے ڈورے، خدا کی شان
تھے نرگسی، پہ ڈھیلے تھے گورے، خدا کی شان
پیاسا تھا اور بھرے تھے کٹورے، خدا کی شان
توسن تھے اس کے سامنے کورے، خدا کی شان
دروازہء حیاتِ شقی بھیڑتا ہوا
کیا کھیلتا تھا شاہ رگیں چھیڑتا ہوا

سوڈھب تھے اس کے جب کہ چلا ایک ڈھب سے وہ
میدان میں الگ نظر آتا تھا سب سے وہ
آنکھیں چڑھائے دیکھتا غیظ و غضب سے وہ
واقف تھا ہر سوار و فرس کے نسب سے وہ
کڑکا وہ رعدِ قہرِ خدا، سب پہ چھا گیا
یک بارگی وہ راکب و مرکب پہ چھا گیا

قاطع ہلالِ نعل تھے، پیوند کٹ گئے
کیا بدگہر پسر تھے کہ فرزند کٹ گئے
چند آ گئے سموں کے تلے، چند کٹ گئے
سیلِ چہار موج اٹھی، بند کٹ گئے
لاشیں گریں کہ ساحلِ زخّار اٹ گیا
کیا باڑھ تھی بحیرہء مُردار اٹ گیا

تھیں مچھلیاں فرات کی سب محوِ جست و خیز
ہر سو لپک رہی تھی کوئی آتشِ ستیز
وہ اس کی برق خیزی و رفتارِ تند و تیز
نعلین تھے سواروں کے ماتھوں پہ شعلہ ریز
سوقِ قضا میں بھیڑ تھی، وا سب دکانیں تھیں
استادہ وہ کنوتیاں، گویا سنانیں تھیں

وہ چند بے نیاز تھا، وہ چند ہوشیار
تابندہ جوڑ بند میں ہر بند ہوشیار
چیتے سا چُست، صورتِ اسفند ہوشیار
غصّے کے باوجود خردمند، ہوشیار
جولاں یہاں وہاں تھا کہ پابندِ صف نہ تھا
باوصفِ غیظ اس کے دہانے میں کف نہ تھا

ہمراہ تھا جو دستِ شہی راہوار کے
تیور جو تیغ کے تھے وہی راہوار کے
سایہ تھا سَر پہ سروِ سہی راہوار کے
تلوار ساتھ ساتھ رہی راہوار کے
جس جس میں تھا بھرا ہوا کینہ، کچل گیا
وہ سَر اڑا گئی تو یہ سینہ کچل گیا

آنکھیں پھرا پھرا کے یہ کہتا تھا ”یا حسینؑ
میں آپ کے بغیر نہ رہتا تھا، یا حسینؑ
وار آپ پر جو آتے تھے سہتا تھا، یا حسینؑ
خوں بہہ گیا، پہ اشک نہ بہتا تھا، یا حسینؑ
مولاؑ! جدائی کرتے ہیں کیوں خانہ زاد سے
کیا کچھ قصور ہو گیا اِس کم سواد سے“؟

محوِ جدال و جنگ، بیک طور ساتھ ساتھ
فیصل تھے فیصلے کہ ہوا غور ساتھ ساتھ
درپیش مرحلوں میں تھے فی الفور ساتھ ساتھ
دونوں تھے خلق و وضع میں اُور، اُور ساتھ ساتھ
رُو بَر کوئی بھی فاجر و فاسق نہ ہو سکا
ایسا سلوک پھر سے موافق نہ ہو سکا

شبیرؑ نے کہا کہ جدائی تری ہے شاق
اے حامیِ حسینؑ، ضروری ہے افتراق
چھلنی ہوں میں، بکار نہیں ساعدین و ساق
خوش ہوں میں تجھ سے ناصرِ دیں دار، الفراق
جا اور جا کے ثانیِ زہراؑ کے پاس بیٹھ
عابدؑ کا حال پوچھ، سکینہؑ کے پاس بیٹھ

باہم کیے ہوئے تھے انھیں شہؑ کے ہاتھ دو
کارآزما تھے جنگ میں رہ رہ کے ہاتھ دو
مٹّی ہوئے چہار شقی، سہہ کے ہاتھ دو
جنتے تھے تیغ و توسنِ شہؑ کہہ کے ’ہاتھ دو‘
ناری سقر کے تیج تھے، ٹھنڈے، کٹے ہوئے
تھے فوجِ نابکار کے جھنڈے کٹے ہوئے

کیا پوچھتے ہو جنگ میں کتنا لڑے حسینؑ!
لاکھوں کے ازدحام سے تنہا لڑے حسینؑ
نامِ یزید مٹ گیا، اتنا لڑے حسینؑ
غربال دِل تھا، اس پہ بھی کیا کیا لڑے حسینؑ
کنزِ مبیں کے گوہر و الماس کی قسم
دی دشمنوں نے اکبرؑ و عباسؑ کی قسم

شمشیر تازہ دَم تھی پہ مجروح تھا فرس
تیر اتنے پڑ گئے تھے کہ مذبوح تھا فرس
ہر عضو شرح شرح تھا، مشروح تھا فرس
پھر بھی نثارِ حضرتِ ممدوحؒ تھا فرس
آقاؑ کے پاؤں نکلے جو اس کی رکاب سے
ریتی پہ گر پڑا وہ فراقی عذاب سے

بس روک دی حسام سُنی جس گھڑی دُہائی
لے کر پسرؑ کا نام تجّی نے پچھاڑ کھائی
روتے تھے پھوٹ پھوٹ کے کہہ کہہ کے ”ہائے بھائی
سوتے ہو بے حواس، بہت بھا گئی ترائی
شانے کٹے ہوئے ہیں، یہ مشکیزہ چاک ہے
بس کوئی دَم سکینہؑ کا آویزہ چاک ہے“

آئی صدا کہ معرکہ تسخیر ہو چکا
جو لوح پر ازل سے تھا تحریر، ہو چکا
دِیں پھر درست سمت پہ تعمیر ہو چکا
تم سے کہا گیا تھا جو شبیرؑ، ہو چکا
بس اب نیام کر دو یہیں ذوالفقار کو
سجدہ ہو عالمین کے پروردگار کو

لبیک کہہ کے تیغ کو رکھا غلاف میں
پریوں نے بال کھول دیے دشتِ قاف میں
نیزوں نے پھر سے گھر کیے تن کے شگاف میں
گرداں تھے تیر سبطِ نبی کے طواف میں
تیغیں اُٹھی تھیں اور دِلِ مولودِ کعبہ تھا
بعد از علیؑ جو مرکز و مقصودِ کعبہ تھا

سینہ زناں تھے عرشی و گریاں تھے اہلِ خاک
ہر ہر جگہ تھا نوحہ و ماتم کا اشتراک
روح الامینؑ کہتے تھے ڈالے پروں پہ خاک
سبطِ نبیؐ و ابنِ علیؑ روحنا فداک
حاضر ہیں انبیاءؑ و ملک انتظار کو
ملنے کا اشتیاق ہے پروردگار کو

دیکھا انہیں امامِ حجازیؑ نے ایک بار
صیقل کی خاک آئنہ سازی نے ایک بار
سجدے میں سر جھکا دیا غازیؑ نے ایک بار
ایسے نماز ادا کی نمازی نے ایک بار
کنبہ کٹا کے دینِ محمدؐ بچا لیا
کعبہ سے چل کے نامِ اب و جد بچا لیا

چلّے سے جمع ہو گئے سب دشمنانِ دیں
چلّے کھنچے، تمام کمانیں کڑک اٹھیں
یکبار تیر چل گئے، ہلنے لگی زمیں
تر ہو گئے لہو میں شہنشاہِ مہ جبیں
ناوک شقی کا سیبِ زنخداں پہ آ لگا
ٹھوڑی کو چیرتا ہوا دنداں پہ آ لگا

دو آب دار لعل تھے صحرا کی دھول پر
دو اور پتیاں نہ رہیں ایک پھول پر
پیغمبری تھا وقت نہالِ بتولؑ پر
بالکل یہی سَمے تھا احد میں رسولؐ پر
وہ تیر کھینچتا تھا کہ خوں دست ہو گئے
چار اور جسمِ پاک میں پیوست ہو گئے

بولا یہ ابنِ سعد لعیں فوجِ شام سے
جو جس کا انتقام ہے لے لے امامؑ سے
نفرت مجھے ہے حیدرِ صفدرؑ کے نام سے
رکھتے تھے زیر سب کو حسام و کلام سے
کوئی تو اُن کی دیدہ وری سے پگھل گیا
باقی کو ذوالفقار کا پانی نگل گیا

تنہا ہیں آج لختِ دلِ سیّد البشرؐ
لوگو غضب کے وار کرو اِن کو گھیر کر
کیا دیکھنے لگے ہو، اٹھاؤ بھی اب تبر
خونِ امامؑ سے ہو زمیں نینوا کی تر
زخم اِن کو ہو گا دردِ محمدؐ کی روح کو
کشتی سمیت قعر میں لے جاؤ نوح کو

یہ بات سن کے آگے بڑھے سارے بدجہات
چاروں طرف سے گھر گئے مظلومِ کائنات
گہ سَر تھا زخم زخم، گہے سینہ، گاہ ہات
رنج و الم سے خون ہوا چشمہء فرات
فطرت نہ تھی، پہ مچھلیاں نم دیدہ ہو گئیں
موجیں تمام ریت میں پوشیدہ ہو گئیں

بے کس پہ تیر پھینکتا کوئی کماں کے ساتھ
درپئے تھا کوئی تیغ سے، کوئی سِناں کے ساتھ
کوئی حسد نکالتا سنگِ گراں کے ساتھ
یہ بُغضِ لٰہی تھا شہِ اِنس و جاں کے ساتھ
القصہ جس کے ہاتھ میں جو تھا، وہ لے پڑا
کن مشکلوں میں فاطمہ زہراؑ کا دل پڑا

اُس وقت آسمان پہ کوئی نہ تھا رسولؐ
مقتل کے آس پاس تھے سب انبیا، رسولؐ
روتے ہوئے حضورؐ سے کہتے تھے 'یا رسولؐ!
کیا انبیاؑء و اِنس ہیں، کیا اولیا، رسولؐ
کوئی نہیں جہان میں ثانی حسینؑ کا
سب پانیوں پہ چڑھ گیا پانی حسینؑ کا'

زخموں پہ اور تیر پڑے، اور چھل گئے
غنچے سَروں کو جوڑ کے آپس میں مل گئے
لکھا ہے یک ہزار و نہ صد پھول کھل گئے
روضے رسولؐ و فاطمہ زہراؑ کے ہل گئے
تڑپیں جناب آمنہؑ اپنے مزار میں
خورشید پھر کے رہ گیا گنجِ مدار میں

رنجِ پسر میں خون ہوئی روحِ بوترابؑ
عمرانؑ بھی تھے سوختہ جاں، جیسے آفتاب
تڑپے ضریحِ پاک میں شبّرؑ فلک جناب
مرقد میں کھائے قلبِ خدیجہؑ نے پیچ و تاب
مٹی پروں پہ ڈال کے جبریلؑ رو پڑے
مریمؑ کو غش تھا، صاحبِ انجیلؑ رو پڑے

دیکھو عجیب قہر کا منظر ہے سامنے
خنجر بدست شمرِ ستمگر ہے سامنے
غلطیدہ خوں میں سبطِ پیمبرؐ ہے سامنے
ہے ہے، اُٹھو یہ کون کھلے سَر ہے سامنے
سجدے سے سَر اُٹھاؤ کہ دیدار دیکھ لے
زینبؑ نگاہ بھر کے پھر اِک بار دیکھ لے

احمدؐ کے نور عین کو پانی نہیں ملا
حیدرؑ کے دل کے چین کو پانی نہیں ملا
ہاں، شاہِ مشرقینؑ کو پانی نہیں ملا
پی کر کہو حسینؑ کو پانی نہیں ملا'
بھائی نہیں تو کون پلائے حسینؑ کو؟
ریتی سے کون آ کے اٹھائے حسینؑ کو؟

یہ آسماں پہ جاتے ہیں کس طاہرہؑ کے بَین
یہ کون منہ کو ڈھانپ کے کرتا ہے شور و شَین
کس نے کہا، کہاں گئے مقصودِ قبلتینؑ
نوحہ کناں ہے کون کہ ہے ہے، مرے حسینؑ
اے مایہء محمدؐ و زہراؑ، دلِ اسدؑ
ہے ہے بہم نہیں ہے ترا فرق اور جسد

ہے ہے مرے غریب وفا خو، تجھے سلام   بس بس نہ پڑھ مصائبِ مولاؑ فلک مقام
زینبؑ کی آس، اے مرے مہ رُو، تجھے سلام   کیا ہے ترا زبان و بیاں، کیا ترا کلام
زہراؑ کے دِل، رسولؐ کے خوشبو، تجھے سلام   اُن کی عطا نے تجھ کو کیا عرش احتشام
بھیّا! ابھی سے دُکھتے ہیں بازو، تجھے سلام   اے شاعرِ شہِ دوسراؑ، فدیہء امامؑ
جانے کہاں کہاں پئے اِسلام جاؤں گی   یہ کم نہیں کہ لے لیا مولاؑ نے چھاؤں میں
خیمے جلیں گے اور میں سُوئے شام جاؤں گی   تیری جگہ بنائی ہے اکبرؑ کے پاؤں میں

☆☆☆☆

ظفر اقبال

بھیجتے ہیں جواب کیا، دیکھو
ایک آواز تو لگا دیکھو

دل ہی جب آخری رکاوٹ ہے
تو یہ دیوار بھی گرا دیکھو

جا رہا ہے کدھر ہنر اپنا
کس طرف کی ہے یہ ہوا دیکھو

اس سے پہلے کہ ڈور کٹ جائے
ان فضاؤں میں سرسرا دیکھو

دیکھنے والے دیکھ بھال گئے
اب یہی ہے بچا کھچا دیکھو

پھٹ پڑے گی کمینگی دل کی
جس قدر بھی اُسے چھپا دیکھو

آنکھ بھر کر نہ دیکھنا اس کو
تھوڑا تھوڑا ذرا ذرا دیکھو

یہ بھی کیا دیکھنا ہُوا آخر
ایک ہی چیز بارہا دیکھو

اے ظفؔر قسمت آزمائی سہی
آپ بھی اُس گلی میں جا دیکھو

☆☆☆☆

انورشعور

نقش ایک آدھ یہاں چھوڑ کے جانا اپنا
جاؤ تو کوئی نشاں چھوڑ کے جانا اپنا

خواہ وہ تلخ کلامی ہو کہ شیریں سخنی
کوئی اندازِ بیاں چھوڑ کے جانا اپنا

سائبانوں کی کمی ہے نہ ٹھکانوں کی کمی
ہم نے یہ راز مکاں چھوڑ کے جانا اپنا

جا کے رندوں میں سنبھالو گے کہاں تک دستار
شیخ! یہ بارِ گراں چھوڑ کے جانا اپنا

آنے والوں کی امانت ہیں تمھاری سوچیں
ہر یقیں اور گماں چھوڑ کے جانا اپنا

ہونے دینا نہ تلف اپنی خرافات شعورؔ
چشمۂ فیض رواں چھوڑ کے جانا اپنا
☆☆☆☆

احمد صغیر صدیقی

سلسلہ سارا یہ اک عشق کے آزار کا ہے
پھول کا بھی وہی عالم ہے جو مہکار کا ہے

ہم جو پائے نہیں جاتے ہیں کہیں ہوتے ہوئے
یہ تماشا بھی اسی چشمِ فسوں کار کا ہے

راہ تنہائی کی جاتی ہے کسی دشت کی سمت
اس سے آگے کا جو اک موڑ ہے بازار کا ہے

پہلے نکلی تھیں یہاں دیدہ وری کی باتیں
تذکرہ بزم میں اب نرگسِ بیمار کا ہے

یہ جو دم گھٹتا ہے ہم اس کا سبب جانتے ہیں
مسئلہ غم کا نہیں مسئلہ اظہار کا ہے

جس کے سائے میں بہت دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں
خوف جتنا بھی ہمیں ہے اسی دیوار کا ہے

اس کی چاہت میں یہ جو حال بنا ہے میرا
اک تعارف یہ مرے یارِ طرحدار کا ہے

☆☆☆☆

صابر ظفر

مرے دیے نے جو تیرے دیے کی لَو چھو لی
عجب وصال ہُوا، پھر جو پھُوٹی پَو، چھو لی

ترے بدن کی حرارت سے جو اِدھر آئی
مرے وجود نے وہ موجِ آب جُو، چھو لی

نظیر جس کی نہیں سات آسمانوں میں
وہ چاندنی بھری تصویرِ ماہِ نو چھو لی

مَیں اپنے عشق کی اُس انتہا کو جا پہنچا
ترے جمال کی ہر تند و تیز رَو چھو لی

مَیں چھو رہا تھا جو اُس ماورائی خلوت کو
یہی لگا کہ ظفرؔ نُور نُور ضو چھو لی

☆☆☆☆

نصرت صدیقی

جو آبروئے جلوۂ گلزار ہو گئے
آخر وہ پھول زینتِ بازار ہو گئے

دو چار روز بزمِ نگاراں میں بیٹھ کر
کچھ بوالہوس بھی صاحبِ کردار ہو گئے

پھر بھی نہ ترجمانِ جمہور ہو سکی
شائع اگرچہ سینکڑوں اخبار ہو گئے

حد سے بڑھی جو بھوک تو مجبور والدین
اولاد بیچنے پہ بھی تیار ہو گئے

پھر کون طے کرے گا سفر دھوپ کا اگر
ہم بھی رہینِ سایۂ دیوار ہو گئے

قسمت کی بات ہی سہی حیرت کی بات ہے
تم جیسے لوگ صاحبِ دستار ہو گئے

تدفین کے لیے ہی سہی مل گئی زمین
مر کر غریب لوگ زمیں دار ہو گئے

نصرتؔ میں کیا بتاؤں کہ پیشِ جمالِ یار
میرے حسیں خیال بھی بے کار ہو گئے

☆☆☆☆

محمد حنیف

گھومتا ہوں مدار میں اپنے
یعنی میں ہوں حصار میں اپنے

کوئی رستہ نظر نہیں آتا
گم ہوا ہوں غبار میں اپنے

کس طرح اب میں بھول جاؤں تجھے
کیا یہ ہے اختیار میں اپنے؟

دیکھتا ہوں میں آسماں کی طرف
بیٹھ کر انتظار میں اپنے

جانتا ہوں کہ مارا جاؤں گا
ایک دن اعتبار میں اپنے

☆☆☆☆

اعجاز گل (امریکہ)

تماشا ایک سا ہر روز کرتے جا رہے ہیں
غبارہ عمر کا سانسوں سے بھرتے جا رہے ہیں

ضروری کام ٹلتا جا رہا ہے آج کل پہ
کفِ افسوس مُلتے دن گزرتے جا رہے ہیں

مقدّر ساعتِ نا سعد سے ٹکرا رہا ہے
ستارے ٹوٹ کر گرتے بکھرتے جا رہے ہیں

طلب لاحاصلی کے سحر سے پتھرا گئی ہے
ارادے بے ارادہ ہو کے مرتے جا رہے ہیں

ہراساں کر رہا ہے چاپ پہ غولِ سگاں بھی
مسافر اپنے سائے سے بھی ڈرتے جا رہے ہیں

جو چہرے تھے عزیز از جان سب دوری کے باعث
نگاہ و دل کے منظر سے اترتے جا رہے ہیں

میں اونچائی پہ چڑھتا جا رہا ہوں بے خبر سا
کہ زینے واپسی سے اب مکرتے جا رہے ہیں

جو بے اسباب تھے تکتے ہیں مُنہ اک دوسرے کا
جو با اسباب تھے آگے گزرتے جا رہے ہیں

☆☆☆☆

سید نواب حیدر نقوی

نسلِ انساں میں محبت کی کمی آج بھی ہے
اور ازل سے جو ملی کم نظری آج بھی ہے

جھکتی ہے اس کی طرف اب بھی عیارِ انصاف
وہ کہ ہر جرم سے پہلے تھا بری آج بھی ہے

یوں تو پہلے سے نہیں اس سے مراسم پھر بھی
وہ جو ہم رشتگی پہلے تھی کبھی آج بھی ہے

جس نے رکھا ہے سیہ خانۂ دل کو روشن
شمعِ احساس وہ سینے میں جلی آج بھی ہے

چمنِ جاں میں جو موسم بھی ہو اے جانِ جہاں!
شجرِ غم کی ہر اک شاخ ہری، آج بھی ہے

جان و دل کر دیے قربان وفا کی خاطر
یار بے مہر کی بے مہری وہی آج بھی ہے

وہ جو صحرا میں لیے پھرتی تھی ہر دم راہی
کیا کیا جائے وہ آشفتہ سری آج بھی ہے

☆☆☆☆

اظہر ادیب

کرچی کرچی ہوا ندر سے پڑا ہے اب کے
وہ زمانے سے نہیں خود سے لڑا ہے اب کے

میرے شانے پہ ترا ہاتھ سلامت لیکن
مسئلہ تیری تسلی سے بڑا ہے اب کے

زد پہ آیا ہوا دشمن بڑا خوش قسمت ہے
اس کا بچہ میرے رستے میں کھڑا ہے اب کے

اپنی انگشتری میں مَیں نے نگینے کی جگہ
ایک کنکر تیرے کوچے کا جڑا ہے اب کے

اٹھ کے جاتے ہوئے لوگوں کو بٹھانے کے لیے
قصہ گو نے نیا فسانہ گھڑا ہے اب کے

میں کوئی ریت کی دیوار نہیں ہوں لیکن
واسطہ اس کی جدائی سے پڑا ہے اب کے

تیر ہو گا تو نکالے گا مسیحا اظہؔر
اس کا اک جملہ مرے دل میں گڑا ہے اب کے

☆☆☆☆

طارق نعیم

کام جو کرنا نہیں تھا وہ بھی کرنا پڑ گیا
اِک ذرا سی بات پہ جاں سے گزرنا پڑ گیا

اس قدر بے گانۂ صوت و صدا ہوتے ہوئے
ایک ہی آواز پہ مجھ کو ٹھہرنا پڑ گیا

پہلا ہی سچ بول کر اتنی پشیمانی ہوئی
اپنی اپنی بات سے ہم کو مکرنا پڑ گیا

ایک ایسی آ پڑی اُفتاد مجھ کو دفعتاً
عشق کے پہلے ہی زینے سے اُترنا پڑ گیا

اُڑتے اُڑتے کائناتوں سے نکل جاتا تھا میں
ایک دن اُس کو مرا پر ہی کترنا پڑ گیا

میں مکمل کر چکا جب بھی تری تصویر کو
مجھ کو اُس میں پھر کوئی اِک رنگ بھرنا پڑ گیا

اتنا دل کش تھا فریبِ زندگی طارق نعیم
ایک جینے کے لیے سو بار مرنا پڑ گیا

☆☆☆☆

محبوب ظفر

یہ جانتا ہوں وفا کرے گا جہان کیسی
سجائے بیٹھا ہوں پھر بھی دل کی دکان کیسی

یہ بات الگ ہے کہ اب پلٹ کر نہ آ سکیں گے
مگر تھی اس بار پنچھیوں کی اڑان کیسی

کئی برس سے ہم ایک آنگن میں رہ رہے تھے
یہ آج دیوار آ گئی درمیان کیسی

محبتوں میں چھپائے پھرتے ہیں نفرتوں کو
گھرے ہوئے ہیں منافقوں میں، امان کیسی

نہ پوچھ میرے بدن پہ آئے ہیں زخم کتنے
یہ دیکھ مسمار کی ہے میں نے چٹان کیسی

ظفر جب اپنے عدو سے ہم خود ملے ہوئے ہیں
تو جنگ کیسی، شکار کیسا، مچان کیسی

☆☆☆☆

امداد آکاش

ترے بنائے کو بارِ دِگر بناتے ہوئے
میں تھک گیا ہوں دریچوں کو در بناتے ہوئے

تجھے خبر نہیں گزرے کس امتحان سے ہم
تری شبیہ تجھے دیکھ کر بناتے ہوئے

پسِ حیات دکھاتے ہو اک نئی دنیا
لگے گی دیر اِدھر کو اُدھر بناتے ہوئے

کبھی زمین پہ کتنی زمین ہوتی تھی
وہ سوچتا ہے سمندر میں گھر بناتے ہوئے

مکالمے میں زباں لڑکھڑانے لگتی ہے
پئے دروغ اگر کو مگر بناتے ہوئے

وہ نقش گر تھا پرندوں کا اور پھر اک دن
ہوا نشین ہُوا بال و پر بناتے ہوئے

☆☆☆☆

اسرار ایوب

دشمن پہ بھی ایسے نہ شبِ ہجر عیاں ہو
ہر سمت فقط ٹوٹتے تاروں کا دھواں ہو

اے دوست مٹا مجھ کو ذرا سوچ سمجھ کر
شاید مرا ہونا ترے ہونے کا نشاں ہو

آگے نہ نکل جائے جنوں تیرا حدوں سے
پیچھے ترے اک قافلہء نوحہ گراں ہو

اب دشتِ بلا ہے دلِ وحشی کے مقابل
کیوں آنکھ سے بپھرا ہوا دریا نہ رواں ہو

ایسا نہ ہو تڑپانے لگے اتنا جدائی
ایسا نہ ہو سانسوں کی رفاقت بھی گراں ہو

اے کاش تہی دست نہ ہو کوئی وفا سے
اے کاش محبت کا جہاں سب کا جہاں ہو

آوارہ ازل سے ہے تری صبح کا تارا
کیا جانے ابد زاد وہ اسرار کہاں ہو

☆☆☆☆

شیدا چشتی

جب مرے مدِ مقابل تھی بغاوت میری
وقت کرتا رہا ہوگا امامت میری
اِک تیقن کی فضا رہتی ہے میرے ہمراہ
صورتِ روشنی چلتی ہے مسافت میری
جب سے حیرت کے سفر میں اُسے دیکھا میں نے
جا پڑی چاہِ تذبذب میں ریاضت میری
اوج تک لایا مجھے میرے جنوں کا جذبہ
سر پٹختی رہی عیار ذہانت میری
کتنا خاموش سفر تھا، ترا دل تک آنا
میرے جذبوں کو میسر تھی قیادت میری
اُس کے اک لفظ نے کایا ہی پلٹ دی ورنہ
مجھ کو کمزور کیے دیتی تھی طاقت میری
اُس نے تفویض کیے اپنے مطالب مجھ کو
کام آئی نہ کوئی، اک بھی وضاحت میری
یوں رہے عقل و جنوں برسرِ پیکار کہ بس
ہاتھ ملتی رہی چالاک فراست میری
اب سرِ عرش سنی جائے گی شیدا تیری
اس طرح مجھ سے مخاطب ہے ندامت میری

☆☆☆☆

رستم نامی

کسی سے ہمیں پیار ہوتا نہیں
مگر ہم سے انکار ہوتا نہیں

میں کہتا ہوں سب سے کہ سچ ہی کہو
مگر کوئی تیار ہوتا نہیں

جو ہو جیب خالی تو بازار بھی
کسی طور بازار ہوتا نہیں

نہیں پھیلتی سنسنی اس لیے
کہ جنگل میں اخبار ہوتا نہیں

جو کرتا نہیں تنگ تھوڑا بہت
حقیقت میں وہ یار ہوتا نہیں

ہے سب سے بڑا مسئلہ اُس کا جو
مسائل سے دوچار ہوتا نہیں

ملے جس طرح بھی محبت کرو
محبت کا معیار ہوتا نہیں

تکلف ہی کرتے ہیں نامی سبھی
کوئی بھی ملنسار ہوتا نہیں

☆☆☆☆

ڈاکٹر شکیل پتافی

تمھارے بعد بھی اپنا خیال رکھا ہے
خود اپنے آپ کو گھر میں سنبھال رکھا ہے

مجھے بھی خوف تھا آندھی کا اس لیے میں نے
بدن کی شاخ سے چہرہ نکال رکھا ہے

مری کمائی میں سِکّوں کے ساتھ اشک بھی ہیں
کہ میں نے غم کو بھی اُجرت پہ ڈال رکھا ہے

میں آج زندہ نہیں اس لیے مرے دل نے
ترا معاملہ اب کل پہ ٹال رکھا ہے

طلب کے زخم نگلتا ہوں اور سمجھتا ہوں
کہ عاشقی میں بھی رزقِ حلال رکھا ہے

☆☆☆☆

شہزاد اظہر

بجھنے کا خوف سانس کی دِقت تو ہے نہیں
کچھ کیجیے چراغ میں وحشت تو ہے نہیں

لگتا نہیں کہ سب سے الگ لکھ رہے ہیں ہم
اے دوست! چشمِ حرف میں حیرت تو ہے نہیں

یہ ہم جو رہ رہے ہیں بیابانِ ہوش میں
دل پر کسی پری کی حکومت تو ہے نہیں

میں ہوں سو آتا رہتا ہوں ہر شخص کو نظر
یہ التباسِ شکل و شباہت تو ہے نہیں

پل بھر کی سر خوشی کے لیے جی کے دیکھیے
دامن میں ڈھیر ساری محبت تو ہے نہیں

☆☆☆☆

شہزاد نیرؔ

اُس حسنِ ہجریاب کا طرفہ جمال دیکھ
آنکھوں میں پھیلتا ہوا رنگِ ملال دیکھ
تُو دیکھتا نہیں تھا مرے حال کی طرف
اب گردشوں میں گھوم، زمانے کی چال دیکھ
ایسے سمجھ نہ آئے گی حالت مری تجھے
اپنا عروج دیکھ کے میرا زوال دیکھ
زخموں کی آب و تاب سے رونق تو دل میں تھی
تُو اندمال چھوڑ، غمِ اندمال دیکھ
کچھ پُرکشش نہیں ہیں جوابوں کی صورتیں
اے صاحبِ نگاہ تُو حسنِ سوال دیکھ
انبوہ لگ رہے ہیں نظاروں کے جا بجا
نظروں کی خیر مانگ، یہاں خال خال دیکھ
پہرے پہ بے شمار ہیں آنکھوں کے کیمرے
اے شائقِ جمال ذرا دیکھ بھال دیکھ
اُس نے خمارِ دید میں ہولے سے یہ کہا
پگھلا رہی ہیں مجھ کو، نگاہیں سنبھال دیکھ
نیرؔ کے نصیب ہے دیدِ دیارِ دل
بس دلبروں کی دلبری کے خدوخال دیکھ

☆☆☆☆

ناز مظفر آبادی

ہر رنگ میں وہ شخص ہمارا تھا، ہمارا
وہ تھا، تو زمانے پہ اجارہ تھا، ہمارا

تھے اس کے پرستار تو دنیا میں ہزاروں
وہ شخص مگر سارے کا سارا تھا، ہمارا

دکھ بانٹ لیا کرتا تھا سکھ بیچ کے اپنا
وہ غم کے سمندر میں کنارا تھا، ہمارا

بچھڑا ہے تو اب ہم کو یہ احساس ہوا ہے
وہ شخص تو جینے کا سہارا تھا، ہمارا

اب آنکھ میں آنسو ہیں اگر اس کے سبب سے
تو کیا ہوا وہ آنکھ کا تارا تھا، ہمارا

☆☆☆☆

جنید آذر

کس عرصۂ حیات میں رکھا گیا مجھے
دن رات سانحات میں رکھا گیا مجھے

ہر گام نذرِ دار ہوا ہے مرا وجود
ایسے بھی التفات میں رکھا گیا مجھے

خوشبو کے نام پر مری سانسیں کشید کیں
موسم کے انحطاط میں رکھا گیا مجھے

دے کر فریبِ قرب مجھے فاصلے دیے
ترکِ تعلقات میں رکھا گیا مجھے

پہلے مری فنا پہ لیے میرے دستخط
تب جا کے ممکنات میں رکھا گیا مجھے

روتا رہا لپٹ کے مرے ساتھ تیرا وصل
جب ہجر کی قنات میں رکھا گیا مجھے

اترا کبھی نہ مجھ پہ تسلی کا ایک حرف
جب زندگی کی گھات میں رکھا گیا مجھے

☆☆☆☆

تسنیم صنم

رازِ سربستہ یہی ہم نے چھپایا ہوا ہے
ایک چنگاری نے جنگل کو جلایا ہوا ہے

اے زمانے تری تقدیس مقدم ہے ہمیں
ورنہ ہر شخص یہاں تیرا ستایا ہوا ہے

اب سنا کر ہمیں حیران کیا جاتا ہے
یہ وہ قصہ جو ہمارا ہی سنایا ہوا ہے

دل کے اس پیڑ پہ کچھ خواہشیں دم توڑ گئیں
چند چڑیوں نے مگر شور مچایا ہوا ہے

کوئی سمجھے نہ اکیلا مجھے اس جنگل میں
اس لیے خوف بھی اس دل میں بٹھایا ہوا ہے

دشتِ امکاں سے کوئی آ بھی تو سکتا ہے صنمؔ
اس لیے در پہ دیا ہم نے جلایا ہوا ہے

☆☆☆☆

ممتاز راشد لاہوری

اگرچہ حُسن کی نشوونما ضروری ہے
مگر فروغِ محبت سوا ضروری ہے

پرانے دور میں جو کچھ ہُوا، ہُوا سو ہُوا
نئی فضا میں نیا ولولہ ضروری ہے

دلوں کے باہمی جذبوں کی آب یاری کو
خلوص و مہر تو بے انتہا ضروری ہے

شکست ہو گی خموشی کی اہتمام کے ساتھ
مرے خیال میں اک قہقہہ ضروری ہے

سفر حضر میں شبِ تار کے ازالے کو
نیا پرانا کوئی بھی دیا ضروری ہے

حضور آپ کی ہر بات کی ہے اہمیت
حضور آپ نے جو کچھ کہا، ضروری ہے

حقیقتوں کا حصول آج کل ہے ناممکن
مگر تلاش میں رہنا بڑا ضروری ہے

☆☆☆☆

کاشف حسین غائرؔ

کب اُسے دیکھتے نگاہ بھری
جا چکا وہ تو دل نے آہ بھری

کیسی نیکی، کہاں کا کارِ ثواب
میں نے اِک قیمتِ گناہ بھری

بس یہی حاصلِ سفر ٹھہرا
اپنے دامن میں گردِ راہ بھری

جست بھر کا وہ فاصلہ ہی نہ تھا
آپ نے جست خوامخواہ بھری

آنکھیں ملتا وہ ماہتاب اُٹھا
جب ستاروں سے خواب گاہ بھری

کیا مسافت کا لطف آئے گا
راہ گیروں سے ہے یہ راہ بھری

دل جہنم سے کم نہیں غائرؔ
دل میں دنیا ہے بے پناہ بھری

☆☆☆☆

حفیظ اللہ بادل

دیکھنے والوں کی آنکھوں ہی میں ارزانی ہے
ورنہ صحرا میں مری جان بہت پانی ہے
میرے دل تک کا سفر ہے ابھی درپیش انھیں
یار لوگوں نے مری شکل ہی پہچانی ہے
رات بھر جاگتے رہنا بھی مصیبت ہے مجھے
خواب کو دیکھتے رہنا بھی پریشانی ہے
آ گیا کوئی نگاہوں کے دریچے میں مرے
سونا چاہوں بھی تو اب نیند نہیں آنی ہے
دن گئے جب مری آنکھوں میں ستارے تھے بہت
آج کل خواب ہیں اشکوں کی فراوانی ہے
عشق کے سلسلے کا پہلا پڑاؤ مری جاں
خواب کو خواب سمجھنا بھی تو نادانی ہے
میں جسے کھینچ کے تعبیر تلک لے آیا
اب اسی خواب کو اس بات پہ حیرانی ہے
وہ بھلا شہر کے جھنجھٹ میں کہاں پڑتا ہے
قیس وہ شخص جسے دشت میں آسانی ہے
ایک میں ہوں کہ جسے سب نے رعایا سمجھا
کوئی راجا ہے یہاں اور کوئی رانی ہے

☆☆☆☆

شاہد ماکلی

جو پل بھی یہاں گزر رہا ہے
خاطر پہ گراں گزر رہا ہے
جب بات ہی کچھ نہیں ہے ایسی
کیوں ایسا گماں گزر رہا ہے
کس روزنِ شب سے کس دیے کا
ست رنگا دُھواں گزر رہا ہے
اب آنکھ سے گزرے یا نہ گزرے
نقشِ گزراں گزر رہا ہے
دل جامِ جہاں نما ہے گویا
جس سے یہ جہاں گزر رہا ہے
یا مان لیں ، دن نہیں گزرتا
یا کہہ دیں کہ ہاں گزر رہا ہے
موسم ہی یہ آخری ہو جیسے
یوں عہد خزاں گزر رہا ہے
دن میں ہیں نہ شب میں ، کیا بتائیں
اب وقت کہاں گزر رہا ہے

☆☆☆☆

عنبرین صلاح الدین

دل کہتا ہے درد رہے اور دل نہ رہے
لہروں کا یہ کھیل رہے، ساحل نہ رہے

چار دِشائیں چاروں شانے یوں چت ہوں
خاک کے دِل پر چُپ کی بھاری سِل نہ رہے

فرصت میں کیا آ سکتا ہے ایسا پَل
حاصل کا احساس رہے، حاصل نہ رہے

فاصلے سارے ایک نظر میں مٹ جائیں
وقت ہمارے بیچ کبھی حائل نہ رہے

تو بھی رہے اور تیرے ہنگامے بھی رہیں
میں نہ رہوں اورقریہء آب و گِل نہ رہے

☆☆☆☆

احمد عرفان (امریکہ)

میں نہ کہتا تھا مرے بھائی نہیں ہو سکتی
آگ، پانی میں شناسائی نہیں ہو سکتی

تتلیاں، پھول، پرندے اُسے لینے آئے
اس سے بڑھ کر تو پذیرائی نہیں ہو سکتی

اک کنواں ہے سو ہے معلوم مرے بھائیوں کو
راستے میں تو کوئی کھائی نہیں ہو سکتی!

جگ ہنسائی مری کروا دی زمانے بھر میں
تُو تو کہتا تھا کہ رسوائی نہیں ہو سکتی

میرے چہرے پہ یہ مانگی ہوئی آنکھیں نہ لگا
ان میں جو ہے، مری بینائی نہیں ہو سکتی

آ گیا دستہ ابابیلوں کا احمد عرفانؔ
اب ہمیں جنگ میں پس پائی نہیں ہو سکتی

☆☆☆☆

سید کامی شاہ

وہاں سے آئے گا وہ اور میں مِلوں گا اُسے
ہوئی جو شام تو پھر سات پھول دوں گا اُسے

وہ اپنا آخری لشکر بنا رہا ہوگا!!
شروعِ جنگ سے پہلے ہی جا مِلوں گا اُسے

بچھائی جائے گی جس دن بساطِ آخرِ شب
زمیں چُنے گی مجھے اور مَیں چنوں گا اُسے

خزاں کو سبز کیا اور اب یہ سوچا ہے
سفید ہے جو بہت کاسنی کروں گا اُسے

یقین پہ ہی تو دار و مدار ہے سارا
وہ دن بھی آئے گا اپنا بھی کہہ سکوں گا اُسے

☆☆☆☆

نعمان فاروق

اُس نے پہلی بار چھوا ہے
پوروں میں اک دیپ جلا ہے

آوازوں کا بھیس بدل کر
سناٹا کیا بول رہا ہے

کس کی باس نے لی انگڑائی
سارا گاؤں مہک اُٹھا ہے

انٹرنیٹ کا دور ہے لیکن
ہم نے اُس کو خط لکھا ہے

اُس کی یادوں کے دریا میں
سارا جیون ڈوب رہا ہے

☆☆☆☆

فرح جعفری

کبھی دوستوں کی قطار میں، کبھی دشمنوں میں شمار ہوں
یہ ہے میری ذات کا المیہ، کہیں پھول ہوں کہیں خار ہوں

کئی ایک جنگیں لڑی گئیں، مرے نام پر مگر آج تک
کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا، کہ میں جیت ہوں کہ میں ہار ہوں

کہیں مار ڈالا سماج نے، کہیں جھوٹے رسم و رواج نے
مجھے دہر میں نہ تلاش کر، میں تو کب سے زیرِ مزار ہوں

مری داستان عجیب ہے مرا دوست میرا رقیب ہے
مرا آندھیوں سے مقابلہ، میں اگرچہ مشتِ غبار ہوں

مرے حالِ زار کو آج تک کوئی دَور بھی نہ بدل سکا
میں تو اب بھی زیرِ عتاب ہوں، میں تو آج بھی سرِ دار ہوں

مرے دم سے گُل میں نکھار ہے، مری جستجو میں بہار ہے
مرا نام دل کا قرار ہے، میں محبتوں کا وقار ہوں

☆☆☆☆

ڈاکٹر توصیف تبسم

آخری مکالمہ

سُنو!
یہ جزیرہ بھی معدوم ہوگا
سمندر کے چاروں طرف اک سمندر ہے
سفر کرنے والوں کو معلوم ہوگا!
نئی اور پرانی، بڑی اور چھوٹی
سبھی کشتیوں کا مقدر فنا ہے
ہوا کے تھپیڑے،
پھٹے بادباں کب تلک سہہ سکیں گے!
سنو!
کالے پانی کے نیچے تہوں میں
جو لاوا چھپا ہے،
وہی ابتدا اور وہی انتہا ہے!
بظاہر سمندر پہ کائی کی تحریر ساکت ہے
مگر اس کے نیچے اک آتش فشاں ہے
وہ دیکھو!
سمندر کے سینے پہ کھلتے ہوئے بادباں کی نشانی
فریب سفر ہے، فریب نظر ہے!
اُدھر جلتے سورج کے نیچے
پسینے میں ڈوبے بدن، چپوؤں پر ہتھیلی جمائے
بپھرتے سمندر کے غیظ و غضب سے الجھتے
سمندر کہاں جا کے گرتا ہے
انھیں یہ تو معلوم ہوگا
سنو! یہ جزیرہ بھی معدوم ہوگا

ڈاکٹر احسان اکبر

لاسٹ کال

پچھتر کروڑ اہلِ ایمان
(امریکہ، جاپان دونوں کا مجموعہ)
دنیا کے مرکز میں
باہم دگر ملنے والی زمینوں میں
اک دوسرے کے لیے ایک طاقت کا ساماں تھے
اک دوسرے کی ضرورت کا درماں تھے
اب کیا ہیں؟ اک خواب
پھر بھی امانت، امین، امن، ایمان، مومن، امان ایک شے
امن ایمان سے ہے سو اسلام کی روح ہے (امن دشمن ہیں ایماں کے دشمن)
مرا آدھا کاٹا ہوا ملک
اس حال میں بھی پناگاہ تھا
ان پرندوں کی جو روس میں سردیاں جھیل پاتے نہیں
کلمہ گو اہلِ ہندوستاں کی جنھیں ہندو بھائی بناتے نہیں
ارضِ کشمیر سے نکلے کشمیریوں
خاکِ افغانیہ میں سے نکلے ہوؤں
ارضِ بنگال کے اَن گنت خاندانوں کا ہجرت کدہ
افریقی ملکوں کے حکام کے جبر سے ڈر کے بھاگے ہوؤں کی پناہ
ان دنوں کا کراچی بڑا شہر ہے
اور بڑے شہر آباد کرنے کے نقصان
اس کے فسادات کے وقت کھلتے ہیں
جب لوگ لڑتے ہیں
جذبات آلود ایسی فضا میں بھی

غیروں کو نقصان ممکن نہیں
اپنے لوگوں میں کوئی بھی Ku Klux
کوئی Skin-head نہیں
اجنبی رنگ و مذہب کا دشمن نہیں
یہود و نصاریٰ سے ہم
قدرتی سی کشادہ دلی
فطرتاً رکھنے والے ہیں
کیوں کہ ہمیں ان صحف کا بھی اقرار ہے
ہم سے پہلے جو اترے
ہلال اور صلیب اپنی جنگی روایات سے ہٹ کے بھی
کچھ روایات میں متحد تھے
پُر فروک اور ہم
وہی اک قبا آج تک پہنے آئے
معلم ہو عالم ہو جج
سب عرب طیلساں اوڑھتے ہیں
جہاں بھر میں
ہر بے خبر بچہ
کاپی کا پہلا ورق آج بھی چھوڑتا ہے
کہ جس پر کبھی
قاہرہ، قرطبہ اور بغداد کے مکتبوں میں
اتالیق “تصدیق” لکھتے
فضیلت کی اسناد اور ڈگریوں کا چلن ہم سے تھا
اب بھی تحصیلِ علمی سے فارغ جواں
Hood پہنتے ہیں
غرناطہ، اشبیلیہ اور ازہر کے طُلاب
جس میں کبھی
صُوف والی دواتیں، قلم اور قرطاس رکھتے رہے

مشک کی خوشبوؤں کی سفارت بدستور ہے
خوشبو اور غسل کے عادی لوگوں کی کتنی ہی عادات
اب بھی تمہاری روایات میں بولتی ہیں
اسی رشتہ داری کو آواز دو
مساوات، عدل اور آدم کی وحدت جسے یاد ہو
امن سب کو مبارک
کہ یہ فاختہ کی ملائم صدا
ساحلِ عافیت کی علامت سے ہے
شاخِ زیتوں ہے سو خیر ہی خیر ہے
پر جو زیتون اُگاتے تھے
ان کی تو مٹی ہبہ ہو گئی
نسلِ نامہرباں دشت میں کھو گئی
گرچہ آدھی صدی ان پہ گزری مگر
راستہ دشت میں پھر بھی بنتا نہیں
بیت لحم اب بھی جاتے ہوئے
راستے میں جو عیسیٰ رکیں
تو غزہ، صابرہ، شرم شیخ اور شتیلا، بقا، گروزنی، ارضِ لبنان تک منتشر
بے زمیں بے فلک بستیاں دیکھ کر پھر یہ کہنے پہ مجبور ہوں
شیر اور لومڑی کے لیے تو کچھار اور بھٹ تک سلامت ہیں
پر ابنِ آدم کی خاطر کہیں سر چھپانے کی صورت نہیں
توحید پر صرف اسلام کا ہی اجارہ نہیں
توحید موسیٰ سے آتی روایات میں خیر و ایماں ہے
آرٹیکل آف فیتھ اس کو مانا گیا ہے
کبھی مادے کی طرح روح کی سطح پر ارتقا مانتے
تو کبھی اہلِ توریت انجیل تک جاتے
انجیل قرآن کا راستہ دیکھتی
اولین آٹھ ہجرت کی صدیوں تلک

مشرقی خطۂ ارض والے مسیحی یہودی
طواف اور قربانی و حج کی رسمیں
تمام اہلِ اسلام کے ساتھ مل کر مناتے رہے ہیں
انھی اشتراکات تک آؤ ہم تم چلیں
ایلیٹ! تم یہود اور مسلم کے مانند
قربان گاہوں میں قربانیاں نذر کرتے رہے ہو
آؤ اس مشترک عہدِ رفتہ کو آواز دیں
عیسیٰ کا کہنا تھا
الفت جو اکسیرِ عالم ہے
جرموں، گناہوں کے ڈھیروں پہ حاوی ہے
(پہاڑی کے) خطبے میں
عیسیٰ کا کہنا تھا
”جو امن پھیلانے والے ہیں مبروک ہیں
وہ خداوند کے گھر کے بچے ہیں“
عیسیٰ کا کہنا تھا
”جس نے ہوس کی نگاہوں سے
عورت کو دیکھا زنا کار ہے“
قرآن نے سو کہا ہے
کہ عیسیٰ کا اقرار جس نے کیا
غلبہ اس کو ملا
آؤ عیسیٰ کی، قرآن کی آواز پر مل کے آواز دیں
لبیک۔ اللھم لبیک۔ ان الحمد والنعمۃ لک والملک
لبیک لا شریک لک
لبیک لا مثیل لک

☆☆☆☆

حسن عباس رضا

ماضی کے جھروکے سے جھانکتی نظم

مرے خدا!
ایسے کون مجرم سوال تھے
جن کے جرم میں
ہم پہ تازیانوں کے
سنسناتے
نشاں اُگاتے
جواب اُترے ----
ابھی تو ہم سے الم نصیبوں نے
شیرِ مادر کے ذائقوں کی گرہ نہ کھولی
کہ لب پہ کڑوی، کسیلی رُت کے
عذاب اُترے ----
ابھی تو صحنوں میں خواہشوں کی پنیریوں پر
امیدِ شبنم
نمو کے بوسے سجا رہی تھی ----
ابھی تو ہم نے
زمیں سے اپنی جڑوں کی بابت سخن کیا تھا
ابھی تو پاؤں کے آبلوں میں
گئی مسافت کی تازگی تھی
ابھی سے ہم پر عذاب گھڑیاں !؟
نہیں خدایا، نہیں خدایا
یہ قہر ہو گا

سلطان کھاروی

ماہیے

تو بس گیا من ماہی
پل پل تڑپوں میں
تیری دید کو چین ماہی

☆☆

گلشن میں بِمل ماہی
تجھ کو یاد کرے
مرا پاگل دل ماہی

☆☆

رہ میرے سنگ ماہی
تخت ہزارے سے
ہے بہتر جھنگ ماہی

☆☆

بنسی کی لے ماہی
دل تو پرایا ہے
نہیں میری شے ماہی

☆☆

ساون کی گھٹا ماہی
ہے رونق جیون کی
یہ غم کی ہوا ماہی

☆☆☆☆

محمد مشتاق آثم

قید سے لمبی نہیں ظلم کی عمر

(نذرِ حبیب جالب)

لوگ جب بھول گئے حرفِ صداقت لکھنا
تُو نے اُس وقت سدا سچ کے ترانے لکھے
مصلحت کوش جو گھڑتے رہے دستور بھی
ایسے دستور کو تُو مانا نہیں
صبحِ بے نُور کی صورت جانا
جبر کے ساتھ ہمیشہ سے تری جنگ رہی
اک جواں حوصلہ آواز تری
اُبھری زندان کے اندھیاروں سے
"قید سے لمبی نہیں ظلم کی عمر"
ناپنے کو تیری عظمت کوئی
پیمانہ نہیں
مصلحت، ہوش پسندوں کے نگر میں جالبؔ!
تیرے جیسا کوئی مجذوبِ وفا
ایک بھی
دیوانہ نہیں

☆☆☆☆

غیور حسین

بے خوابی میں لکھی نظم

خواب اگر ناراض نہ ہوتے
ہم بھی نیند کے اونچے در پر دستک دیتے
اُس کھڑکی کو آنکھ میں بھرتے
جس میں جلتے دیپ کی لرزش
بے عنوان کہانی جیسے
اک سائے میں ڈھلتی ہے
سائے کی تجسیم میں جانے
بے خوابی کی کتنی صدیاں
کٹتی ہیں

خواب اگر ناراض نہ ہوتے
ہم بھی نیند نگر میں جاتے
دن کی دشت نوردی جیسی
بوجھل باتیں
بند مٹھی سے ریت کی صورت گرنے لگتیں
ممکن کی ویران سرا سے
ناممکن کے ہنستے گھر تک
پھولوں کے انبار پہ چلنا
لاحاصل کا حاصل ہے
اُلجھی سانسیں
پھولوں کی اس باس میں رک کے

اُس سائے کی باتیں کرتیں
جس کی آہٹ
اَن دیکھے زوان کی دُھن پہ
زینہ زینہ چلتی ہے

خواب اگر ناراض نہ ہوتے
ایک ضیائی لہجے والا
ہاتھ کُھلی کھڑکی میں ہوتا
دو آنکھوں کے گاتے پنچھی
جلتے دیپ کی ساری رونق
گُل کر دیتے
در کے آگے خالی کاسہ
اور میگھ نگاہوں کی
سائے کی سُرخاب مہک میں
ایک کہانی روشن ہوتی
نیند نگر کے اونچے در پہ
دستک دے کر بھول ہی جاتے
چاپ کسی کے آنے کی
پھر یوں ہوتا
خالی کاسہ ہونے لگتا
جیسے رات ستاروں سے
ہم بھی نیند نگر میں ہوتے
خواب اگر ناراض نہ ہوتے
آپ اگر ناراض نہ ہوتے

☆☆☆☆

عمران ازفر

ریشم کاتے سانس

یہ کیسی بھٹی جلتی ہے
اور سونا تپ کے کندن ہوتا جاتا ہے
روز و شب کے پہیے میں
اُلجھی اُلجھی کوئی ریشم چلتی ہے
اور سینہ سارا جلتی بھٹی کے شعلوں کی
پلکوں کے تیور پر، بھیگی آنکھوں جیسے لمحوں
رُکتی چلتی سانسیں لیتا رہتا ہے
جانے کب سے صبح کی کرنیں
اس کمرے کے روشن دانوں اور درزوں کے گھیرے اندر
آنا جانا بھول چکی ہیں
سُوکھے پھولوں کی کلیاں بھی
جانے کتنے سمے پون کے نرم و نازک پروں کو چھو کر
باسی پانی کے گملے سے، سوندھی مٹی کی جھولی میں
پتھر ہو کر لیٹ رہی ہیں
ہنستے ہنستے بوڑھا جوہری اکڑوں ہو کر روتا ہے
منظر جو نظروں میں ٹھہرا ٹھنڈے خون کی لہروں ایسا
جسم وریدوں میں جمنے کو آیا ہے
اس کے نرم و نازک پاؤں، دھیرے دھیرے
کچی پکی سانسیں لیتے میرے من کو

کھٹی اِملی دھوتے ہاتھوں کی پوروں سے
پگھل رہے ہیں
وقت اور آگ نے مل کر کیسا کھیل یہ کھیلا ہے
زیرِ زمیں کیوں بہتا پانی گدلا ہوتا جاتا ہے
گلی محلے کے بچوں کی
گیندوں، بیٹوں، فٹ بالوں کو
نیو ورلڈ آرڈر کی خبروں نے اُچک لیا ہے
میرے کوٹ کے ٹوٹے بٹنوں کی درزوں سے
ٹھٹھرے برف کے گالوں ایسی
سردی اندر آتی ہے
یہ کیسی بھٹی جلتی ہے
سینہ آگ کی لپکوں سے
اندر ہی اندر کندن ہوتا جاتا ہے

☆☆☆☆

حسن منظر

ادھ کھِلے پھولوں کا زمانہ

میری بات سُننے کے لیے میری۔این (Marianne)اپنے ماں باپ سے دوقدم پیچھے رہ گئی۔ میں تیز تیز قدموں چل کر اس تک پہنچا تھا۔ اُس وقت وہ ان کے ساتھ لنچ بریک میں گھر جا رہی تھی۔ سٹریٹ جو سٹاف کے دورویہ بنگلوں کے درمیان تھی اس وقت سنسان تھی۔ مجھ میں جو حوصلہ اس سے پہلی بار بات کرنے کا اچانک پیدا ہوا تھا اس میں سٹریٹ کے سنسان ہونے کا بھی دخل تھا۔ ورنہ، میں جھینپو تو ہرگز نہیں لڑکیوں سے بات کرنے کے معاملے میں شرمیلا حد سے زیادہ تھا۔ کالج میں داخلے کے بعد ایسا ان سب کے ساتھ ہوا تھا جن کا پہلی بار کو۔ ایجوکیشن سے واسطہ پڑا تھا۔ جھینپو اس لیے خود کو نہیں کہتا کہ کلاس میں پڑھانے والے کے سوال کا جواب دینے میں پہل اکثر میں ہی کرتا تھا۔

میں نے اس کے پاس پہنچ کر کہا تھا:'Excuse me'

جس پر اس نے گھوم کر مجھے دیکھا اور بات کرنے کو رک گئی۔ قدم بھر آگے اس کے ماں باپ بھی رُک گئے۔

میں نے کہا: ''میں میمُون ہوں۔''

اس نے کہا: ''میں جانتی ہوں۔''

میں نے فوراً کہا: آپ کالج چھوڑ کر جا رہی ہیں؟''

اس نے سر کی جنبش میں ہاں کہا۔ اس کے ماں باپ منتظر ہوں گے کہ میں آگے کیا کہتا ہوں۔

میں نے گلوگیری سے ٹھہر ٹھہر کر کہا: ''مجھے بڑا دکھ ہے۔''

وہ خاموش رہی۔ جو میں نے کہا تھا اس میں کوئی برائی بھی نہیں تھی جس کا وہ بُرا مانتی اور جس کا مجھے ڈر ہوتا۔ جو میرے منہ سے نکلا تھا وہ رسمی نہیں تھا۔ وہ اس سے آگے کچھ سننے کی منتظر تھی۔ پھر جو میرے منہ سے نکلا: ''آپ تھیں تو میں پڑھائی میں زیادہ محنت کر سکتا تھا'' وہی مرے دل میں تھا لیکن تھی بے تکی سی بات۔

اس نے ہلکی سی شرارت سے کہا: ''مجھے نیچا دکھانے کے لیے۔''

میں سٹپٹا گیا۔ ''نہیں، آپ سے Compete کرنے کو۔ آپ سے Compete کرنا اچھا لگتا تھا۔ اب اتنی محنت نہیں کر سکوں گا۔''

پھر میں نے اس کے باپ پروفیسر جورڈن کی طرف دیکھ کر کہا: ''ہم دونوں ایک کلاس میں ہیں۔ ''

انھوں نے بھی وہی بات کی جو چند لمحے پہلے میری۔ این نے کی تھی: "I Know"

"You Know" میں نے تعجب سے کہا کیوں کہ وہ میتھس کے پروفیسر تھے اور ان کلاسوں میں کب آئے تھے جن میں ان کی بیٹی ہوتی تھی اور میں۔ اور انھوں نے کب مجھے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے سنا ہوگا جو مجھے یقین تھا۔ میری۔ این سنتی تھی۔ ۔ اس عمر میں نوجوانی میں داخل ہونے والے لڑکے لڑکیاں جن چھوٹی چھوٹی باتوں کو گرہ میں باندھ لیتے ہیں بڑے ہونے پر پتا چلتا ہے کچھ بھی نہیں تھیں۔

وہ مجھ سے کم جھینپ رہی تھی۔ بل کہ بالکل بھی نہیں۔ اس کی دنیا میں کم عمری سے عورتوں مردوں کا ساتھ روز کی بات ہے، مثلاً چرچ ہی میں، میری دنیا میں نہیں۔ اس کے چہرے پر متانت تھی۔ میرے پاس کہنے کو کوئی اور بات نہیں تھی لیکن وہاں سے ہٹنا بھی نہیں چاہتا تھا، جیسے بات ختم نہیں ہوئی ہے۔

اس کے باپ نے ہمدردی سے کہا: ''ہمارے ساتھ گھر کیوں نہیں چلتے۔ ساتھ کھانا کھانا، باتیں بھی ہوں گی۔ ''

اس کی ماں نے کہا: "Yes why not, come" وہ ہمارے یہاں نہیں پڑھاتی تھیں لیکن دیکھا انھیں میں نے اکثر پروفیسر جورڈن کے ساتھ تھا۔

دونوں کی بات میں مجھے ہمدردی لگی۔ میرا دل بھر آیا۔ ڈر رہا تھا۔ رونا نہ آ جائے۔ کیا سوچے گی۔ دس مہینے پہلے بھی ایک موقع پر رو پڑا تھا، آج پھر! وہ غصے کا رونا تھا، یہ دکھ کا ہوتا۔

میں بلا تامل ان کے ساتھ چل پڑا۔

ہوسٹلز میں رہنے والے لڑکوں میں سے کسی نے لنچ کے لیے میس جاتے ہوئے۔ ۔ ۔ ۔ کچھ دور تک ان کی بھی وہی راہ تھی، اگر مجھے اس سے باتیں کرتے دیکھا ہوگا تو اس کی مجھے آج پروا نہیں تھی۔ جس رنج سے میں دوچار تھا۔ اس وقت اس سے بات کرنے کی مسرت نے یکجا ہو کر مجھے باقی دنیا سے بے خبر کر دیا تھا۔ دماغ نے کہا یہی کہے گا نا آج یہ ایک لڑکی سے بات کیسے کرنے لگ گیا اور بعد میں سننے والا یہ جان کر کہ وہ لڑکی میری۔ این تھی ہو سکتا ہے میری ہنسی اڑائے۔ So What

میری۔ این کا گھر یا بنگلو ڈاکٹر ایلین کے بنگلے کے بعد اسی سٹریٹ پر سیدھے ہاتھ پر تھا جس کے خاتمے پر ایک بڑا راؤنڈ باؤٹ تھا۔ وہ جگہ پورے کالج سے الگ تھلگ تھی۔ شروع کے دنوں میں جب تک میں نئے دوست نہیں بنا پایا تھا اور زندگی کا صرف ایک ہی مقصد جانتا تھا، پڑھنا، تقریباً روز ہی لنچ بریک میں اسی سٹریٹ پر چل کر خود کو وہاں لے جاتا تھا۔ تک شاپ میں جا کر پیٹ میں کچھ ڈال لینے یا میس میں نام لکھوا کر دوپہر کا کھانا کھانے کا میرا یارا نہ تھا۔ راؤنڈ اباؤٹ میں بنچیں تھیں۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ سینڈلز

اتار کر بیٹھتا تو پیروں تلے گھاس کی سرسراہٹ بھلی لگتی۔ چاروں طرف سٹاف بنگلوز کی نیلی، پیلی چھتوں سے بھری باڑیں تھیں اور ہر طرف پودوں سے بھی پھول جھانک رہے ہوتے تھے اور ان سب سے بڑی چیز تھی وہاں کا سناٹا۔

وہاں بیٹھ کر میں پڑھنے کی کوشش کرتا۔ انگلش کے سوا سارے مضمون میرے لیے نئے تھے اور کلاس کے ساتھ ہم قدم رہنے میں مجھے تن من دھن کا نہیں پوری توجہ کا زور لگانا پڑ رہا تھا۔

کبھی پشت پر قدموں اور چھڑی کی آہٹ سنائی دیتی تو گھوم کر دیکھتا۔ کوئی تعلیم کا والہ وشیدا پروفیسر، جیسے کہ ٹائم ختم ہو جانے پر بھی کلاس کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے ہیں، تیز قدموں لنچ کے لیے گھر جا رہا ہوتا نظر آتا تو اس سے پہلے کہ میں لب کھولوں بول اٹھتا ''گڈ آفٹر نون'' اور اگر تعظیماً کھڑا ہونے کی کوشش کرتا تو کہتا ''Keep sitting پڑھتے رہو۔''

اُن دنوں اس سٹریٹ پر جو ٹیچنگ بلاکس، ایڈمنسٹریشن اور لائبریری کی عمارتوں کی حد کو پیچھے چھوڑ کر سٹاف کے رہائشی علاقے میں داخل ہوتی تھی لنچ بریک میں کبھی کبھی میری۔ این کی جھلک مجھے نظر آتی یا وقفہ ختم ہونے پر اسے گھر سے نکل کر سٹریٹ پر آتے ہوئے۔ ساتھ ہی پلک جھپکتے میں میری نظریں دوسری طرف پھر جاتیں۔

اس راؤنڈ اباؤٹ میں جا کر پڑھنا بس کچھ دن رہا۔ اس کے بعد میں نے وہ پینتالیس منٹ لائبریری میں صرف کرنے شروع کیے اور اس اُچٹتی ہوئی دلچسپی کی ملی جلی کیفیت سے جو میرے لیے نئی تھی وہاں بھی دوچار ہونا پڑا۔ روز نہیں، کسی کسی دن اُسے کلاس کی لڑکیوں کے ساتھ یا اکیلے Westbule میں سے ہو کر اندر داخل ہوتے دیکھتا۔

ایک دن کاؤنٹر پر رک کر لی ہوئی کتاب واپس کرتے ہوئے جب اس کا پورا رُخ دور ہی سے سہی، میری طرف تھا تو مجھے پہلی بار یہ خیال آیا تھا ''یہ ہے وہ لڑکی۔'' یعنی میرے ذہن میں اس کا ذہن بنائے، اپنا خاکہ بن چکا تھا۔ اوروں کی شکلیں ابھی میرے دماغ میں اپنی اپنی جگہ نہیں لے پائی تھیں، ان کی حیثیت جہاں بھی نظر آتیں ایک بھیڑ کی ہوتی تھی لیکن لگتا تھا اُس پہلے ہی ہفتے میں جو میں نے کالج میں گزارا تھا اس نے بلا بتائے اپنی پہچان پیدا کر لی تھی۔ لیکن اس آگاہی نے مجھے چوکنا کر دیا: یہ ٹھیک نہیں ہے۔

اس کے بعد کتنی ہی بار ایسا ہوا میں کاؤنٹر سے دور کوئی کتاب کھولے بیٹھا ہوں اور نظر اٹھتی تو دیکھتا کسی الماری میں سے کتاب چنتے ہوئے اس کی پشت میری طرف ہے یا کتاب ایشو کروا کر وہ جا رہی ہے۔

بغیر اس سے بات کیے، یا کسی سے اس کے بارے میں پوچھے، ارادے کے خلاف میں اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا جا رہا تھا۔ کیا کچھ؟

یہی کہ میری۔ این ہندوستان کے انتہائی جنوب میں کہیں کی ہے: کیرالا کی۔ اس کی رنگت میری ماں کی جتنی تو نہیں اپنی ماں سے یقینی کھلتی ہوئی تھی اور اپنے ساتھ کی ہر لڑکی سے بھی۔ اس کے باپ پروفیسر تھے۔ Maths کے لیکن ان کی رنگت بیٹی کے حصے میں بالکل نہیں آئی تھی، نہ ہی۔ یہ کئی مہینے بعد پتا چلا۔ اس کے بھائی کے حصے میں۔ دونوں اپنی ماں پر پڑے تھے۔

اس کا ڈریس سدا ایک ہی رہا۔ شرٹ اور اسکرٹ جو ہمیشہ اُجلی سفید، استری کی ہوئی ہوتی تھی اور کندھوں سے کچھ اوپر سفید ربن میں بندھے چوٹیوں کے گچھے لگتا تھا دونوں طرف سے چہرے کو سجائے ہوئے ہیں۔ میرا خیال تھا گھر سے کالج کے لیے نکلنے کے وقت یہ آخری کام ہوتا تھا جو اس کی ماں کرتی ہوگی۔

اکثر الماری کی شلیف کی کتابوں کے ٹائٹل پڑھنے کے لیے اُسے پنجوں پر اچکنا پڑتا تھا۔ میری طرح۔ اور یہ بھی تھا کہ داخلے کے بعد جو لسٹ نئے اسٹوڈنٹس کے ناموں اور رول نمبرز کی ایڈمنسٹریشن بلاک میں لگائی گئی تھی اس میں لڑکیوں کے نام پڑھ کر ایک نام کے بارے میں مَیں نے فیصلہ کر لیا وہ Marianne تھی۔ دوسری لڑکیوں کے نام اور سر نیم، لباس میرے لیے نئے نہیں تھے۔ اُن میں سے صرف ایک اور اسکرٹ میں ہوتی تھی لیکن اس کی شرٹ اور اسکرٹ سفید نہیں ہوتی تھی۔ خود اس کی طرح ڈلی رنگوں کی۔ وہ لمبی تھی، موٹے لینسوں کا چشمہ لگاتی تھی اور آئے دیر نہیں ہوئی تھی لڑکوں نے اس سنجیدہ لڑکی کا ایک بیہودہ سا نام رکھ لیا تھا۔ دوسری لڑکیوں کی نسبت وہ میری۔ این سے زیادہ قریب نظر آتی تھی۔

اسی لسٹ نے مجھے بتایا کیرالا کی اس لڑکی اور میرا مقابلہ رہے گا۔ وہ میری حریف تھی!

یہ تھا اس کا سراپا اور میرا؟ جس دن میں داخلے سے پہلے کسی بھی قسم کی مراعات کی آرزو میں پرنسپل سے ملنے گیا تھا وہی کپڑے پہنے تھا جو چھوڑے ہوئے ملک میں سکول پہن کر جاتا تھا۔ شورٹس۔ نئے مناسب کپڑے بنوانے میں کسی ملک میں نئے آنے والوں کو جو دولت سے لدے پھندے وہاں نہ آئے ہوں دیر لگتی ہے۔ باوجود پرنسپل کی سفید رنگت اور نیلی آنکھوں کے مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ میں کسی غلط جگہ آ گیا ہوں نہ ان سے بات کرتے ہوئے مجھے اپنا بے ڈھب لباس تنگ کر رہا تھا۔ انھیں میرے تعلیمی ریکارڈ میں دلچسپی تھی اور مجھ میں۔

داخلے کے بعد جس دن سارے نوارد ہال میں جمع کیے گئے تھے ان سب کا لباس وہ تھا جو بڑے ہو جانے پر لڑکے (اور لڑکیوں) کا ہوتا ہے۔ میں اپنی خود اعتمادی میں یہ بھی محسوس نہیں کر رہا تھا اپنے کپڑوں سے تھوڑا بڑا ہو چکا ہوں۔ لیکن ہوں گا میں تقریباً سارے ہی کالج کے لیے اچنبھا سا۔ آپس کی بات چیت میں میری بولی، میرے جوتے، کپڑے، ساتھ والوں سے کچھ کچھ الگ تھلگ رہنا اور کھاتے پیتے گھرانوں سے آنے والے نوجوانوں کی طرح روزانہ تک شاپ کا رخ نہ کرنا میری نظر میں یہ سب کوتاہیاں نہیں تھیں۔

دوسرے چاہتے تو ان سب کا مذاق اڑا سکتے تھے لیکن سو(100) میں سے 99.99 نے کبھی اُن کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ بس ایک کلاس فیلو کو میں پسند نہیں تھا۔ کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا۔ ہوسکتا ہے اسے جس کالج میں وہ آیا تھا میں بے جگہ لگتا ہوں۔ اَن فٹ۔ ایک کم حیثیت انسان کی جان کاری، اس کا علم، ایک با حیثیت فرد میں جو ان سے عاری ہو حقارت کے سوا کیا جگا سکتی ہے! میرا پیچھے ہٹا ہوا بچپن اس دور میں اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا تھا ورنہ میں اسے قابلِ معافی سمجھتا۔

ہلکے جاڑے شروع ہو چکے تھے۔ اکثر سٹوڈنٹس اب کالج سوٹ میں آنے لگے تھے۔ میں اپنی سکول کے دنوں کی اچکن سے کام چلا رہا تھا۔ وہ لڑکا سگریٹ کے پیکٹ اور کھٹا کے سے کھلنے والے سگریٹ لائیٹر کو ساتھ لیے کالج کی دنیا میں داخل ہوا تھا۔ جاڑوں میں ان میں رولی فلیکس کیمرے کا اضافہ ہوگیا۔ میرے پہناوے نے اس کی حقارت کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ اس کا کیمرہ سب کو مرعوب کرتا تھا، میرے پاس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے اس کے جملے مجھے کاٹتے تھے اور میری بے بسی میں خاموش رہنے سے ان کی کاٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ مجھے کلاس میں اور کلاس کے باہر مختلف ناموں سے پکارتا جن کے ساتھ انگلش بدرو کے لفظ جڑے ہوتے۔ جلدی میں کلاس میں پوچھے جانے پر بھی سوال کا جواب دینے سے کترانے لگا کہ میرے جواب کے ساتھ ہی مجھے اس کی ایک بھن سی سنائی دے گی جو کسی بیہودہ لفظ سے جڑی ہوگی۔ یا یہ کہ میرا جواب جسے پڑھانے والے/والی نے تحسین سے سُنا ہو میری پیٹھ کی طرف کہیں کیچڑ میں ڈھیلے کی طرح گرا ہوا اور اس کی چھینٹیں اچٹ کر مجھ پر پڑتیں جو تین عام استعمال میں آنے والی انگلش گالیاں ہوتی تھیں۔

اس دن جس کی تفصیل بیچ میں آگئی ہے ہم ایک پریکٹیکل کے بعد تھکے ہوئے لیکچر تھیٹر میں آئے تھے جہاں دائیں بائیں دیواروں پر لگے ہوئے پینلز پر ہر رَو row میں بیٹھنے والوں کے رول نمبرز چاک سے لکھے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کر لیکچرر خالی سیٹوں کے نمبر منٹ دو منٹ میں نوٹ کرتا اور لیکچر شروع ہو جاتا۔

اس دن سگریٹ لائیٹر والے اسٹوڈنٹ کی رنگ کرنے کی رگ کچھ زیادہ ہی بھڑکی ہوئی تھی۔ وہ پہلے تو اپنی دو صف پیچھے والی سیٹ سے انگریزی کے وہی تین گرے ہوئے لفظ O' You کہہ کر مجھے پکارتا رہا، پھر کاغذ کے ٹکڑے چبا چبا کر ہاتھ بڑھا کر اس نے میری اچکن کے کالر اور گردن کے بیچ میں گھسیڑنے شروع کیے اور جب میری خاموشی یا اس کی دلیری اس کی برداشت سے باہر ہوگئی تو وہاں اپنی سیٹ، اپنی رو row چھوڑ کر نیچے آکر میرے برابر والی خالی سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرا ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ مجھے یاد نہیں کب میں نے اپنا ایک سینڈل اتار اتار اس کے سر اور چہرے پر برسانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی پوری کلاس میں جیسے قیامت آگئی۔

امریکی لیکچرر نے بلیک بورڈ سے مڑ کر اس سین کو دیکھا اور انھیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ معاملہ کیا

ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ میری سیٹ تک پہنچے لیکن ان کا پہلا سوال مجھ سے نہیں، مجھے ایذا دینے والے سے تھا؛

"تم اس سیٹ پر کیسے ہو؟"

میری حالت وہ دیکھ رہے تھے۔

انھوں نے میرے tormenta کو وہیں چھوڑا جہاں تک وہ پہنچ پایا تھا اور مجھے ساتھ آنے کے لیے کہا۔ نیچے پہلی row رو کے جس حصے میں لڑکیاں بیٹھی تھیں ان میں ایک سیٹ میرے لیے پیدا کی اور مجھے اس پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ لڑکیاں خاموش رہیں، میری۔ این میرے برابر کی سیٹ پر مورتی کی طرح بیٹھی تھی۔ میرے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے اور میں ابھی تک غصے سے کانپ رہا تھا۔ لیکن ایک طرح سے دل مطمئن تھا کہ اُس عمل پر زیادہ زیادہ سے مجھے کالج سے نکالا جا سکتا ہے۔ تو کیا؟ شہر میں دوسرے کتنے ہی کالج ہیں۔ ان کے دروازے مجھ پر کھلے ہیں، لیکن نکالے جانے کا وہ خطرناک لفظ میرے ذہن پر منڈلا رہا تھا کیوں کہ تھا بہر حال میں ایک نئے ملک میں پناہ لینے والے گھرانے کا فرد اور اگر کیا جاتا تو کر بھی کیا سکتا تھا۔

بعد میں کلاس ختم ہونے پر جب ہم باہر نکلے تو اس لڑکے نے پھر انھی انگلش گالیوں کے ساتھ مجھ پر حملہ کرنا چاہتا لیکن وہ کم عمر امریکی پروفیسر اس سے طاقت میں کہیں زیادہ تھے۔ ان کے اُسے مجھ سے دُور کرنے ہی میں وہ گرتے گرتے بچا۔

اپنے کمرے میں انھوں نے مجھ سے پوری روداد سنی۔ سٹوڈنٹس کی پچھلی اور حالیہ کارگزاری کے کاغذات ان کی میز پر موجود تھے جس پر انھوں نے نظر دوڑائی اور مجھے کاغذ قلم دیا کہ سب کچھ لکھ دوں۔

لیکن جب ہم دونوں باہر آئے، وہ مجھے ڈین کے پاس لے جانا چاہتے تھے، تو کالج کا وقت ختم ہو چکا تھا اور اگلے دن سے کرسمس کی چھٹیاں تھیں۔ انھوں نے مجھے فکرمند نہ ہونے کے لیے کہا اور ساتھ ہی: enjoay the holiday کہا۔

ڈین کے آفس کے باہر دو طالب علم میرے دفاع کے لیے رُک گئے تھے کیوں کہ انھوں نے دیکھا تھا وہ بگڑا ہوا، کسی بھی گھرانے کا نوجوان کچھ دیر وہاں میری گھات میں کھڑا رہا تھا اور پھر ان بچانے والوں کے تیور دیکھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

کرسمس کی چھٹیوں کے بعد جب میں کالج لوٹا تو تنہا نہیں رہا تھا۔ میرا لنچ بریک میں راؤنڈاباؤٹ میں جا کر بیٹھنا یا وقت کو لائبریری میں گزارنا ختم ہو گیا۔ اب میں کلاس کے ساتھیوں میں سے ایک تھا جو اس واقعہ کا ذکر ایک بار بھی زبان پر نہیں لائے۔ میرا لباس بھی اب وہ نہیں رہا تھا، ان سب جیسا ہی تھا۔ پاس سے گزرتی ہوئی لڑکیوں کے چہروں سے بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان کے لیے وہ واقعہ ایسا تھا کہ وہ اُسے یاد رکھتیں۔

میری۔ این اب زیادہ نظر آتی تھی، اکثر اپنی اس دوست کے ساتھ، لیکن مجھے کبھی نہیں لگا انھوں نے

مجھے خاص طور سے دیکھا ہو۔ لیکن لائبریری جانا جو سال کے شروع میں اتنا ریگولر تھا اب میرے لیے کبھی کبھی رہ گیا تھا اور اس کے لیے بھی۔ یہاں تک کہ سال ختم پر آ پہنچا۔ سال جو زیادہ سے زیادہ دس مہینے کا ہوگا۔۔۔۔ اور انھی دنوں میں نے سُنا پروفیسر جورڈن انڈیا جا رہے ہیں۔ ان دنوں اکثر ایسا ہوتا تھا آج یہاں کے فلاں پروفیسر انڈیا منتقل کیے جا رہے ہیں۔ کل کوئی اور وہاں سے یہاں آ جائے گا۔ اور ان کا یا مشنریوں کا ایک ملک سے دوسرے ملک میں ٹرانسفر ایسا تھا جیسے ملک کی کاٹ چھانٹ ہوئی ہی نہیں ہے، بارڈر کو پار کرنے کی پابندیاں ان کے لیے نہیں تھیں۔ ان کے لیے یہ اب بھی برما سے افغانستان اور ہمالیہ سے راج کماری تک پھیلا ہوا ایک ہی ملک تھا۔ مجھے اُن پر رشک آتا تھا۔ اور کیوں نہ آتا، میں سنتا پروفیسر کیمبیل گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے نیل گری میں پہنچ جاتے ہیں اور مسٹر اور مسز ڈنکن مسوری۔ ہم وہاں جانے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مل کہ میں تو اپنے اس شہر کو بھی نہیں جہاں پیدا ہوا، پلا بڑھا تھا۔ پروفیسر جورڈن کے جانے کی خبر سے وہ سٹوڈنٹس متاثر ہوئے تھے جنھوں نے میتھس لے رکھی تھی اور پروفیسر ہمارے نئے ملک میں عنقا ہو گئے تھے۔ میرے ساتھیوں پر اس خبر کا اثر نہیں ہوا لیکن خبر سُن کر مجھے دل تھاما ہوا سا لگا۔ کیا میری۔ این بھی چلی جائے گی اور اسی لمحے مجھے جواب بھی مل گیا وہ کیسے جا سکتی ہے، کورس پورا کرے گی۔ اس کی ماں اور وہ یہیں رہیں گی۔

امتحان کی آمد ہمارے لیے ایسے تھی جیسے کوئی سائکلون آ رہا ہو۔ اس نے سب کچھ بھلا دیا۔ میں نے ہفتہ دس دن محسوس ہی نہیں کیا کہ میری۔ این کلاس اٹینڈ نہیں کر رہی ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ تھی وہ اسی کالج، اسی بنگلے میں۔

اچانک ایک دن وہ مجھے کیمسٹری لیبارٹری میں، دوسرے سرے پر ایک ایکسپیریمنٹ میں مصروف نظر آئی اور ہمارے ڈیمونسٹریٹر وہاں اس کے پاس کھڑے اس سے سوالات کر رہے تھے۔ جو ایکسپیریمنٹ اُسے کرنے کے لیے دیا گیا اس سے مختلف تھا جو ہم کر رہے تھے۔ جو ہم شاید ہفتہ بھر بعد کرتے۔ پھر وہ اپنا جرنل سنبھالے ان کے ساتھ ان کی میز تک آئی۔ انھوں نے مزید دو ایک سوالوں کے بعد جرنل پر دستخط کیے اور اُسے میری۔ این کے حوالے کرتے ہوئے کچھ کہا، جس پر اس نے مسکرا کر تھینک یو کہا اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد لنچ بریک تھا۔ میں پیڑوں کے سائے میں جا کر اس بنچ پر بیٹھ گیا جہاں کالج کی اکیڈمک عمارتوں کے خاتمے پر سامنے وہ سٹریٹ تھی جو سٹاف کے بنگلوز کے درمیان چلتی ہوئی اس راؤنڈ اباؤٹ کو جاتی تھی۔ جہاں ایک زمانے میں مَیں بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ تب ہی کی طرح کا سناٹا اس وقت بھی میرے اندر تھا۔

پھر وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ جاتی نظر آئی۔ میرا سارا حجاب یک بارگی اٹھ گیا اور تیز تیز قدموں چلتا میں اُن تین تک پہنچا اور میرے منہ سے نکلا: "Excuse me"

میرا خیال تھا وہ حیران ہے اس لڑکے کو آج مجھ سے کیا بات کرنی ہے جس نے سال بھر میں پاس سے گزرتے ہوئے کبھی سر کی جنبش سے بھی وہ کام نہیں لیا جو محض پہچان پر لوگ کیا کرتے ہیں جیسے چرچ میں ہوتے اس نے بارہا دیکھا ہوگا۔ جیسے مسجد میں ہوتے میں دیکھتا آیا تھا۔

گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے میں غائب ہوگئی۔ ماں میرا خیال ہے کچن میں چلی گئی تھیں۔ اور باپ؟ وہ بھی گھر میں کہیں تھے۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا۔ جہاں میرے سامنے ایک چھوٹی میز پر رسالے پڑے تھے۔ ان میں سے میں نیشنل جیوگرافک کو جانتا تھا اور ریڈرز ڈائجسٹ کو بھی لیکن باقی رسالے کسی ایسے پرنٹ میں تھے جو ہندی سے ملتا جلتا تو تھا، ہندی نہیں تھا۔ میں اُن کے ورق الٹ رہا تھا کہ اس کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ اب وہ گھر کے کپڑوں میں تھی ---- ہلکے رنگوں کا گھٹنوں کے نیچے تک پہنچنے والا ڈریس۔ بالوں میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ چہرے کے دونوں طرف چٹیاں تو تھیں لیکن ان کے گچھے اس نے کھول دیے تھے اور وہ کندھوں کے آگے سینے پر آ گئی تھیں۔ وہ بھی اس وقت سکول گرل لگ رہی تھی۔

میں بلاضرورت احتیاط برت رہا تھا کہ اس کی طرف دیر تک نہ دیکھوں۔ بس بات کا جواب دینے تک۔

ایک کمرے کے دوسرے سرے پر کھانا لگ رہا تھا۔

میری۔ این نے میرے ہاتھوں میں غیر زبان کے رسالے کو دیکھ کر کہا: ‘‘آپ اسے پڑھ سکتے ہیں؟’’

میں نے نہ میں سر ہلاتے ہوئے کہا: ‘‘تصویریں دیکھنے کی حد تک۔’’ وہ ہنس پڑی۔ ‘‘کون سی زبان ہے؟’’

اس نے جھک کر میز پر رسالوں کو تاش کے پتوں کی طرح سرکا کر تین گڈیوں میں کر دیا اور ایک پر انگلی رکھ کر کہا ‘‘یہ ملیالی ہیں، یہ تیلیگو اور ان سے آپ خود واقف ہیں۔’’

آپ ان دونوں کو پڑھ سکتی ہیں؟ میں نے ان پر انگلیاں رکھ کر بھوؤں کی جنبش سے پوچھا۔

اس نے کہا: ‘‘صرف انگلش، ساتھ ہی میں نے کہا: میری طرح’’ اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

‘نہیں اردو بھی، اس نے کہا۔ میں کھسیا گیا، اسے معلوم تھا سائنس کے مضامین کے سوا میرا آپشنل مضمون کیا تھا۔ پھر ملیالی رسالوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے کہا: ‘‘یہ مدر کے لیے ان کے پپا کوچن سے بھیجتے ہیں کہ ان کی بیٹی اپنی زبان نہ بھول جائے۔

‘‘اور یہ؟’’

‘‘یہ میرے فادر خود منگواتے ہیں، شاید بنگلور سے، اور وہ مدر کے پاس آنے والے رسالے بھی پڑھتے ہیں۔ میرا خیال ہے اب انڈیا جا کر وہ زبانوں کے اپنے repertoire میں کچھ اور کا اضافہ کریں گے۔ وہ زندگی بھر علم حاصل کرتے رہنے کے قائل ہیں۔’’

میں نے متاثر ہوکر کہا: ''اور شاید ان کا اثر آپ میں بھی آیا ہے۔ ''

''وہ کیسے؟''

''آپ بھی اتنی ہی سنجیدہ ہیں، پڑھاکو۔ ''

اس کی ماں نے دور سے کہا: ''شام کو اسے کوشو کے ساتھ شور مچاتے سنو گے تو سمجھو گے ابھی نرسری میں ہے۔ ''

کھانے کا میز لگانے کا کام پورا ہو چکا تھا۔ اس کی ماں، مسز جورڈن نے خود وہاں کھڑے ہوکر میرے لیے بھی پلیٹیں لگوائی تھیں۔

ماں کا اشارہ پا کر میری۔ این نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ پروفیسر جورڈن بھی ایک کمرے سے نمودار ہوئے۔ اُن کے ہاتھ میں آج کا اخبار تھا۔ میز پر سب کی جگہیں مقرر تھیں۔ مجھے اس طرف بٹھایا گیا جو میری۔ این کے بالمقابل تھی۔ جو اس کے برابر کی جگہ تھی وہاں جب گھر میں ہوتا ہوگا تو کوشو بیٹھتا ہوگا۔ جب کرسی کھینچ کر پروفیسر جورڈن بیٹھنے کو ہوئے تو مسز جورڈن نے اخبار کو ان سے چھینتے ہوئے ملائمتی لہجے میں کہا؛ ''یہ خیال رہے اس وقت گھر میں مہمان بھی ہے۔ ''

ہنس کر انھوں نے اخبار اپنے کندھے پر سے پیچھے اچھال دیا۔

میری۔ این نے باپ کو چھیڑنے کے لیے مجھ سے کہا: "Thats how my father is"

سب ہنس پڑے۔

شروع میں مَیں نے باوجود اصرار کے کھانے سے انکار کردیا۔ اور کہہ رہا تھا: ''میں تو صرف ملنے آیا تھا۔ ''

میری حالت اس ضرورت مند کی تھی جسے ایک عمر وہ جو کچھ چاہتا تھا نہیں ملا اور یکا یک غیب نے اپنی عطا کے دروازے اس پر کھول دیے ہوں۔ سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ جسے لاکھ جھٹلاؤں، دیکھنے مل کر دیکھ پانے کا آرزومند رہا تھا ۔۔۔ گھر کی تعلیم کے خلاف ۔۔۔ آج وہ اتنی نزدیک ہے ۔۔۔ یہ سب کچھ میری توقع سے باہر تھا۔

پھر میں نے محسوس کیا ماں، باپ اور بیٹی کھانا شروع کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں، اس لیے جب میری۔ این نے میری طرف دیکھتے ہوئے چھری کانٹا میز پر رکھ دیا تو مجھے ان کا ساتھ دینا پڑا۔

کھانا کھاتے ہوئے یک بارگی ہمت کر کے میں نے کہا: ''آپ لوگ لوٹ کر پھر یہاں آجائیں گے؟''

''نہیں'' اس نے آہستگی اور نرمی سے کہا۔ "no, never" اس کے ماں باپ نے جیسے

چھٹکارے سے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر پروفیسر جورڈن، میری زندگی کا پروگرام پوچھنے لگے۔ ''آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟'' ان کا خیال درست تھا maths نہ لے کر اعلیٰ سائنس کے دروازے میں نے اپنے اوپر بند کر لیے تھے۔ Marianne too"

انھوں نے اپنی بیٹی کو چھیڑنے کے انداز میں کہا۔ لیکن ان کا زور اس پر تھا جو کچھ کرنا اس میں کسی کے مشورے یا پھرتی سے ترقی کے زینے چڑھنے کے امکانات کا تجربہ نہ ہو۔

ان کی گفتگو میں ہندوستان کی ان یونیورسٹیوں کا ذکر بھی آجاتا تھا جہاں وہ پڑھے تھے، پڑھا چکے تھے۔ وہ، وہ تھے جنھیں تعلیم کی دنیا میں academic کہا جاتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔

میری۔ این خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ معمولی روزمرہ کا کھانا لیکن جو میرے لیے نیا تھا۔ ابلے ہوئے چاول، بچ جیسے بیجوں کا سالن، تلی ہوئی چھوٹی مچھلیاں جو اکثر میری ماں بھی بناتی تھیں ۔۔۔ لیکن مختلف طرح۔ اور کمی پوری کرنے کے لیے ڈبل روٹی کے سلائس اور مکھن۔

یہ وہ لڑکی تھی، خاموش طبیعت، قبول صورت سے بڑھ کر، کھلتی ہوئی رنگت والی، ملیالی کرسچین، جس کی میں نے دل میں سدا عزت کی تھی۔ نوجوانی مل کر نوجوانی سے کچھ پہلے کسی بھی لڑکی کے لیے یہ سمجھ لینا کہ جس کے دل میں اس نے گھر کر لیا ہے اسے بھی اس میں دلچسپی ہے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس دور سے سب ہی نوجوان گزرتے ہیں۔ اکثر بار بار اور اس خوش فہمی کی حد کو ایک وقت آتا ہے کہ پار کر جاتے ہیں۔ لیکن میرا معاملہ ان دنوں دوسرا تھا۔

وہ ذہین اور وقت نہ ضائع کرنے والی لڑکی تھی۔ میں اس کی عزت کرتا تھا اور میری دانست میں اس نے بھی محسوس کر رکھا ہوگا کہ میں اس کی عزت کرتا ہوں۔ عمر کی اس محدود وژن میں ہم دونوں کے علاوہ کلاس میں تھا اور کون جس کے بارے میں، مَیں اور میرے خیال میں وہ سوچتی ہو!

کھانے کے بعد چائے ہوئی۔ لنچ بریک ختم پر تھا۔ میرا خیال تھا وہ کلاس جائے گی اور ہمارا خاموش ساتھ ختم ہو جائے گا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ذرا دیر کے لیے اپنے کمرے میں گئی لیکن جب باہر آئی تو خلاف توقع اس کے ہاتھ میں نہ نوٹ بک تھی، نہ کوئی کتاب، قلم پنسل بھی نہیں۔

میں نے کہا: ''آپ کلاس خالی ہاتھ جائیں گی؟''

''میں اپنا ایک experiment پورا کرنے گئی تھی جو رہ گیا تھا اور دوسرا جو اگلے ہفتے ہونا ہے۔''

میرے منہ سے تعجب میں صرف ''او'' نکلا۔

ایک بار پھر مجھے احساس ہوا واقعی کئی دن سے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا اور سن رہا تھا وہ

انڈیا جا رہی ہے۔ میں ''وش یو گڈ لک'' کہہ کر باہر آ گیا۔ وہ مجھے گارڈن گیٹ چھوڑنے آئی لیکن ساتھ کے ان چند لمحوں کو میں نے خاموشی میں گنوا دیا۔

پھر میں نے اس کی ٹوہ رکھی۔ اب کہاں ہے، اب کہاں، کس کلاس میں؟ لیکن یہ دلیری ایڈولیسینس adolescence (کم عمری) کے گذر جانے کے بعد ابھری تھی جب میں کلاس کی لڑکیوں سے، جہاں بھی مل جائیں بات کرنے لگا تھا۔ ان میں سے بھی ہر ایک مجھے میمون کہہ کر بات کرنے لگی تھی۔ مسٹر احمد یا مسٹر میمون احمد کہہ کر مخاطب کرنے کا زمانہ ختم ہو گیا تھا اور میرے لیے وہ میگی، میرا اور زینت بن گئی تھیں۔ لیکن کبھی کسی نے حتیٰ کہ اُس کی دوست، اُس ویل ڈریس والی لڑکی تک نے محسوس نہیں کیا کہ جب ہم اس گزرے ہوئے زمانے کا ذکر کرتے ہیں تو اس سرحد پار چلی جانے والی لڑکی کا ذکر بھی اس میں آ جاتا ہے؛

اب اس نے بی۔ ایس۔ سی کیا، اب ایم۔ ایس۔ سی بوٹنی میں، اب شادی ہو گئی۔ پڑھا بھی نہیں رہی ہے۔ اب وہ لوگ شملے میں رہتے ہیں۔ جہاں اس کے شوہر کی پوسٹنگ ہے۔ ڈاکٹر جوزف جورڈن اور مسز کلارا جورڈن کسی کو نہیں معلوم (شروع میں ویلور گئے تھے) کہاں ہیں۔

ایک ساتھ والی لڑکی نے البم میں اپنی بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک کی تصویریں دکھائیں۔ اس میں ایک تصویر میری۔ این کی بھی تھی۔ دروازے کی دہلیز پر بیٹھی ہے، پیر نیچے کے قدم پر ہیں۔ چٹیاں اسی طرح تھیں، ذرا لمبی، دونوں طرف کندھوں سے لٹکتی ہوئی۔

میں نے اس سے وہ تصویر نہیں مانگی۔ مانگتا تو بلا توقف دے دیتی اور اگر چھیڑ میں کچھ کہتی تو میں جھٹلاتا نہیں۔۔۔۔ کندھا چکا کر کہا: وہ تھی ہی پوجا کے لائق۔۔۔۔''

میرے پاس وہ گروپ فوٹو بھی نہیں ہے جس میں میری۔ این جورڈن بھی ہے لیکن میں کسی وجہ سے وقت پر نہیں پہنچ سکا تھا۔۔۔۔ اور ''وہ تھی ہی پوجا کے لائق'' کہنے کے بعد شاید یہ بھی کہتا ''وہ میرے گزارے ہوئے اتنے دنوں، اتنے سالوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی ہوگی۔ اور شاید اُسے وہ لڑکا یاد بھی نہ ہو جس نے اس سے آخری دنوں میں ایک دن تھوڑی دیر بات کی تھی، جس غصے سے کانپتے اور روتے ہوئے کو پروفیسر نے لا کر اس کے برابر کی سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔ ویسے بھی نو، دس مہینے کا ساتھ کوئی ساتھ ہوتا ہے!

وہ البم دیکھتے وقت، اُس عمر کو پہنچتے پہنچتے، میرا رتبہ میری نظروں میں وہ نہیں رہا تھا جسے لیے میں کالج کے پہلے سال میں داخل ہوا تھا، جس نے مجھے بہکا رکھا تھا کہ میں ایسا طالب علم ہوں کہ اس جیسی اہم کلاس فیلو صرف میرے بارے میں سوچتی ہوگی۔

میں چاہت کی اُن جڑوں کو اب بھی پانی دیتا ہوں گو اُن کے اوپر کوئی پودا نہیں ہے۔ وہ جس زمین کو چلی گئی تھی کبھی میں بھی وہیں کا تھا۔۔۔۔ دونوں کی یاد کبھی پھل نہ لانے والی ہے۔

محمد الیاس

خاندانی لوگ

پاپا! بہت دنوں سے میرا دل چاہ رہا ہے کہ آپ کو خط لکھوں لیکن میں اکیسویں صدی کی پیداوار ہوں، آئی ٹی میں ایم ایس سی۔ صرف گھر میں بڑوں کی زبانی سُن رکھا ہے یا انگریزی اور اُردو لٹریچر میں پڑھا کہ گزرے ہوئے وقتوں میں خط کی بہت اہمیت ہوا کرتی تھی۔ ایک دوسرے سے دور دراز مقامات پر رہنے والے عزیز و اقارب، دوست احباب، بے لوث محبت میں گرفتار متوالے، کاروباری حضرات اور سرکاری ادارے، گویا انسانی معاشرے کے ہر شعبے سے متعلق لوگوں کے مابین رابطہ بذریعہ خط و کتابت ہی ہوا کرتا تھا لیکن اس جدید دور میں تو فون کال اور ایس ایم ایس کی بھی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں دل چاہتا ہے کہ آپ کو خط لکھوں۔

گو کہ ہم ایک ہی شہر میں رہ رہے ہیں۔ میرے میکے اور سسرال میں ہر سہولت موجود ہے۔ وڈیو لنک کے ذریعے بھی بات کر سکتے ہیں، بالکل آمنے سامنے......اور ملاقات کرنے پر بھی پابندی نہیں۔ شوفر ڈریون گاڑیاں ہیں۔ طُرفہ ماجرا ہے کہ فون پر بات کرنے اور رُوبرُو ہونے پر ذہن آمادہ نہیں ہوتا۔ ایک ہی دُھن سوار ہے کہ آپ کو خط لکھوں۔ جب کہ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اُول فول اور بے ربط جملے لکھوں گی۔ دماغ میں خیالات کا ہجوم ہے۔ صحیح طرح سے ترتیب بھی نہیں پا رہے۔ باتیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ آگے کی پہلے اور ابھی جو سامنے تھیں، وہ کہیں پسِ منظر میں دھندلا رہی ہیں۔ تاہم یہی فیصلہ کیا ہے کہ جو بات جیسے ہی ذہن میں آئی لکھ دوں گی۔ آپ کا شمار عصرِ حاضر کے کامیاب لوگوں میں ہوتا ہے، بہت زیرک ہیں، خود ہی سمجھ جائیں گے۔

ایک بات تو آپ کی سوفی صد درست ثابت ہوئی کہ میرے سسرال والے بھی میکے کی طرح واقعی خاندانی لوگ ہیں۔ مشرقی روایات اور اسلامی اقدار پر کاربند یہ وضع دار خاندان، قدیم اور جدید کا حسین امتزاج ہے۔ مذہبی رسُومات اور عبادات کی پابندی کرتے ہوئے، جدید ترین سائنسی ایجادات سے بھی پوری طرح مستفید ہو رہے ہیں۔ آپ کی طرح اِن کا بھی یہی خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت کمانے پر مذہب نے قدغن نہیں لگائی۔ اِس گھرانے میں اور ہمارے، جو کبھی میرا بھی ہوا کرتا تھا، والے میں بزرگوں کا برابر احترام کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی لائبریری میں قریب قریب ویسی ہی کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے، جو آپ نے ڈھیر کر رکھی تھیں اور مجھے پڑھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ میں یہاں بھی اُن کتابوں کی ورق گردانی کرتی رہتی

ہوں۔ چوں کہ مجھے سوائے بناؤ سنگھار کے اور کوئی کام ہی نہیں، لہٰذا اِسی طرح وقت گزارتی ہوں۔ میرے میاں چوں کہ اہم وزارت کا قلم دان سنبھالے ہوئے ہیں، اس لیے اُن کی مصروفیات بے پناہ ہیں۔ بقول آپ کے، بیٹی کا رشتہ ہم کفو کے ساتھ ہونا چاہیے۔ شوہر واقعی ہم کفو ہے لیکن یہ اور بات کہ ہم کفو کے پاس وقت نہیں۔ میرے بیڈ روم پر ایک کروڑ روپے سے بھی زاید رقم خرچ ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ جس بیڈ پر سوتی ہوں، وہ بیس لاکھ روپے کا ہے۔ بار بار لباس بدلتی ہوں، ہار سنگھار کرتی ہوں۔ بیوٹیشنسٹ کے پاس اور جم بھی جاتی ہوں۔ پھر بھی وقت بچ رہتا ہے۔ انٹرنیٹ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ بہت پرانی اور نایاب کتابیں دیکھنے کا اچھا شغل ہاتھ آ گیا ہے۔

آپ کے پسندیدہ عالم فاضل مصنفین کی ساری کتابیں موجود ہیں۔ جب خط لکھنے کا خبط سوار ہوا تو سمجھ نہ پائی کہ کیسے شروع کرنا ہے۔ اِنھی کتب میں سے مدد لینے کی کوشش کرتی رہی لیکن جب یہ خط آدھے سے زیادہ لکھ چکی تو ایک کتاب میں خطوط کے مختلف نمونے نظر آ گئے۔ باپ کے نام بیٹی کو جو القابات لکھنے کی تلقین کی گئی ہے، وہ دراصل خط کے شروع میں لکھنے تھے لیکن اب دوبارہ تردّد کرنے پر دل نہیں مان رہا لہٰذا یہیں لکھ دیتی ہوں۔ آپ یہی سمجھ لینا کہ یہ میں نے شروع میں لکھے ہیں۔ انھیں پڑھنے میں مزہ آ گیا تو لکھنا کتنا خوشگوار تجربہ ہوگا: ''جناب والد صاحب معظم و محترم فرزندانِ مخدوم و مُطاع کمترنیاں دام ظلکم العالی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ بعد تسلیم بصد آداب و تکریم عرض ہے کہ ......''

عرض جو بھی کرنا ہے، وہ میں کرتی آئی ہوں، اوپر کافی ہو چکا ہے، باقی کا بھی کر دوں گی۔ جمع خاطر رکھیے۔ اس کتاب میں بیٹی نے خط کے اختتام پر اپنے آپ کو لونڈی لکھا ہے۔ یعنی ''آپ کی لونڈی......'' یہ لفظ مجھے اچھا نہیں لگا۔ لُغت میں دیکھا تو معنی زیادہ بُرے نہ تھے۔ کنیز، باندی اور خادمہ وغیرہ۔ لیکن اِنھی کتابوں میں سے ایک میں لکھا ہے کہ لونڈی کی کوئی حُرمت نہیں ہوتی۔ اسے خریدنے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لینے میں ہرج نہیں۔ یعنی، بغیر لباس کے، سینہ اور آگے پیچھے سے، وغیرہ وغیرہ...... آپ نے خود یہ سب کچھ پڑھ رکھا ہے، میں کیا وضاحت کروں...... ویسے جس کتاب سے میں نے آپ کے لیے القابات نوٹ کیے ہیں، اس میں بیوی کو اپنے شوہر کی مطیع و فرماں بردار رہ کر اُس کی خدمت میں خود کو پیش کر دینے کے حوالے سے جو ہدایات اور تعلیمات دی گئی ہیں، اُن کی رُو سے لونڈی کو اِس سے زیادہ ذِلت کیا اُٹھانی پڑتی ہوگی۔ اس لیے میں بھی اپنے آپ کو شوہر کی لونڈی ہی سمجھنے لگی ہوں۔ چوں کہ میرے شوہر کے نزدیک میری افادیت لونڈی سے زیادہ ہے بھی نہیں۔ اُس نے گھر سے باہر جو انتظامات کر رکھے ہیں، میرے خیال میں لونڈیوں کی نہ صرف ناز برداری کرتا ہوگا، بل کہ عین ممکن ہے کہ مجھ سے زیادہ اہم جانتا ہو۔ اس لیے کہ میں تو گھر میں پڑی ہوئی ہوں۔ جب اُس کی اپنی ضرورت ہو یا موڈ بن جائے تو مجھ سے میری مرضی یا خواہش جانے بوجھے بغیر استفادہ کر ڈالتا ہے۔

پاپا! آپ نے بُرا نہیں منانا۔ آج کھل کے ہر بات لکھ دوں۔ ابھی تو یہ فیصلہ بھی نہیں کر پائی کہ واقعی ڈاک خانے سے آپ کو خط بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجوں گی یا...... مجھے ڈر ہے کہ گھر میں کوئی اور نہ کھول لے......اور پھر عجیب طُرفہ تماشا لگے گا کہ اِس دور میں ایک ہی شہر کی رہائشی بیٹی اپنے باپ کو بذریعہ ڈاک خط ارسال کر رہی ہوں۔ لفافے پر ایڈریس لکھنے کا جھنجھٹ الگ۔ ہو سکتا ہے، آخر میں یہی فیصلہ کروں کہ آپ کی فیس بک پر اِن باکس پہ ساری تحریر ٹائپ کر کے سینڈ کر دوں۔

خیر، یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے جو کہنا چاہتی ہوں، وہ کہہ لوں۔ اپنے آپ کو اپنے ہم کفو شوہر کی لونڈی لکھ کر خاصی رعایت برتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ کاش میں سچ مچ کی ہی لونڈی ہوتی تو شاید وہ تھوڑی سی قدر کرتا۔ کوئی ناز نخرہ اُٹھاتا۔ یوں عجلت میں فارغ ہو کر بیس لاکھ روپے کے بیڈ پر بے سُدھ ہو کے پڑ رہتا ہے، جیسے میرے دادا سُسر اپنے بیڈ کے ساتھ تپائی پر رکھے اُگالدان میں بلغم تھوکتے ہیں۔ اِس گھر میں مشہور ہے کہ یہ اُگالدان دس کلو خالص چاندی کا بنا ہوا ہے اور اس پر سونے کے جڑاؤ پھول بیس تولے کے ہیں، جن میں سچے زمرد لگے ہوئے ہیں۔ دادا، گلے میں ریشہ اُترتے ہی سر تکیے سے اُٹھا کر کہنی کے بل سہارا لیتے ہیں اور منہ میں جو کچھ آیا ہو، اُگالدان میں اُگل دیتے ہیں۔

نہ جانے میرے دماغ میں کیا خناس گھس بیٹھا ہے کہ اپنے آپ کو منقش اُگالدان تصور کرنے لگی ہوں، جس کی ہر روز بڑے اہتمام سے صفائی ستھرائی ہوتی ہے اور بالکل نئے جیسا چمکنے لگتا ہے۔ گھر کے تمام واش رومز کی ٹائیلز، سینٹری ویئرز اور فٹنگز فرانس سے منگوائی گئی تھیں۔ اِن کی صفائی بھی اس مہارت سے ہوتی ہے کہ سو فی صد نئے نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک دن میرے ہم کفو نے اتنا وقت بھی نہ لیا، جتنا دادا سُسر اُگلنے میں لیتے ہیں۔ اور پھر واش رُوم کی طرف چھلانگ لگا دی۔ واپس آ کر بتایا کہ آج اپنے قائد کے ساتھ ڈنر کیا تھا۔ نہ جانے لُوز موشن کیوں آیا۔

تب سے میرے دماغ میں ایک اور طرح کا خلل آ گیا ہے کہ میں اُگالدان نہیں، کموڈ ہوں۔ یہ خلل اور بھی پختہ ہو گیا، جب میرے ہم کفو نے بتایا کہ آپ نے اُس کے فرنٹ مین کا کردار ادا کرتے ہوئے اب تک دو ارب روپے سے زیادہ کما لیے ہیں۔ مجھے اپنا یونیورسٹی فیلو، ذی شان بہت یاد آنے لگا ہے۔ آپ نے اُس کا پروپوزل اِس بنا پر ریجیکٹ کیا تھا کہ بے چارے کا باپ فائیو اسٹار ہوٹل میں ملازمت کے دوران خاص خاص کسٹومرز کو اسپیشل سروسز کے لیے مخصوص نمبر دیا کرتا تھا۔ ذی شان نے اِس الزام کو تسلیم کیا اور بتایا کہ شروع میں ابا جی کے پاس کال گرلز کے رابطہ نمبر ہوا کرتے تھے لیکن انھوں نے جلد ہی اپنی ڈیوٹی تبدیل کروالی۔

پاپا! آپ نے کہا تھا کہ ذی شان کا باپ، کال گرلز سے اپنی کمیشن کھری کیا کرتا تھا۔ جب میں نے ضِد کی اور روئی تھی تو آپ نے مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے کو بھڑوے کی اولاد کہہ کر سختی سے ڈانٹ دیا تھا کہ ہم خاندانی لوگ ہیں، بیٹی کو دلال کے بیٹے سے کیسے بیاہ دیں...... اِس سے کہیں بہتر ہے کہ گلا دبا کر قصہ

پاک کریں …… پاپا! میرے دماغ میں واقعی شیطان مردود گھس آیا ہے، جو مجھے کچھ اور لکھنے کو مجبور کر رہا ہے۔ لیکن میں شریف گھرانے کی بہو بیٹی ہوں …… وہ بہت قابلِ اعتراض بات ہے۔ شریف لڑکی کو زیب نہیں دیتی۔ ابلیس جو بھی کہے، میں اس راندۂ درگاہ کی باتوں میں آ کر وہ بات نہیں لکھوں گی۔ حقیقت جو بھی ہو، اس سے فرق نہیں پڑتا، چوں کہ میں اپنے شوہر کی منکوحہ تو ہوں۔ گو کہ وہ میری نہیں، آپ کی پسند ہے۔ میں اپنے آپ کو مسلسل قائل کرنے کی کوشش میں ہوں کہ باپ کی مرضی اور مطلب کے مرد کا کموڈ بننے والی عورت ہی شرفا کے معاشرے میں دخترِ نیک اختر کہلانے کی سزاوار ہوتی ہے۔

دُعا کیجیے کہ آپ نے میرے ذِمّے جو ڈیوٹی لگائی ہے، اللہ تعالیٰ اُسے پوری کرنے کی استقامت عطا فرمائے۔ باقی یہاں سب خیریت ہے۔ زیادہ حدِ ادب۔ فقط والسّلام۔ آپ کی دخترِ نیک اختر عُفی عنہا۔

☆☆☆☆

آغا گل

کاغذی دوست

بہت دنوں کی بات ہے ملک میں پہلا مارشل لاء لگا تھا۔ لوگ گھبرائے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ میرے والد کو ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز سبی لگا دیا گیا۔ سبی ڈسٹرکٹ میں برنائی شاہرگ مری بگٹی علاقہ شامل تھا۔ کولپور سے جھٹ پٹ تک پھیلا ہوا تھا۔ ضلعی صدر مقام تو سبی ہی تھا مگر گرمیوں میں دفاتر زیارت چلے جاتے اور پندرہ اکتوبر سے دوبارہ سبی میں کام کرنے لگتے۔ سبی تو ایک پر رونق شہر ہے مگر زیارت بالکل اجڑا اجڑا ویران ویران سا لگتا تھا۔ خاموشی صدیوں سے چھائی ہوئی تھی، ایسی کہ دل کو ہول آنے لگتا۔ سبی کا بارزہائی سکول گھما گھمی والا تھا جب کہ زیارت کا پرائمری سکول اس کے مقابلے میں بے آباد سا لگتا۔ کچھ فاصلے پر مڈل سکول تھا وہ بھی سویا سویا رہتا۔ زیارت میں سارا دن تنہائی کا بھوت مجھے گھیرے رہتا۔ ہمارا ملازم رحیم سبی کے گاؤں تلی کا باسی تھا۔ بڑا ہی ہمدرد انسان تھا۔ وہ میری دل جوئی کے لیے مجھے کہانیاں سنایا کرتا۔ اچھے پکوان بناتا۔ رات کو تنہائی کے ساتھ خوف بھی آ دبوچتا۔ جوں جوں سائے پھیلتے اور اندھیرے بڑھتے مجھے ڈر لگنے لگتا۔ حتیٰ کہ صنوبر کے جنگل جو دن بھر تو سرسراتے مدھم سروں میں رات کو بھیانک ہو کر پھیلنے لگتے۔ سہ پہر میں اپنے دوستوں کے ہمراہ صنوبر کے جنگلوں میں نکل جایا کرتا۔ جہاں نیلے پھولوں والی شمشوب کی جھاڑیاں حد نگاہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اب کھمبے تو ہیں بجلی نہیں مگر ان دنوں کھمبے بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔ سر شام زیارت تاریکی میں ڈوب جایا کرتا۔ بابا دفتر سے لوٹتے تو بعض اوقات فائلیں ساتھ ہی لے آیا کرتے۔ ہمارے گھر میں لالٹینیں روشن ہوا کرتیں۔ جن کے شیشے رحیم روزانہ صاف کر دیا کرتا۔ کتابیں پڑھنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہ ہوا کرتا۔ امریکہ کی جانب سے طلباء کے لیے بہت سے کھلونے، رنگین پنسلیں اور باتصویر کتابیں آیا کرتیں۔ مگر مجھے تو انگریزی پڑھنا نہیں آتی تھی۔ تصویریں ہی دیکھ لیا کرتا۔ راتوں کو پہاڑوں میں وادیاں ہواؤں سے گونجتیں، بھیڑیے بولتے تو مجھے بہت ڈر لگتا۔ مارے ڈر کے میں لحاف میں لپٹ جایا کرتا۔ اپنی دانست میں یوں میں محفوظ ہو جایا کرتا۔ بابا میرے خوف سے بہت برہم ہوا کرتے۔

”مرد نہیں ڈرتے۔ تم بہادر ہو اور مرد تو پتھر ہوا کرتے ہیں چاہے جان دے دیں مگر ان کی آنکھوں سے آنسو نہیں ٹپکتا“۔۔۔ ایک روز وہ بہت ہی ناخوش ہوئے۔۔۔ ”تمہیں مرتا دیکھ کر مجھے اس قدر صدمہ نہ ہوتا جتنا تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ہو سکتا ہے۔“

تب سے میں دانت دبا کر داڑھیں بھینچ کر بے تاثر چہرہ رکھنے کا عادی ہو گیا۔ تنہائی میرا دل چھید

ڈالتی۔ اکیلا پن مجھے مارے ڈالتا مگر میں بہادری کا ناٹک کیے رہتا۔ بہادر کا روپ دھار لیا کرتا۔

"بابا چٹانوں کی مثال دیا کرتے جن سے ٹکرا ٹکرا کر سمندر چیختا تڑپتا پیچھے ہٹتا ہے۔ جب کہ سمندر میں چٹانیں ہزاروں لاکھوں برس سے سینہ تانے کھڑی ہیں۔ بے کراں سمندر کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ سمندر کی لہریں چٹانوں سے ٹکراتی ہیں مگر چیختی چلاتی خود ہی پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ ہزاروں برس سے چٹانیں یوں ہی لہروں کی دھنائی کر رہی ہیں"

ان کے پاس ایک پستول تھا۔ ویبلے اینڈ اسکاٹ اور ایک بڑا سا چاقو۔ وہ چاقو میں اکیلے میں پاس رکھ لیا کرتا۔ انجانے میں یوں لگتا کہ یہ چاقو زندہ جیتا جاگتا رشتہ ہے، پھر لگا یہ پہاڑ یہ برساتی ندیاں زندہ ہیں، مجھے لوریاں دیتی ہیں اور صنوبر کے درخت اور شمشوب کی معطر جھاڑیاں۔ مگر زندگی بہت اکیلی اکیلی تھی۔ مجھے صدمہ بھی ہوتا، ندامت بھی کہ میرے بابا کو اللہ نے بے خوف نڈر بیٹا کیوں نہ دیا؟ کیسا مشکل ہوتا ہے جبڑوں پر زور دے کر آنسو روکنا۔ مگر پھر ناک بہنے لگتی۔ ان دنوں لوگ باہم مل جل کر رہا کرتے تھے۔ خواتین چڑیلوں والے کالے برقعے پہن کر سہ پہر میں سیر کے لیے نکلا کرتیں۔ بچوں سے اپنا چاند چہرہ چھپایا نہ کرتیں۔ مجھ سے خاص ہمدردی کیا کرتیں۔ سرگوشیوں میں کہا کرتیں "یہ بیچارہ اکیلا رہتا ہے؟ اپنے باپ کے ساتھ۔" اور کوئی کہتیں "تمہیں ڈر تو نہیں لگتا اکیلے میں"۔ میں نے بچپن سے ہی جھوٹ بولنا سیکھ لیا تھا۔ اک جھوٹ سو سکھ۔ میں جی کڑا کر جواب دیتا "جی نہیں! میں مرد ہوں مجھے ڈر نہیں لگتا"۔ مگر ڈر میری ریڑھ کی ہڈیوں میں سرائیت کر جاتا۔ ایک روز میں نے ہچکچاتے ہوئے بابا سے کہا کہ میرا تو کوئی دوست بھی نہیں ہے۔ میرے ہم جماعت اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ پر رونق گھروں میں رہتے ہیں۔ وہ میرے ہاں آنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور وہ ہمارے گھر کو بھوت بنگلہ کہتے ہیں۔ بابا بہت محظوظ ہوئے۔ کچھ دیر تک وہ ہنستے رہے۔ پھر ان کے جبڑے کچھ کس سے گئے جیسے دانت بھینچ لیے ہوں۔ پھر ان کی ناک بہنے لگی۔ انہوں نے جھٹ رومال نکالا اور میری بات کا جواب دیے بغیر ہی وضو بنانے چلے گئے۔ وہ پلٹے تو ان کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ آنکھیں کچھ لال لال سی ہو رہی تھیں۔

"چند ہی برس کی بات ہے بیٹا۔ پھر تم میٹرک کر لو گے، میں تمہیں کوئٹہ کالج میں داخل کرا دوں گا۔ وہاں ہاسٹل میں بہت رونق ہوا کرتی ہے۔ اتنے دوست ہوں گے کہ تمہیں وقت ہی نہیں ملے گا حتیٰ کہ میرے لیے بھی۔" ان کے جبڑے جو کچھ ڈھیلے تھے دوبارہ کھنچ گئے۔ پھر انہوں نے مجھے ادبِ لطیف رسالہ دیا پڑھنے کو اور شفقت سے بولے یہ ذرا مشکل تو ہوگا تمہارے لیے کہ ابھی سے ادب پڑھو۔ مگر ایسا ہے کہ مشکل لفظوں کے نیچے لکیر لگا دیا کرنا۔ مشکل لفظوں کا مطلب میں تمہیں بتا دیا کروں۔ رفتہ رفتہ مجھے ادبِ لطیف سے بھی محبت سی ہوئی اور ہوتی ہی چلی گئی۔ ان دنوں لاری کو ڈاک کہا کرتے تھے کیوں کہ لاریوں کے ذریعے ہی ڈاک آیا کرتی تھی۔ ڈیڑھ دو بجے دور کے دڑے سے مٹی اڑنے لگی تو بچے دوڑ پڑتے "ڈاک آئی، ڈاک آئی" بیرونی

دنیا سے ہمارا رابطہ اسی ڈاک کے ذریعے تھا۔ یہ سیٹھ گلاب سنگھ کی ایک کھٹارہ بس تھی جسے قیام پاکستان پہ وہ ساتھ نہ لے جا پایا۔ مجاہدوں نے اس لاری کا سارا سامان نکال لیا تھا۔ مالِ غنیمت تو مومن کا حق ہے، ہم اس لاری میں کھیلا کرتے اور شرط بد کے اس کی چھت سے کودا کرتے، بیرونی دنیا سے یہی لاری خط اور رسالے لایا کرتی۔ بلوچستان میں اخباروں پہ اکثر پابندی رہا کرتی اور اخبار پڑھنے والوں کی تاک میں خفیہ پولیس رہا کرتی۔ افسر تو اخباروں کو ہاتھ نہ لگاتے مبادا خفیہ پولیس رپورٹ کرے دے۔ اور ان پہ سیاست کا الزام لگ جائے تو مفت میں ہی مارے جائیں۔ روسی ادب تو شجر ممنوعہ تھا کیوں کہ اقتدار اعلیٰ آمروں نے امریکہ کے حوالے کر دیا۔ بقول میرے والد کے ریاست چار کی بجائے اب تین ٹانگوں پہ کھڑی تھی۔ ان دنوں ریاست کو بھی تین ٹانگوں والی کرسی ہی سمجھا کرتا۔ جس کا ایک پایہ امریکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا تھا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ ایوب خان نے بہت سا رقبہ بلوچستان کا شہنشاہ ایران کو بیچ کر مال بنایا۔ لیکن میرا مسئلہ تنہائی تھا۔ ایوب خان جو چاہے خریدتا بیچتا رہے بھلا مجھے کیا، خفیہ پولیس اور سی آئی ڈی والے افسروں کے پیچھے لگے رہتے کیوں کہ انہوں نے بھی نوکری بنانا تھی۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بھلا کیسے بیٹھتے۔ افسر اخباروں اور یارنیوں سے چھپ چھپا کر راتوں کو ملا کرتے تھے۔ اب تو یہ چلن کھلے عام ہے، سرِ بازار ہے۔ بابا نے میرا دل لگانے کے لیے مجھے ایک مرغی اور دو چوزے دلوا دیے۔ گھر میں بڑی رونق آ گئی۔ میں ان کے لیے بچی ہوئی روٹی توڑ توڑ کر آنام بناتا۔ چوزوں کو مرغی پروں تلے چھپا لیتی، کبھی بش خوراک ذرا نیچی پرواز پہ آتے تو مرغی کٹ کٹ کر کے ان کے سامنے آ جایا کرتی، میرا جی چاہتا کہ ایک بڑی سی مرغی ہو۔ وہ مجھے بھی اپنے پروں میں چھپا لے۔ اسی مرغی کی مانند کٹ کٹ کرتی دوڑی چلی آئے۔

بابا کو کچھ ناگوار محسوس ہوا کہ میں مرغی کے باعث تعلیم سے بیگانہ ہوا جاتا ہوں مجھے ادب لطیف تھما دیا، ان دنوں رسالہ ادب لطیف خاصہ ضخیم اور صحت مند ہوا کرتا تھا۔ اس میں کہانیاں تھیں اور شاعری بھی جو کبھی پلے نہ پڑتی۔ کبھی کبھار ادیبوں کی تصویریں بھی چھپتیں میں عینک والے کرشن چندر کو بھی پہچاننے لگا تھا۔ بچوں کے رسالے بھی مجھے ملا کرتے مگر یہ سارے رسالے ٹُٹ ٹُٹ نہ کرتے، ساتھ نہ کھیلتے۔ مجھے کتابوں سے مرغی اچھی لگنے لگی۔ میں سوچا کرتا کہ لوگ رسالے کیوں پڑھتے ہیں۔ مرغیاں کیوں نہیں رکھتے؟ حیرت ہوتی! پھر ایک روز جب کہ اتوار تھا۔ بابا نے کہا کہ ندی کے پاس خیمہ لگائے غریب گھرانے کو اپنے مرغی اور چوزے دے آؤ۔ غریب لوگ ہیں، دعائیں دیں گے، خدا تم سے خوش ہوگا۔ میں خدا اور اپنے بابا کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ملازم رحیم کے ساتھ میں مرغی اور چوزے ان جھگی والوں کو پہنچانے نکلا مگر میں بہت دکھی تھا، نراش تھا، مجھے یوں لگتا میں ان چوزوں کا بھائی ہوں۔ وہ غریب عورت تحفہ وصول کر کے مجھے دعائیں دینے لگی۔ مجھے یہ سب کچھ فضول سا لگا۔ جب اس کی دعائیں اس کے اپنے کام نہیں آتیں۔ اس برساتی ٹیلے کے کنارے کسمپرسی کے عالم میں بیمار و لاغر شوہر کے ساتھ رہتی ہے تو بھلا میرے کس کام کی؟ میں نے موٹی مرغی کو

آخری بار سینے سے لگایا اور پلٹ پڑا مگر جانے کیوں میرے آنسو امنڈ آئے۔ ’’میرے بعد اس کا خیال رکھنا میرے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔‘‘ یہ سن کر وہ عورت بھی رو دی، مجھے سینے سے لگانے کو آگے بڑھی تو رحیم نے اسے ڈپٹ دیا۔ مجھے محبت اور چاہت سے رحیم تسلیاں دیتا رہا کہ نیک بچوں کو جنت ملتی ہے۔ جو غریبوں، عورتوں کو پالتو مرغیاں بخش دیتے ہیں، کچھ بے یقینی سی بھی ہوئی کہ وہ عورت اور اس کا لاغر شوہر اپنی دعاؤں سے تو ایک کھولی بھی نہ لے پائے مجھے کیسے ایک بڑی سی جنت دلوا دے گا۔ مگر رحیم سچا انسان تھا، کچھ نہ کچھ تو رہا ہوگا۔

اب میرے لیے ایک نیا مشغلہ نکل آیا۔ میں بچی ہوئی روٹیوں سے آتام بنایا کرتا اور تھیلی میں ڈال لیا کرتا۔ ایک سہ پہر میں جب کہ بابا سرکاری کام سے زرندہ گئے ہوئے تھے، میں رحیم کو لیے مرغی سے ملنے نکلا، صنوبر کے جنگلوں میں تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہمارے لباس پھڑ پھڑا رہے تھے۔ جذبۂ شوق سے قدم تیز ہوئے جاتے تھے مگر شیلے کا کنارہ خالی پڑا تھا۔ وہ اپنا خیمہ اٹھا کر روٹی روزی کی تلاش میں بہت آگے نکل گئے تھے، چوتیر کی وادی میں یا شاید پسیرہ راغ کی جانب۔ میں حیرت و یاس کی تصویر بنا ڈبڈبائی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ رحیم نے سفید ململ والی پگڑی کے پلو سے آنسو خشک کیے ’’میں تمہاری مرغی ہوں میں تمہارے ساتھ کھیلا کروں گا۔‘‘ اس نے زمین پہ بیٹھ کر مجھے ساتھ لگا لیا۔ ’’یہاں تو سردی بھی بڑھ رہی ہے، اچھا ہوا چلے بھی گئے۔‘‘

میں نے دانت بھینچ لیے۔ منظر دھندلا دھندلا سا لگ رہا تھا، میں نے قیمص کے دامن سے آنکھیں خشک کیں اور واپس پلٹ پڑا۔ درختوں کے نیچے بڑ کے ڈھیر پہ بش خوراک چونچیں مارتے ہوئے دانہ دنکا تلاش کر رہے تھے، میں نے آگے بڑھ کر تھیلی اسی ڈھیر پر الٹ دی۔ پرندے اوپر ٹہنیوں پر جا بیٹھے اور گرسنہ نظروں سے آتام کو دیکھتے چلے گئے۔ میں سوچنے لگا کہ کاش انسانوں کی بھی چونچیں نکل آئیں۔ وہ در بدر روٹی کی تلاش میں سرگرداں رہنے، بھٹکنے، پھرنے کی بجائے ڈھیر میں ہی چونچیں مار کے روٹی تلاش کر لیا کریں۔ ان ہی درختوں کے اوپر گھونسلے بنا لیا کریں۔ دور دراز کے دیس نہ جایا کریں۔ جہاں شائد روٹی کے اونچے اونچے پہاڑ ہوا کرتے ہیں۔

اسی روز میں زیادہ اکیلا، تنہا، نزاش اور اداس ہو گیا۔ بابا زرندہ سے لوٹے تو بارش تیز ہو چکی تھی، ٹین کی چھت پہ ژالہ باری سے شور مچا تو کان پڑی آواز نہ سنائی دی۔ پھر بھی میں نے اپنی روئیداد سنا ہی ڈالی۔ میری کہانی سن کے ان کا رنگ متغیر ہو گیا مگر پھر سنبھل کے قہقہہ لگایا ’’یہ تمہارا وہم ہے کہ تم اکیلے ہو، یہ سب لوگ تمہارے دوست ہیں۔ پہاڑ، وادیاں، چرند پرند بھی کچھ تو زندہ ہے۔ بیٹا ہم Monotheist ہیں۔ ہم روح اور مادے میں فرق نہیں کیا کرتے۔ اچھا یہ لو کتابیں، دنیا کے بڑے بڑے لوگوں سے دوستی کرو، جن کی کتابیں پڑھو گے وہ تمہارے دوست ہی بن جائیں گے۔‘‘ یوں بڑے بڑے ادیب میرے دوست بنتے چلے گئے۔ پریم چند، کرشن چندر، علی عباس حسینی، قرۃ العین حیدر، ڈت بھارتی۔ مشکل الفاظ کے نیچے میں لکیر لگا لیا کرتا اور

اپنے پرائمری ٹیچر سے اگلے روز ہی ان کا مطلب دریافت کرلیا کرتا۔ رفتہ رفتہ لکیریں کم ہوتی چلی گئی۔ ہم دوبارہ سبی چلے گئے۔ بابا کی تبدیلی ہوئی تو کوئٹہ آ گئے۔ اسلامیہ ہائی سکول میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ جسٹس افتخار چوہدری میرے کلاس فیلو تھے۔ دوستوں سے بڑی گپ شپ رہا کرتی مگر کتابوں کا ایسا چسکا پڑا تھا کہ کتاب Addiction ہوگئی۔ حتیٰ کہ میں پسندیدہ کتابیں چرانے میں بھی ماہر ہوگیا۔ دن بہت طویل اور وقت بابرکت Blessed ہوا کرتا تھا۔ صبح، طویل دن، سہ پہر اس کے پیچھے چلی آتی پھر ایک شام پھیل جاتی جس کے بعد رات چلی آتی دبے پاؤں۔ میرے پاس بہت سے ادب لطیف جمع ہوتے چلے گئے۔ پھر مختلف شہروں میں ملازمت کے سبب سکونت اختیار کرتے بابا آخر ہی کوئٹہ چلے آئے۔ پھر یوں ہوا کہ وقت کی برکت ختم ہوگئی۔ یا وقت کی رفتار بہت تیز ہوگئی، زندگی بدل گئی۔ مجھے علم تھا کہ سبھی کو مرنا ہے، خود مجھے بھی مگر جانے کیوں کبھی بھی گماں نہ ہوا کہ میرے بابا بھی مر سکتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے اور جب میں نے بابا کو بے جان دیکھا تو میں چیخ اٹھا کیوں کہ مجھے دلیری پہ اکسانے والا بہادری کی ترغیب دلانے والا ہی اٹھ چکا تھا۔ اب مجھے بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ مرد انسان ہوا کرتے ہیں، پتھر نہیں بل کہ انسان پتھر کیسے بن سکتا ہے Eddekrysen پھر کیا ہے؟ یوحنا نے کہا یسوع رو دیے؟ میں بھی چیخ چیخ کر روتا ہی چلا گیا مگر بابا زندہ نہ ہوئے بل کہ ہلکی سی جنبش بھی نہ کی۔۔۔۔ صرف پتھر کے دیوتا ہی احساس سے مبرا ہوتے ہیں اور پھر وقت کی برکت بالکل اٹھ گئی۔ کشش ثقل نے وقت پہ گرفت ختم کردی یا وقت تیز ہوگیا۔ جیسے سیوی کے بعد ری گڑی سرپٹ دوڑنے لگتی ہے۔ میرے ملازم نے ایک روز میری کتابیں، پرانے رسالے دھوپ لگانے کے لیے چھت پر رکھ دیے، میں بھی سرکاری دورے پر نکل گیا گھر میں میری بیوی بچوں کو بھی یاد نہ رہا۔ رات میں زور کا مینہ برسا تو رسالے کتابیں بھیگ کر فوت ہوگئیں۔ مجھے سب سے زیادہ دکھ ادب لطیف کا ہوا کیوں کہ وہ محض رسالے ہی نہیں تھے ان میں میرا بچپن لپٹا ہوا تھا۔ میرا ماضی بند تھا، میرا Nostaligia تھا، میرا دوست میری دانے چگتی گمشدہ مرغی تھی۔ میں نے ملازم کو فارغ کر دیا کیوں کہ وہ میری محبت کا قاتل تھا۔ حالاں کہ یہ قتل اتفاقیہ تھا مگر میرا بس چلتا تو اس کا سر ہی قلم کر دیتا۔ بابا کے بے جان جسم کے بعد اب میں بے جان، ساکت و جامد رسالے دیکھ رہا تھا پھر میں گریڈوں کی دوڑ میں دوڑنے لگا۔ وقت نے مجھے بے ضمیر، مصلحت پسند، خوشامدی، دروغ گو، منافق اور لالچی بنا دیا۔ میرا وہی ملازم میری کتابوں اور رسالوں کا سفاک قاتل مجھے شہر کی سڑکوں پہ خاک چھانتا دکھائی دیتا، کبھی فٹ پاتوں پہ بیٹھا، کبھی محنت مزدوری کرتا۔ جانے کتنے زمانے گزرے وہ مجھے ملنے چلا آیا۔ میں بھی اتفاقاً لان میں اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ اس کی جوانی غربت چاٹ گئی تھی۔ گال اندر کو دھنسے ہوئے آنکھیں بے نوری پھیلی پھیلی۔ اس نے ادب سے سلام کیا اور ایک نیا رسالہ پیش کیا۔ میں نے بے دلی سے اچٹتی ہوئی نظر ڈالی کیوں کہ اب میرے لیے روپیہ اور افسر اہم تھے۔ ادیب تو ہومر سے لے کر آج تک بھوکوں ہی مرتے چلے آئے ہیں مگر رسالہ دیکھ کر میرا بچپن جاگ اٹھا۔ زیارت کی وادیاں، خلیفت،

بابا خرواری، چو تیر! میں اچھل پڑا۔ میرے ہاتھ میں صدیوں بعد ادب لطیف تھا مگر اس کی جسامت کم ہوئی تھی قد بھی اور ضخامت بھی۔ یہ اس کا بچہ لگتا تھا مگر زیارت کے جنگلات بھی تو لوگ کھا گئے۔ کیا عجب رسالہ بھی قحط سالی، خشک سالی سے گزرا ہو۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی میں بے تابی سے ورق الٹنے لگا۔ سابقہ ملازم نے فریاد کے لیے زبان کھولی "ہمارے ہاں تو بارشیں سالوں نہیں ہوتی، مجھے کیا علم تھا کہ بارش رات میں ہو جائے گی، میری ماں بیمار تھی میں اسے دیکھنے چلا گیا" اس نے میلے کرتے سے آنکھوں میں امنڈتے آنسو روکے۔ مجھے ایک دھچکہ سا لگا۔ ماں، میری مرغی میرے چوزے، مجھے یوں لگا کہ خیمہ اکھڑ چکا ہے، عورت میری مرغی اور چوزوں سمیت روٹی کی تلاش میں انجان وادیوں میں نکل چکی ہے میں اپنے آپ میں کھو چکا تھا میں واپس لوٹا تو احساس ہوا کہ ملازم سلام کر کے باہر جا رہا ہے ان دیکھا جنازہ کندھوں پر اٹھائے جھکا جھکا سا قابل رحم اور بالکل اکیلا، اس سے پہلے کہ وہ گیٹ سے باہر نکلتا میں نے اسے آواز دی:

"بات سنو" وہ ہچکچاتا ہوا واپس پلٹا اور چوروں کے قدم چلتا میرے پاس چلا آیا "کل سے کام پہ آجانا"۔

☆ ☆ ☆ ☆

☆ آنام: ۔روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، بھورے
☆ بش خوراک: ۔گوشت خور پرندہ Magpie۔ شلوک
☆ شلیے: ۔آب جو ۔پانی کی گزرگاہیں
☆ بڑ: ۔صنوبر کے خشک پتوں کا ڈھیر
☆ زرندہ: ۔پن چکی ۔زیارت کا قصبہ
☆ Edekrysen: ۔یسوع مسیح کے آنسوؤں کے لیے یونانی لفظ

حنیف باوا

قِصہ اس بہری، یخ بستہ رات کا

اس رات چاروں اور سناٹا تھا۔ سردی بھی زوروں پر تھی۔ گلی کے سناٹے اور برف جیسی یخ بستگی نے مل کر ماحول کو خوف زدہ کر رکھا تھا۔ جب بھی سناٹے اور کپکپا دینے والی سردی کے بیچ کہیں سے کسی کتے کے رونے کی آواز آتی تو گلی میں پھرتے خوف میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ گلی کے آخری سرے پر جو مکان تھا وہاں سے آگے گھنی آبادی کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ وہاں سے اِکا دُکا مکانوں کی بے ترتیبی شروع ہو جاتی۔ یہ مکان ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ ان کے درمیان فاصلوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کے قریب آنے سے ڈر رہے ہوں اور ایک دوسرے سے دور رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہوں۔ یہ ٹھری ہوئی رات اس کی سنگینی میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ گلی کی آخری نکڑ والا مکان بھی اس رات کے سناٹے کی زد میں تھا۔ اس کے اندر بھی سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ یہ وسیع حویلی کی شکل کا مکان تھا۔ اس کے اندر اور باہر کی تمام روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ لیکن مکان کے آخری کمرے میں ایک بڑا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی آنکھوں کو چندھیا رہی تھی لیکن جب یہ روشنی کیواڑوں کی درزوں سے باہر آنے کی کوشش کرتی تو اس میں وہ کامیاب دکھائی نہ دیتی، اگر روشنی کی چند شعائیں باہر آنے میں کامیاب ہو بھی جاتیں تو بہت جلد باہر کا اندھیرا ان کا گلہ دبا دیتا اور اندھوں کی طرح تامک ٹوئیاں مارنے کے سوا انہیں کوئی چارا نہ رہتا۔

کمرے کے اندر سے دو گھٹی گھٹی سی آوازیں کبھی مبہم اور کبھی کسی قدر واضح سنائی دے رہی تھیں۔ یہ دونوں آوازیں ایک دوسرے کی ضد تھیں، اگر ایک چوڑیوں کی کھنک کی طرح دل کو لبھانے والی اور جذبات سے لبریز تھی تو دوسری آواز میں بھاری پن تھا۔ ایسا بھاری پن جو اپنے اندر سے شباب کو پوری طرح عیاں کر رہا تھا۔ یہ دونوں آوازیں مل کر جب پچ بٹنوں کی جوڑی کی طرح ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتیں تو کمرے کے اندر کا ماحول سحر زدہ سا ہو جاتا۔ جب دونوں آوازوں میں گھن گرج پیدا ہو جاتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ آوازیں جوبن چھلکتے جسموں کے ہونٹوں سے چھن کر آ رہی ہوں۔

یہ دونوں آوازیں دو ننگے جسموں سے ابل کر باہر آ رہی تھیں۔ جب ان دونوں برہنہ جسموں کے مابین ہونے والی گھمسان کی جنگ کا اختتام ہوا اور کمرے کے اندر کی فضا میں برف گھلنے لگی تو اس مکان کے بیرونی دروازے پر پہلے ہلکی اور پھر قدرے زور سے کھٹ کھٹ ہونے لگی۔ جب چار پانچ بار کی دروازے کی کھٹ کھٹ اس کمرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو اس کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھلا پھر ایک نوجوان

یہ کہتے ہوئے باہر نکلا۔

”یہ کون کم بخت ہے جس نے ہمیں بے وقت ڈسٹرب کیا۔“ اس کے چہرے پر شدید غصے کی لہر ابھر آئی۔

جب وہ بیرونی دروازے کی جانب بڑھنے لگا تو اچانک اسے خیال آیا کہ وہ تو الف ننگا ہے۔ وہ دوبارہ اندر گیا اور برہنگی کو ڈھانپ کر فوراً صحن سے ہوتا ہوا بیرونی دروازے پر پہنچ کر پوچھنے لگا۔

”کون ہے بھئی اس وقت“

باہر سے جب اس کی بات کا جواب آنے کے بجائے دروازے پر پھر دستک ہوئی تو اس نے مزید کوئی بات پوچھے بنا دروازے کو آہستگی سے کھولا اور دیکھا کہ باہر ایک نوجوان دوشیزہ نیم برہنہ حالت میں کھڑی ہے۔ جب اس نے اس نوجوان لڑکی کو ذرا غور سے دیکھا تو حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جھٹ برہمی سے بولا ”رفی تو ---اس حال میں ---کہاں سے آئی ہے تو۔“

رفی کچھ نہ بولی اور کانپتے ہونٹوں سے جوں کی توں سکڑی سمٹی کھڑی رہی۔

”میں پوچھتا ہوں یہ تو آدھی رات کے وقت کہاں سے آئی ہے---بولتی کیوں نہیں---بتا کہاں سے آئی ہے؟“

”بھائی مجھ سے بھول ہو گئی ہے۔ میں بھٹک گئی تھی۔“ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ ”وہ---وہ“ اس کے منہ سے ”وہ“ کے سوا اور کوئی لفظ نہ نکلا۔ اس کے ہونٹ تو جیسے سِل سے گئے تھے۔

جب وہ لڑکی مزید کوئی بات نہ کہہ سکی تو اس کے دماغ میں خود بہ خود یہ سوچ ابھرنے لگی---”ہو سکتا ہے وہ گھر بھی ہمارے گھر جیسا ہی وسیع ہو اور اس کے لمبے چوڑے دالان سے گزر کر اس کے آخری کمرے تک جایا جاتا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہاں بھی ایک ڈرا دینے والا سناٹا ہو جس نے ہماری طرح اس کے تمام ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس گھر کی تمام بتیاں بجھی ہوئی ہوں اور صرف میری طرح کا اس کا آخری کمرہ ایک بڑے بلب سے جگمگا رہا ہو اور اس کمرے کے اندر صرف ایک پلنگ بچھا ہوا ہو اور اس پلنگ پر میرے جیسا ہی کوئی نوجوان---!“

جب اس کی سوچ یہاں پہنچ کر آگے بڑھنے کو تھی تو اس کی آنکھیں خود بہ خود بند ہو گئیں اور اس کے دونوں ہاتھوں نے اٹھ کر کانوں کو ایسے بھینچ لیا جیسے وہ اس سے آگے نہ تو کچھ دیکھنا چاہ رہا تھا اور نہ ہی مزید کچھ سننا۔ جب وہ سوچ زبردستی آگے بڑھنے کی کوشش میں تھی تو اس کے منہ سے ایک چیخ ابھری جو لفظوں میں ڈھل کر دالان کی فضا کو سوگوار کرتے ہوئے بکھر گئی وہ لفظ تھے۔

”نہیں---نہیں---نہیں میں اس سے آگے نہ کچھ دیکھنا چاہ رہا ہوں اور نہ ہی مزید کچھ سننا---پھر یہ سوچ کیوں زبردستی میرے اندر گھسنے کی کوشش کر رہی ہے---آخر کیوں---؟“

آخر وہ اپنے اندر کی سنگینی کو دور کرنے کے لیے بہن سے پھر سختی سے بولا۔

”جس گھر کی عزت کو تو نے مٹی میں ملایا۔ پھر اس گھر کے دروازے کو کھٹکھٹا رہی ہو“۔ ”جا میں تجھے۔۔۔“ اتنا کہہ کر نوجوان نے دروازہ بند کر دیا۔ ایسا کرنے سے وہ سمجھنے لگا تھا کہ شاید اس کے سر سے تمام بوجھ اتر گیا تھا اور بہن کی طرف سے کوئی بھی قرض باقی نہیں رہا تھا۔

”بھائی مجھے معاف کر دے۔ آئندہ اگر مجھ سے پھر ایسی کوئی بھول ہوئی تو مجھے جان سے مار دینا۔ بس ایک بار مجھے اندر آنے دے۔ بس ایک بار پھر کبھی باہر نہیں نکلوں گی۔ کبھی بھی نہیں۔“

اس اندھی اور بہری رات کا سناٹا جب بہن بھائی کے مابین ہونے والے مکالموں کو لے کر پڑوس کے ایک مکان کے دروازے پر پہنچا تو آنِ واحد میں وہ دروازہ کھل کر مکالمے ادا کرنے والوں کی طرف جھانکنے لگا تو نوجوان کے سر پر بہن کا بوجھ پھر سے آن پڑا تو اس نے فوراً کواڑوں کو کھول کر نیم برہنہ بہن کو اندر کھینچ لینے کے بعد کھٹ سے انہیں بند کر دیا۔

اندر آنے کے بعد بہن بھائی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”بھائی مجھے معاف کر دے۔۔ پھر کبھی بھی۔۔۔“

بھائی نے بہن کی بات کو پورا نہیں ہونے دیا۔ درمیان میں ٹوک کر تلملاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”چپ ہو جا۔۔۔ اب زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں“۔ پھر جب وہ اپنے گھناؤنے کردار کے بارے میں سوچنے لگا تو فوراً اس کی تمام تلملاہٹ ختم ہو گئی اور بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر جب وہ اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو وہاں سے ایک نسوانی آواز ایک بھاری پتھر کی طرح اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”سلیم! بتا یہ کون ہے جس سے تم باتیں کر رہے ہو۔“

”کوئی نہیں۔“ سلیم نے مختصر سا جواب دیا۔

”پھر بھی بتا تو سہی کون ہے؟“

سلیم تھوڑے سے توقف کے بعد بولا۔ ”میں نے کہا نہ کوئی نہیں۔ بس اب کچھ مت پوچھنا۔۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ“ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ پایا۔ بس حیرت میں ڈوب کر وہیں رک گیا۔ اب وہ سوچوں کے بھنور میں کچھ ایسا الجھا کہ اسے اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ سجھائی نہ دیتا۔ آخر جب اس کی سوچ اس کمرے میں لیٹی برہنہ خاتون اور اپنی بہن کے نیم برہنہ بدن کی طرف بڑھی تو اسے ایسے لگا جیسے ان دونوں میں کوئی فرق نہ ہو۔ اس کے آگے بھی اس کی سوچ نے اور بہت سی کروٹیں بدلنے کی کوشش کی لیکن وہ سوچ ان دونوں جسموں کی مشابہت سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اب اس نے اپنی بہن کو بیرونی دروازے کی اندرونی دہلیز پر چھوڑا اور خود اس روشن کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اندر جا کر سب سے پہلے اس نے بلب بند کر کے اس کمرے کو روشنی سے دور کیا اور پھر اس نے اس خاتون کے برہنہ جسم کو اسی کی چادر سے ڈھانپا جس کو اس نے خود اس رات کے پہلے پہر میں برہنہ کیا تھا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ چیخ پڑا۔ ''صفوں مجھے معاف کر دے۔۔۔ میں بھٹک گیا تھا۔ آئندہ ہم کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔۔۔ کبھی نہیں۔ اب تک آپ کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں'' ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس اندھیرے کمرے سے ایک زوردار تھپڑ کی آواز گونجی جس نے اس کے مضبوط بدن کے اندر سے ابلتے ہوئے غصے کی لہر میں بہتے ہوئے مخفی احساسات کو بالکل عیاں کر دیا تھا۔ وہ خاتون اس اندھے کمرے سے باہر نکلی اور خود کو اسی چادر میں سمیٹتی ہوئی بیرونی دروازے کی جانب بھاگ کھڑی ہوئی اور سلیم اسے پٹی پٹی نظروں سے دیکھتا رہا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر جب اس نے اپنے جیسی ہی ایک خاتون کو وہاں کھڑے ہوئے پایا تو وہ حیرت میں ڈوب گئی۔ اس خاتون کے بارے میں اس کے دماغ میں کئی خیالات آئے اور معدوم ہو گئے آخر وہ سوچنے لگی۔ یہ سلیم کی کون ہو سکتی ہے۔ اس کا اس سے کیا رشتہ ہو سکتا ہے۔ یہ یہاں سکڑ کر کیوں کھڑی ہے۔ تھوڑی دیر کی سوچوں کے بعد اچانک اس کے منہ سے نکلا ''کہیں یہ اس کی بہن تو نہیں جو میری طرح پوری داغ دار ہو کر۔۔۔'' اتنا کہتے ہوئے وہ دروازہ کھول کر اس اندھی اور سرد رات کے خوفناک سناٹے میں گم ہو گئی۔ کیا یہ خوفناک سناٹا اسے اپنے گھر تک پہنچنے دے گا یا نہیں۔ یہ تو اس کے لغزیدہ قدم ہی بتا پائیں گے جو اس گہری رات کے پہلے پہر کو اس گھر کی چوکھٹ کو عبور کرتے وقت ذرہ بھی نہیں ڈگمگائے تھے۔

☆☆☆☆

محمود عالی

ماکھا حوالدار

ماکھے کے لرزتے بوڑھے ہاتھوں میں جکڑے چھ گولیوں والے پستول کے سامنے کڑیل اور مضبوط منگتا مسلی بے بس اور ساکت کھڑا تھا۔ سرما کی بھیگی رات میں دونوں پسینے سے تر ہو رہے تھے۔ ماکھا حوالدار، دن بھر کی اعصاب شکن سوچوں سے ہلکان ابھی اونگھنے ہی لگا تھا کہ پولیس کی گاڑیوں کے ہوٹروں، سپاہیوں کی سیٹیوں، ہوائی فائرنگ کی گونج اور گھبرائے کتوں کی بھونکوں نے اسے اور گہری نیند میں ڈوبی پوری کچی آبادی کو جھنجوڑ دیا تھا بستی کے بدحواس ادھ جاگے مکین اپنی چھتوں یا دیواروں سے جھانکنے لگے تھے لیکن اپنے کچے صحن میں ویان بیٹھا ماکھا فوراً سمجھ گیا تھا کہ پولیس یقیناً حاجی جیرے ہیروئن فروش کے کسی کارندے کو منتھلی نہ پہنچانے پر سبق سکھانے آئی ہوگی یا پھر بستی کے باہر لگے پولیس ناکے پر کسی مشکوک کی فائرنگ پر کی جانے والی جوابی کارروائی ہوگی یا پھر انعامی مطلوب اشتہاری اور مفرور اجرتی قاتل منگتے مسلی کی موجودگی کی بھنک پا کر ہونے والی مخبری پر اس کی داشتہ گلابو کنجری کے اڈے پر چھاپہ پڑا ہوگا۔ وہ کمبل لپیٹ کر ابھی قیافے لڑا ہی رہا تھا کہ واقعی منگتا اس کے گھر کی اونچی کچی دیوار پھاند کر اس کے صحن میں دھم سے اس کے سامنے تھا لمحہ بھر میں ماکھے نے جھٹ اپنے تہ بند کے ڈب سے پستول نکال کر منگتے پر تان لیا تھا جو کہ نہتا تھا ورنہ شاید وہ ماکھے کو یہ موقع نہ دیتا۔ بہ فیلے آوارہ بادلوں کے ٹکڑوں سے کھیلتی چاندنی میں وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے ذرا سی حرکت پر بھی چونکتے ہوئے باہر سے آنے والی آہٹیں سن رہے تھے ماکھا تھکان اور جوش سے لرز رہا تھا اس کے بوڑھے اعصاب شل اور بے جان ہونے لگے تھے۔ پستول پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی تو وہ چونک کر خود کو پھر سے سنبھال لیتا تھا اس کی ایک وجہ سامنے کھڑے ماہر اجرتی قاتل منگتے کی دہشت تھی۔ دوسرے آج صبح سے وہ اذیت ناک سوچوں سے ادھ موا ہو چکا تھا۔ یہ سوچیں اسے صبح سویرے آئی جی صاحب کے تھانے پر اچانک چھاپے میں ہونے والی ملاقات سے عطا ہوئی تھیں، پولیس کی چوالیس سالہ ایمان دارانہ ملازمت کے صلے میں ملنے والی آج کی رسوائی اور بے عزتی پر زخمی ہو کر وہ صبح سے کئی بار پھوٹ پھوٹ کر رو بھی چکا تھا۔ وہ تو ایک عرصے سے حسرت لیے پھر رہا تھا کہ کبھی تو آئی جی صاحب سے سامنا ہوگا اور وہ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر، پاؤں پڑ کر اپنے بیٹے عنایت علی کو پولیس میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر بھرتی کر لینے کی التجا کرے گا اور آج اسی التجا کے جواب میں آئی جی صاحب نے اسے بری طرح ڈانٹتے ہوئے بڑی تمکنت سے فرمایا تھا "کس حدیث میں ہے کہ حوالدار کا بیٹا ضرور افسر بھرتی ہو اسے کوئی چھوٹا موٹا کام سکھاؤ یا پولیس سروس کا ہی شوق ہے تو گریڈ ون

میں دھوبی، لانگری، مالی یا کلینر رکھوا دو، بچہ چار جماعتیں پڑھ ہی گیا تو کیا اونچے خواب دیکھنے بھی ضروری ہیں اوپر سے بھرتی بھی بند ہے''۔ آئی جی صاحب کے سامنے گڑگڑانے اور ان کے بوٹ چھونے کی پاداش میں ایس ایچ او نے ڈپٹی صاحبان کے چہروں پر ناراضگی بھانپتے ہوئے ماکھے کو اس کے مکمل شجرے سمیت مغلظات میں تول ڈالا تھا اور ساتھ ہی معطل کر کے گھر بھی بھجوا دیا تھا اس طرح وہ زندگی بھر کی سب سے بڑی ذلت سے بوجھل گھر لوٹا تھا اس کی بیوی نذیراں اپنے بیٹے عنایت علی کے ہمراہ اپنی دونوں بیٹیوں سے ملنے کے لیے شہر سے باہر گئی تھی۔ ماکھے کے لیے افسروں کی سرد مہری، ڈانٹ اور معطلی اس لیے بھی اذیت ناک تھی کہ صرف پانچ دن بعد وہ پولیس کی چوالیس سالہ خدمات سے ریٹائرڈ ہو رہا تھا۔

ماکھے کا بیٹا عنایت علی چار سال سے ایف اے کی سند لیے آوارہ پھر رہا تھا، اس دوران اس نے بڑے پاپڑ بیلے تھے کہ کسی طرح عنایت علی اے ایس آئی بھرتی ہو جائے، وہ ڈی ایس پی سے اوپر کے عہدے والے افسر سے موقع پاتے ہی ضرور درخواست کر دیتا تھا اور جواب میں عموماً جھوٹی تسلی پا کر مایوس اور شرمندہ سا رہ جاتا تھا، بعض اہلکار اور افسر نوکریوں پر حکومتی پابندی کا بہانہ بھی کر دیتے تھے، اگرچہ ملازمتوں پر واقعی سرکاری پابندی تھی مگر ماکھے کے سامنے وزیروں، سیاستدانوں، اعلیٰ درجے کے بیوروکریٹس اور صحافیوں کے رشتہ دار، سفارشی اور پسندیدہ نوجوان دھڑا دھڑ چور دروازوں سے بھرتی ہو کر بلکہ ٹریننگ مکمل کر کے مختلف تھانوں، چوکیوں اور پولیس کے دفاتر میں تعینات ہوتے رہتے تھے۔ ماکھے کا جنون دیکھ کر ایک سیاسی ٹاؤٹ نے دو لاکھ روپے کے عوض اس کا یہ کام کرنے کی پیشکش کی تھی مگر ماکھے نے انکار کر دیا تھا کیوں کہ پہلی وجہ تو یہ تھی ماکھا اتنے پیسوں کے انتظام کا سوچ بھی نہ سکتا تھا، دوسرے اس نے پولیس کی ملازمت آدھی پیغمبری سمجھ کر کی تھی اسے پولیس کی وردی میں دکھی اور دربدر رلتی انسانیت کی خدمت کی روشنی دکھائی دیتی تھی تبھی اپنی پوری سروس میں وہ جس دفتر، تھانے، چوکی یا لائن میں بھی تعینات ہوا تھا، بے سہارا، بے بس اور آنسو پیتے بہت سے لوگوں کی مدد اور کام فی سبیل اللہ کروا دیتا تھا ان میں سے اکثر سائلین کو تو وہ جانتا تک نہ تھا جب کہ اس کے ساتھ کئی ساتھی بڑی بڑی جائیدادوں، ویگنوں، بسوں، کاروباروں، عہدوں اور مافیوں کے مالک بن گئے تھے مگر ماکھا ساٹھ سالہ زندگی میں پولیس کے واشر مین سے حوالدار ہی بن سکا تھا، ماکھے کی پیدائش کے بعد پولیس لائنز میں تعینات اس کے باپ ابری دھوبی کے دل میں بھی افسروں کی وردیوں کا کلف لگا کر کڑکڑا بناتے بناتے ایسی ہی امنگ جاگی تھی کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے مبارک علی عرف ماکھے کو بھی پڑھا لکھا کر ڈپٹی لگوائے گا کیوں کہ اسے ڈپٹی کی وردی میں خدا کا نائب دکھائی دیتا تھا جو مجبوروں اور مقہوروں کی دادرسی اور انصاف کر سکتا تھا۔ لیکن بیٹا ابھی میٹرک تک نہ پہنچا تھا کہ باپ ایک دن لوہے کی تار پر گیلی وردیاں پھیلاتے ہوئے کرنٹ لگنے سے مر گیا تو پولیس لائن کے انچارج ڈپٹی نے ترس کھا کر ماکھے کو اس کے باپ کی جگہ واشر مین رکھوا دیا تھا اب وہ سارا دن وردیاں، بستروں کی چادریں، تولیے اور دریاں کھیس دھوتا، وردیوں پر کلف لگاتا، استری پھیرتا،

یوں وہ بہشتی باپ کی خواہش پر مبارک علی ڈی ایس پی بننے کی بجائے ماکھا دھوبی بن کر رہ گیا تھا۔ پولیس رولز کے تحت پولیس لائنوں کے تمام نائی، درزی، مالی، موچی، لانگری، باورچی اور دھوبی وغیرہ پولیس یونیفارم کی صرف قمیض پہن سکتے تھے لہٰذا جلد ہی ماکھا پولیس کی مکمل وردی پتلون، قمیض اور بھاری بوٹوں کے بغیر خود کو ادھورا سا محسوس کرنے لگا تھا اور سمارٹ وردی میں بن ٹھن کر ڈیوٹی کے لیے جانے والے افسروں اور جوانوں کو رشک سے دیکھتا تھا، ایک دن خوش قسمتی سے اپنے ایک ڈپٹی صاحب کی بیوی کی زچگی کے دوران خون کی دو بوتلیں عطیہ کرنے سے ماکھے کا پوری وردی پہننے کا خواب بھی حقیقت بن گیا تھا اور اب وہ باوردی پولیس کانسٹیبل تھا۔ دو بچیوں کے بعد اس کے ہاں جب عنایت علی پیدا ہوا تو اس کی خاندانی خواہش زور پکڑ گئی کہ بیٹے کو ڈپٹی بنائے گا۔ اس نے اپنے بیٹے عنایت علی کو دورانِ تعلیم ہی اپنے تجربے، مشاہدے اور سمجھ کے مطابق پولیس رولز میں رائج تمام اصول وضوابط، رینکس، پریڈز اور گارڈ آف آنرز کے ڈسپلن، پروٹوکول کے طریقے، محرری کے داؤ پیچ، درخواست وصول کرنے اسے جانچنے، سائل کی نیت بھانپنے، پرچہ کاٹنے، رپٹ درج کرنے اور اس میں مختلف دفعات سمونے، مثل مکمل کرنے ضمنی بھرنے، وقوعہ اور شہادتیں جانچنے، مشکوک ومشتبہ افراد پر نظر رکھنے، مچلکہ پُر کرنے، ریکارڈ اور اعمالنامہ درست رکھنے، رخصت لینے یا ڈیوٹی کی خاطر روانگی یا آمد ڈالنے بہادریاں جمع کرنے، بہادر پولیس ملازموں اور افسروں کے واقعات کے حوالے، مختلف درجوں کی عدالتوں میں شہادتیں، مثلیں یا ملزمان پیش کرنے کے آداب، پولیس مقابلوں، چھاپوں، مخبروں بستہ الف اور بے کے نامور بدمعاشوں، رسہ گیروں، رنگ بازوں، اشتہاریوں اور قاتلوں کے مختلف قصے سنانے کے ساتھ ساتھ کئی موٹی موٹی دیوانی اور فوجداری دفعات بھی حفظ کرا دی تھیں۔ اتنی تربیت کرا دینے کے بعد ماکھے کی تمنا تھی کہ اسے اے ایس آئی کی وردی جیسے تیسے مل جائے اور وہ عنایت علی کو پہنا دے اور اسے سیلوٹ مارے مگر یہ تمنا حسرت بنتی جا رہی تھی اس کی اپنی تعلیم اتنی تھوڑی تھی کہ وہ اے ایس آئی نہیں بن سکتا تھا وہ تو اس کے بخت ہرے تھے کہ چند برس پہلے ایک چھاپہ میں اس نے منگتے مسلی کو جان خطرے میں ڈال کر قابو کیا تھا تو ایس ایس پی صاحب نے اس بہادری کے صلے میں اسے حوالدار بنا دیا تھا اب پھر وہی مفرور منگتا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی توجہ منگتے پر اور قوت پستول پر تھی وہ پولیس پارٹی کے گھر گھر تلاشی لیتے ہوئے یہاں تک پہنچنے تک منگتے کو اس طرح روکے رکھنا چاہتا تھا۔ پولیس اہلکار وقفے وقفے سے میگافون پر منگتے کو متنبہ کر رہے تھے کہ وہ ہتھیار ڈال کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے۔ منگتے نے کافی سوچ بچار کے بعد ماکھے کی خوشامد کی "حوالدار! تو بڑا بہادر ہے اتنی عمر کا ہونے کے باوجود بڑا چوکس کھڑا ہے۔ میری منت ہے تجھ سے، مجھے جانے دے، نکلنے دے تجھے مالا مال کر دوں گا"۔ ماکھا جوش سے گھٹتی آواز میں بولا۔ "اوئے مسلی! پاگل تیرے سامنے حوالدار مبارک علی شاہ کھڑا ہے جو زندگی بھر نہیں بکا تو کیا خریدے گا"۔ منگتا طنزاً ہنسا "ماکھے دھوبی! پہلے بھی تو نے مجھے پکڑ کر حوالداری کی فیتیاں لگوائی تھیں اب کے مجھے چھوڑ کر زندگی بنا لے سونے میں تول دوں گا تجھے۔"

ماکھے نے دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا پستول ہوا میں جھٹکا اور دانت پیستے ہوئے بولا‘‘ بکواس بند کر مسلی! پچاس ہزار روپے تو تیری گرفتاری پر کل صبح ہی مجھے انعام میں مل جائیں گے تو اپنی فکر کر قصائی۔’’ منگتا بڑے اعتماد سے ہنستا ہوا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ’’واہ ماکھے رہا تو بے وقوف کا بے وقوف، تجھے کون انعام دے گا وہ تو سالے ایس پی اور ڈپٹی لے جائیں گے تیرا نام تک نہیں آئے گا۔ یہ سارا گھیرا انعام اور ترقیوں کے چکر میں ڈالا گیا ہے تو نے مجھے جانے نہ دیا تو بھی تیری لاش بچا کر نکل جاؤں گا تو میری پھرتیوں سے واقف ہے نا؟’’ منگتا تیز نظروں سے اِدھر اُدھر جائزہ لینے لگا تو ماکھا دھمکی آمیز لہجے میں بولا‘‘ دیکھ مسلی! کوئی چالتر نہ کھیلنا ورنہ گولی مغز کے پار ہوگی۔’’ منگتا بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ’’ماکھے تجھے حوالدار نواب دین کا حشر یاد ہے اس نے مجھے یوں ہی روکا تھا جیسے تو ضد کر رہا تھا، یاد ہے نا وہ کچہری؟ وہ بخشی خانہ؟’’ ماکھا اور چوکنا ہو گیا اسے منگتے کی حاضر دماغی، چالبازی اور بجلی سی پھرتی کا علم تھا اور اس کی سب وارداتیں بھی یاد تھیں۔ واقعی اس کا چوتھا قتل حوالدار نواب دین شہید کا تھا جو منگتے کو ہتھکڑی ڈالے بخشی خانے سے پولیس وین میں بٹھانے کے لیے لا رہا تھا کہ منگتا خنجر اس کے دل کے پار کر کے ہتھکڑی سمیت آٹھ پولیس والوں کی موجودگی میں فرار ہو گیا تھا اسی لمحے ماکھے کو نواب دین شہید کی اس جانثاری اور بہادری پر ملنے والا انعام یاد آ گیا تھا مگر ساتھ ہی دروازے پر پولیس کی دھڑ دھڑ نے دونوں کو چونکا دیا تھا، ماکھے نے بجلی کی تیزی سے پستول اور دوسرے میں منگتے کا بازو پکڑا اور اسے کمرے میں دھکیل کر سرگوشی کی۔ ’’اندر چھپ جا میں تجھے بچا لوں گا۔’’ منگتا حیرت و خوف سے چابی والے کھلونے کی طرح چلتا ہوا پلنگ کے نیچے گھس گیا، اسے کمرے میں بند کر کے ماکھے نے پستول اپنے تہ بند کے ڈب میں اڑائی اور حقہ اٹھا کر گڑگڑاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف آ گیا اور کنڈی کھول دی۔ ایک اے ایس آئی ریوالور تانے دو بندوقچیوں سمیت اندر گھس آیا اور چاروں طرف تیزی سے گھورتے ہوئے بولا۔ ’’اوئے ماکھے یہ تیرا گھر اے؟ ایدر کوئی آیا تو نہیں؟’’ ماکھا ہنسنے لگا‘‘ ملک صاحب! کمال ہے ادھر کوئی آتا تو کب کا ڈھیر ہو چکا ہوتا میں تو آپ کی پہلی سیٹی پر ہی الرٹ ہو گیا تھا’’ اس نے ڈب سے پستول نکال کر دکھایا تو اے ایس آئی سپاہیوں سمیت الرٹ رہنا کہہ کر باہر نکل گیا۔ ماکھے نے‘‘ بے فکر ہو سر جی’’ کہہ کر کنڈی دوبار چڑھا دی اور اگلے دروازے پر پولیس کی دستک سن کر تسلی کر کے کمرے میں آ گیا، حوالدار نواب دین کی شہادت اس کے ذہن میں آتش بازی کی طرح روشن ہو رہی تھی، آئی جی صاحب نے نواب دین کے لواحقین کو تین لاکھ روپیہ، بیوہ کو تاحیات پنشن دینے کے علاوہ اس کے بڑے بیٹے علم دین کو پولیس میں اے ایس آئی کے عہدہ پر بھرتی کرنے کے احکامات بھی جاری کر دیے تھے۔ ماکھے کا چہرہ دہکنے لگا تھا۔ اس نے بلی کی طرح دُبکے منگتے کو پلنگ کے نیچے سے باہر نکالا اور پھر پستول تان کر آہستہ سے بولا،‘‘ دیکھ منگتے میں اپنی چونتالی سالوں کی نوکری میں پہلی بار بے ایمانی کرنے لگا ہوں اگر تو قسم اور نیاں دے کر میرا اِک کام کر دے تو’’ منگتا حیران اور ساکت تھا،‘‘ کون سا کم؟’’

’’پہلے مردوں والا وعدہ کر کہ تو ضرور کرے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے اگر مجھے رہا کرے گا تو جان پر کھیل کر تیرا کم ضرور کروں گا، تیری جان کی قسم۔‘‘ منگتا ایک دم شانت ہو کر بولا۔

’’یار منگتے! مکر نہ جاویں ضرور کر دے ویں‘‘ ماکھا مچل کر بے یقینی سے بولا، منگتا پُرامید ہو کر حوصلے سے بولا ’’حوالدار! آرڈر کر حکم لا بادشاہ!‘‘ ماکھے نے کانپتے ہوئے اسے اپنا پستول پکڑاتے ہوئے کہا ’’لے پھر پکڑ مجھے شوٹ کر کے بھاگ جا۔ میرا عنایت علی اے ایس آئی بھرتی ہو جائے گا، میرا خاندان تر جائے گا اس کی زندگی بن جائے گی مجھے چین آ جائے گا، میرے باپ کی روح خوش ہو جائے گی، میری روح بھٹکنے سے بچ جائے گی۔‘‘

منگتے نے پستول پکڑا، گھمایا اور ہنسنے لگا ’’واہ مبارک علی! اپنا صدقہ دے کر بھی پولیس کے محکمے کی ہی بھلائی چاہتا ہے۔‘‘ ماکھے نے ان سنی کرتے ہوئے کہا ’’منگتے! ٹائم کم ہے وعدہ پورا کر دے نہیں تو کھیل بگڑ جائے گا۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے دیوار کے ساتھ لگ کر آنکھیں بند کر لیں اور بازو پھیلا کر لمبے لمبے سانس بھرنے لگا۔ منگتے نے پستول اس پر تان لیا اور گنتی شروع کی۔

’’ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس‘‘ اور دیوار پھاند گیا۔

پولیس کی گاڑیوں کے ہوٹر، سیٹیاں پھر سے زور پکڑ گئیں، بھاری بوٹوں کی دھم دھم، کتوں کی بھونکوں کے ساتھ ساتھ قریب سے فائرنگ بھی ہونے لگی، ماکھے نے آنکھیں کھول دیں سامنے مانگتا نہ پا کر پورے گھر میں اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈے لگا اور تھک ہار کر چارپائی پر اوندھا گرا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اُسی رات کے پچھلے پہر پولیس نے حولادار مبارک علی شاہ عرف ماکھے کو منگتے مسلی کو پناہ اور فرار میں مدد دینے کے الزام میں گرفتار کر لیا جو دو سپاہیوں کو گولیاں مار کر کامیابی سے فرار ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆

شاہین کاظمی

آخری پنکھ

"جھیل جھرنوں میں کائی اُتر آئے تو سمجھو آکاش اور دھرتی کا سمبندھ کمزور پڑ رہا ہے، اندر کی دو رنگی پربھو کو نہیں بھاتی۔ اِس کے دوار کی اِچھا ہے تو سب لوبھ، موہ، مایا من سے نکال دو۔"

مجذوب بے چین تھا اور چمٹے کی تال پر تھرکتے اُس کے پاؤں گرد آلود

"تیری خلقت دکھی ہے پربھو دیا کر اِس پر، اَنت کر اِن کے دکھوں کا۔"

"کاہے روز بھاشن جھاڑتا ہے۔" راہ گیر کا لہجہ کڑوا تھا۔

"کیسا پربھو؟ کہاں کا پربھو؟ میں باپ ہوں بچوں کا بھوک سے بلکنا اب نہیں دیکھا جاتا..... سنسار کا دکھ اُسے کیوں نہیں دکھائی دیتا؟" اُس کے ہاتھ میں تیز دھار استرا اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔

"پیڑا کا اَنت کیسے ہو۔ منش عہد سے مکر جائے تو سنسار میں اندھیرا بہت گہرا ہو جاتا ہے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا..... اور کچھ نہیں تو اپنے ساتھ تو سچے رہ سکتے ہو؟" مجذوب دکھی تھا۔

"پچھمی ہوا ہریالی چاٹ رہی ہے سوکھا دلوں میں اُترے یا ساگر میں تباہی مقدر ہوتی ہے۔ ہوش کرو دیوانو۔ ہوش کرو۔"

"شبدوں کا بھید بھاؤ آسان ہے مگر جیون نہیں..... روز جلتی چتا پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ کبھی کسب نہ کرے تو ان چارپائی پیٹوں کی آگ کیسے بجھے؟"

لہجہ رندھ گیا۔ کچی جھونپڑی کے در پر پڑا میلا کچیلا پردہ پھر سے گرا دیا گیا۔ رات بھر اوروں کے تن کی آگ سرد کرتی کلاوتی کا اپنا من جوالا مکھی بنا ہوا تھا۔

"راہ کھوٹی ہو جائے تو منش کا من روگی ہو جاتا ہے۔ من کے روگ کا ایک ہی علاج ہے..... اُس کی پہچان۔"

"من کی شانتی چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ۔"

یہ کوئی بابو صاحب تھے۔

"ہا..... یہی تو منش کی بھول ہے..... یہ بانٹ اُسی کی کی ہوئی ہے........ راہوں میں... دلوں میں، اونچ نیچ، دھرم کرم دھن نردھن یہ پربھو کیا جانے..... یہ تو بس چند اونچے سروں کا کھیل ہے جو سب کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

"جب سمجھ میں نہیں آتا تو دوش کس کا ہوا؟ وہ یا تو سب کو بدھی دیتا یا سر ہر منش کے حساب کے رکھتا۔"

"ہمارا کیا دوش؟ اُس نے ہمیں اپنے پیروں سے بنایا، سدا ہر ایک کی ٹھوکر پر ہی رہے۔"

لمبے جھاڑو سے گلی صاف کر چمار چلّا اُٹھا۔

دنیا میں ہر طرف دکھ ہی دکھ تھا۔ ننھے ننھے بدن دھرتی میں اتارنا آسان نہیں ہوتا آنکھیں برسنا بھول جاتی ہیں۔ پانی کا رُخ اندر کی طرف مڑ جائے تو اندر آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ مٹی کی ننھی سے ڈھیری پہ ہاتھ ٹکائے وہ عورت خود بھی مٹی کا ڈھیر معلوم ہوتی تھی۔

"کیول اُسی کا نام ستیہ ہے، باقی سب جھوٹ۔"

"یہ سب جھوٹ کے پجاری ہیں۔"

"سا چا گیان بس یہیں ملے گا۔"

ہر ساہوکار اپنی اپنی دکان کی بولی لگا رہا تھا،

خلقت کے دکھ خالق جانے...

گیانی سمے کے بہاؤ سے ناشناسا اپنی اپنی گپھاؤں میں گیان بانٹتے رہے۔ دھرتی کے ساتھ ساتھ جیون بھی ٹکڑوں میں بٹتا رہا۔ ایک دن اچانک راکھشسوں نے ایک گاؤں پر دھاوا بول دیا۔ بے بس پرجا راجہ کے محل کی اُور لپکی لیکن راجہ کے ہونٹوں سے لگی بانسری نہ چھٹی۔

کئی مجذوبوں نے اپنے اپنے کمنڈل اُٹھائے اور گاؤں سے باہر نکل آئے اُن کے پیچھے پیچھے ساری پرجا بھی۔ ہر طرف راکھشسوں کا رقص جاری تھا۔ بوکھلائی ہوئی پرجا جان بچانے کے لیے دیوانہ وار اِدھر اُدھر بھاگی پھری، جھیلوں پر پھر سے کائی اُترنے لگی آکاش دھرتی سے روٹھ گیا۔

گاؤں برباد ہونے لگا۔ چاروں طرف جلے جھونپڑوں کی راکھ اور پرجا کے ٹکڑوں میں بٹے جسموں کی سڑاند کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ سارے گیانی دم بخود، پرجا شانتی کی کھوج میں جنگلوں اور سمندروں کو عبور کرتے سانسیں ہارنے لگی۔ سارا سنسار ان کے دکھ پر رو رہا تھا۔

بوڑھے سمندر کی سرپھٹتی شوریدہ لہروں نے
سفید پروں والے پرندوں کے غول اُترتے دیکھ کر
کھلے بادبانوں کو سندیس روانہ کیا
لیکن مچھلی کے دریدہ بدن سے
ٹپکتا لہو منظر دھندلا گیا
سنہری دھوپ جھنجھلا کر
پہاڑوں پر الزام دھرنے لگی

بے رحم شمالی ہوا نے
گابن سیپیوں کی کوکھ میں ہاتھ ڈال کر
انھیں ہمیشہ کے لیے بانجھ کر دیا
کھیتوں میں کام کرتی لڑکیوں کے لبوں پر
برہا کے گیت دم توڑ گئے
بانسری گرلانے لگی
لیکن دیوتا
سمندر کے سینے پر بے خبر سوتا رہا

کہتے ہیں سنسار نے تین بار جنم لیا اور نابود ہوا۔ تیسری بار سوڑن پنچھی یگوں پہلے کسی ایسے ہی کل یگ میں سنسار کو اپنے تین سنہری پنکھ دان کر کے خود آگنی میں بھسم ہو گیا تھا۔

’’کیا دنیا پھر سے نابود ہو جائے گی؟‘‘ گیانیوں کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا۔

’’سوڑن پنچھی اور کتنی بار دنیا کی تباہی دیکھے گا؟"

ایک گیانی کے ہاتھ میں پنچھی کا دان کردہ تانبے کی رنگت کا جادوئی پنکھ تھا۔

’’کیا اسے آگ دکھائی جائے؟‘‘ اس نے چاروں طرف دیکھا

’’ہاں اُس کا واپس آنا بہت ضروری ہے، دنیا برباد ہو رہی ہے۔‘‘

’’اگر اب حیات نابود ہو گئی تو شاید پھر کبھی نہ پنپ سکے۔‘‘

’’اِسے بچانا ہمارا فرض ہے۔‘‘

’’روٹھی ہوئی تشتریہ (Tishtrya) کو منانا ہوگا ورنہ حیات بخش بوندیں کبھی بھی دھرتی کو گابھن نہیں کر سکیں گی۔‘‘

’’کیا ہم خاموشی سے دھرتی کو بنجر ہوتا دیکھتے رہیں؟‘‘

دھرتی کا بنجر ہو جانا حیات کے خاتمے کا اعلان ہوگا۔‘‘

سب گیانی ایک ساتھ بول رہے تھے۔

’’ٹھیک ہے کل جب سورج کی شعاعیں بڑے مندر کے آتشدان پر ہونگی تو پنکھ کو آگ دکھا دی جائے گی۔‘‘

بڑے پجاری نے فیصلہ سنا دیا

سورج کی تیز شعاعیں آتش دان پر مرکوز تھیں۔ گیانی نے بڑے سے تغارچے میں دھری آگ کے گرد چکر لگایا اور ہاتھ میں پکڑا سنہری پنکھ آگ پر رکھ دیا۔ لوگ دم سادھے زمین پر ماتھا ٹیکے ہوئے تھے جانے

کتنا سے گزر گیا۔ پجاری کے اشلوک تیز ہونے لگے۔ گیانی نے ایک نظر پجاری کو دیکھا اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

’’ایسا نہیں ہوسکتا اُسے آنا ہی ہوگا۔‘‘ ’’اس مصیبت میں وہ نہیں تو کون آئے گا؟‘‘

آکاش سے اترے شبدوں کو نئے ارتھ دیئے گئے۔ اپنے اپنے مفاد اور خواہش کے استھان پر ان کی بلی چڑھائی جاتی رہی۔

گیانی نے ایک نظر سجدے میں پڑے لوگوں کو دیکھا۔ آگ کے گرد دوسرا چکر لگایا اور اپنے لمبے چوغے کی جیب سے دوسرا پنکھ نکال کر آگ پر رکھ دیا۔

منش پر اپنے ہی بنائے ہوئے نیم بھاری پڑنے لگے۔

بارود کی بو اعصاب چاٹنے لگی۔ ملبے کے ڈھیر کے پاس کھڑے بوڑھے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ ننھی سی لاش سمندر بھی سنبھال نہ سکا۔ کیا اس کا وزن اتنا زیادہ تھا؟

’’چھوٹے چھوٹے تابوت اتنے بھاری کیوں ہوجاتے ہیں؟‘‘

سجدہ لمبا ہوتا گیا۔

’’ایک پیڑی مٹ رہی ہے اُسے آنا ہوگا۔‘‘

’’ایک پیڑی نہیں انسانیت مٹ رہی ہے۔‘‘

’’لیکن وہ کیوں آئے گا؟‘‘

’’دشائیں کھو جائیں تو سب برباد ہوجاتا ہے، اور کتنا بھاگنا ہوگا؟‘‘

’’گناہ کب معاف ہونگے؟‘‘

’’گناہ اُس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک ......‘‘

’’ہاں کہو‘‘ پجاری نے گیانی کی طرف دیکھا۔

سورج شام کے کنارے چھوڑ رہا تھا فضا میں پر جلنے کی ہلکی سی سڑاند پھیلی ہوئی تھی۔ گیانی نے سجدے میں پڑے لوگوں کو دیکھا خاک آلود پیشانیاں زمین سے جڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے بہتے پانی نے مٹی کو بھگو دیا تھا۔

گیانی نے اپنے لمبے چوغے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر آخری پنکھ نکال کر دیکھا۔ ڈھلتے سورج کی پیلی روشنی میں یوں لگا جیسے پنکھ میں آگ بھڑک اُٹھی ہو ایکا ایکی گیان مکمل ہوگیا۔

’’گناہ اُس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک اپنی سمت درست نہ کرلی جائے۔‘‘

گیانی کی آواز میں جانے کیا تھا پجاری کی آنکھوں میں حیرت تیرنے لگی۔ گیانی نے پنکھ پھینکا اور دوسروں کے ساتھ خود بھی کچی زمین پر سجدہ ریز ہوگیا۔

معظّمہ تنویر

قلعہ بند شہزادی

یکا یک شہزادہ اُس مہابن میں تنہا رہ گیا تھا۔ اپنے ہی گیان میں ایک سبک رفتار، چمکیلی کھال والی ہرنی کا تعاقب کرتے ہوئے وہ کب اپنے ساتھیوں سے بچھڑا، اُسے مطلق خبر نہ ہوئی۔ اب وہ متحیر تھا، آخر جائے تو کس طرف ۔۔۔ چاروں اور گھور جنگل پھیلا ہوا تھا۔ پُر ہول سناٹا جو اکیلا ہونے کے احساس کو بڑھاتے ہوئے ہراس پیدا کرتا تھا، بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ خوبصورتی سے ڈھلتی شام کو اندھیرا بس نگلنے ہی والا تھا اور کسی بھی لمحے کوئی آکاسمک دُرگھٹنا وقوع پذیر ہو سکتی تھی۔ شومئ قسمت کہ اُس کی جادوئی ڈبیا ایک چشمے سے پانی پیتے ہوئے جیب سے گر کر خاموش ہو گئی تھی۔ چناں چہ اب وہ کسی سے رابطہ کرنے سے بھی قاصر تھا۔ گو اُسے امید تھی کہ اب تلک سوچنا و بھاگ کے ذریعے اُس کی گمشدگی کی خبر مشہور ہو چکی ہوگی اور محافظوں کے دستے اُس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہوں گے تاہم اس امکان کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا کہ مدد پہنچنے سے پہلے ہی وہ نہتا کسی ناگہانی کا شکار ہو سکتا تھا۔

پُرکھ سا طاقتور جیو بھی کبھی کبھار کتنا لاچار ہو جاتا ہے کہ ایک دھرتی مان سوریر بھی پل بھر کو اپنی ہمت کھو بیٹھا تھا۔ اُس ہتاش کو ایسا لگا کہ جیسے وہ اسی کانتار میں پھنس کر رہ جائے گا یہاں تک کہ اُس کا انت آن پہنچے گا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے اندر وچتا بڑھنے لگی۔ کاش! اسے ویرانے میں دور کہیں کوئی جھوک دکھائی دے یا پھر ایک گھاس پھونس کی ٹوٹی پھوٹی کٹیا، جس میں سے دھواں اُٹھ رہا ہو۔ جہاں وہ صرف ایک شب کے لیے بسرام کر سکے۔ ایسے عمدہ اتفاقات کے متعلق اس نے داستانوں میں ضرور پڑھا تھا لیکن حقیقت میں ایسا ہونا فوقِ تصور تھا۔

پھر جیسے ایک چمتکار ہوا ۔۔۔ شہزادہ مارے خوشی کے چلایا! یہ سنسار امکانات کا گھر ہے۔ یہاں کیا نہیں ہو سکتا! واقعی امکان لا انتہا ہے۔ حدِ تخیل سے ماروا ہے! ہمیشہ امکان کی جیت ہوتی ہے!! دور اسے ایک پرانے قلعے کے بُرج سجھائی دے رہے تھے۔ اُس کے نڈھال بدن میں ایک نوشکتی در آئی تھی۔ اب وہ جیت کی سرشاری لیے بڑی سرعت کے ساتھ قلعے کی سمت بڑھ رہا تھا۔

آہنی پھاٹک پر کوئی دربان نہیں تھا اور یہ انوکھی بات تھی۔

تیسری بار دستک دینے پر ایک مُرگ نین، ہنس مکھ شہزادی نے باہر جھانکا۔ شہزادے کو دیکھتے ہی وہ پہلے ہنسی پھر روئی۔

ایں گل دیگر شگفت! راجکمار نے دل میں خیال کیا۔ پھر اُس اندوہ گین مہ لقا سے رونے اور ہنسنے کا سبب پوچھا۔

شہزادی کے لب ہلے۔

میں تمہیں دیکھ کر اس لیے ہنسی تھی کہ میں نے مدتوں بعد کسی انسان کو دیکھا ہے اور میرے رونے کا کارن یہ تھا کہ میں ایک ظالم جادوگر کی قید میں ہوں جو تھوڑی دیر میں آنے والا ہے اور ہم دونوں کو ساتھ دیکھ کر ہماری ہتیا کر ڈالے گا۔ یہ کہ کر وہ چندریکا جانے کے لیے مڑی۔ لمحہ بھر کو شہزادے کی آس، نراشیا میں بدلنے لگی مگر اُس نے تُرت خود کو سنبھالا۔

سنو شریمتی! میری عرض دھیان سے سنو۔ میں راستہ بھٹک گیا ہوں۔ میرے لیے کسی ٹھاؤں تک اپڑنا بہت کٹھن ہے۔ میں اناشرم ہوں۔ اکلانت ہوں۔ اب میں دھن وان ہو کر بھی بھکشک ہوں۔ اس وقت صرف تم ہی ہو جو میرے ساتھ بھلائی کر سکتی ہو۔ گرچہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ ایک وواہتا کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی انجانتا کو اپنے گھر میں پناہ دے۔ ایسا کرنا، گویا پاپ کرنے کے مترادف ہے اور محض شبہ کی بنا پر ایک مہیلکا قابلِ گردن زنی ہوتی ہے۔ مگر یہ بھی سوچو کہ میں ایسی کال راتری میں کہاں جاؤں گا۔ میں بالکل سرکشت نہیں ہوں۔

تم یہاں بھی ہرگز سرکشت نہیں ہو سکتے۔ شہزادی نے کہا اور پٹ بھیڑ کر چلی گئی۔ شہزادے کے پھر دستک دینے پر اُس نے کواڑ کی اوٹ سے جھانکا۔ وہ مجبور گڑگڑایا:

اے سادھوی سوامنی! میں تم جیسی شیلوتی سے کسی طرح کی کٹھورتا کی توقع نہیں کر سکتا۔ یہ درست ہے کہ میری التماس بے محل ہے اور تمہارے لیے بڑی مشکل ہے پھر بھی میں بنتی کرتا ہوں کہ اس بے بس مسافر کو صرف ایک رات کہ لیے اپنے ہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دو۔

مگر یہ کسی طور ممکن نہیں۔ میں تمہاری زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ شہزادی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

سنو اے پربھاشالی! میں امکانات کے بارے میں سوچتا ہوں اور ان پر یقین رکھتا ہوں۔ کیوں کہ ایک امکان اپنے اندرگر بہت شکتی لیے ہوتا ہے۔ میرا ایقان ہے کہ تمہارے ہاں میری سرکشا کا پورا اہتمام موجود ہے لیکن اگر تم سوچتی ہو کہ میں کوئی ہارک یا جل باز ہوں جو تمہیں ایک کلپت کتھا سنا کر فریب دینا چاہتا ہے تو میں یہاں سے فوراً چلا جاتا ہوں۔

بادل زور سے گرجا۔ ہوا تیز چلنے لگی۔

شہزادی نے تھوڑی دیر سوِچار کیا پھر سنکار کیا۔ آگیا پا کر شہزادہ چک دک اس کے پیچھے چلا۔

اندر کا ماحول بے حد ترسناک تھا۔ دیواروں پر عجیب وغریب تصاویر آویزاں تھیں۔ کہیں خوفناک

چیتے دھاڑتے دکھائی دیتے تھے تو کہیں مست بھنڈا اپنے پیروں تلے سب کچھ روندتے نظر آتے تھے اور کہیں پھن دھر پھنکارتے پھرتے تھے۔ صاف پرتیکش تھا کہ شہزادی یہاں ایک کشٹ دایک جیون بتا رہی تھی۔

ایک طویل راہداری سے گزرنے کے بعد وہ ایک وشال خواب گاہ میں داخل ہوئے۔ اگرچہ کمرہ حددرجہ پیراستہ تھا مگر پھر بھی نجانے کیوں شہزادے کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہاں شہزادی کے ذوق سے تعلق رکھنے والی کوئی شئے موجود نہ تھی۔

بھمان شہزادے! تم یہاں کچھ دیر وشرام کرو۔ میں تمہارے لیے کچھ ریندھ لاتی ہوں اور یہ میری طلسمی ڈبیا تم رابطہ کرنے کے لیے استعمال کرسکتے ہو مگر خبردار! اس پر سے اپنے نشانات مٹانا مت بھولنا۔ یہ کہہ کر وہ غنچہ خاطر خواب گاہ سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد شہزادے نے ایک کونے میں رکھے مشکیزے سے پانی پیا اور رابطے کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اچانک اس کی توجہ ہوا میں معلق آئینہ جہاں نما پر مرکوز ہوگئی جس پر اس کی گمشدگی کے حوالے سے ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔

کچھ سمے بعد شہزادی ان پانی اور پھل پھلاری لیے حاضر ہوئی۔ ابھی شہزادے نے پہلا ہی لقمہ توڑا تھا کہ ایک جھنکار سنائی دی۔ اس کے ہاتھ کا نوالہ ہاتھ میں اور منہ کا منہ میں ہی رہ گیا۔

وہ مہامائی جادوگر آن پہنچا۔ شہزادی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ آؤ میں تمہیں ایک محفوظ جگہ پر چھپا دوں۔ وہ رچھمان کا ہاتھ پکڑے ملحقہ تہ خانے میں اُتر گئی۔ اناوچتی شہزادے نے احساس کیا کہ اس کی انگلیاں بہت گداز تھیں۔

کوئی آہٹ نہیں۔ دم سادھے رہو۔ یاد رکھنا ذرا سا بھی کھٹکا ہم دونوں کے لیے موت کا سندیشا ثابت ہوگا۔ شہزادی نے آہستگی سے کہا اور اتاول میں وہاں سے چلی گئی۔

شہزادے نے تہ خانے کے ماحول پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ اچانک وہ ششدر رہ گیا۔ تہ خانہ کیا تھا، ایک جیتی جاگتی چتر شالا تھا۔ دیواروں پر آویزاں تصاویر، کسی ماہر چتر کار کی فنکاری کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ وہ ایک ایک تصویر کو پورے انہماک کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور ہر تصویر کسی یُگ کی پُراسراریت کی داستان کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے اندر موجود کردار جیسے چلتے پھرتے، بولتے چالتے تھے اور مناظر کے اندر عجب سرسراہٹ پائی جاتی تھی۔

یہ کس کی دنیا تھی؟

وہ اتنا کھو گیا تھا کہ اسے سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ مگر وہ مفہوم نہیں سمجھ پاتا تھا۔ پھر اسے لگا کہ جیسے وہ بھی کسی تصویر کا ایک کردار بنتا جا رہا ہو اور اس کے زمانے کی کہانی بھی رنگوں میں ڈھل رہی ہو ----
اُسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ اُس پر کتنی تھکن چھائی ہوئی تھی، وہ کئی پہر سے بھوکا تھا، پیروں کے چھالے پھٹ کر درد کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی جان خطرے میں گھری ہوئی تھی۔

آخر یہ چھوٹی سی دنیا کس نے بسا رکھی تھی؟

چتر کاری کا یہ کام انوپم تھا۔ جیسے کلاکار نے رنگوں کے ساتھ ساتھ تصاویر میں اپنا جی بھی ڈال دیا ہو۔

آدم بو۔۔۔۔ آدم بو۔۔۔۔ جادوگر قلعے میں داخل ہوتے ہی چلایا۔ ضرور ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا آدم زاد یہاں موجود ہے۔

تم مجھے مایاوی سمجھتے ہو جب کہ میں پرادھین، تمہاری مطیع، آبرو سنبھالے ہمیشہ تمہارا آگیا پالن کرتی ہوں۔ کیا تمہیں میرا ذرا بھی وشواس نہیں۔ شہزادی اٹ پٹائی۔

ناری جات وشواس پاتر ہو ہی نہیں سکتی۔ جادوگر بولا۔ میرے ایک یار کا کہنا ہے کہ "ستری کو قلعے میں بند کر کے اُس پر محافظ تو مقرر کر دو گے لیکن محافظ کی نگرانی کون کرے گا؟" مجھے معلوم ہے کہ تم بہت گھنی ہو۔ مجھے لکھو متی سمجھتی ہو۔ دیکھ رہا ہوں آج میرے بستر کی ترتیب کچھ بدلی ہوئی ہے۔ تکیوں میں ایک اجنبی سی باس بسی ہے اور وہاں تہ خانے کا تالا بھی لرزاں ہے۔ لاؤ چابی دو مجھے۔ ضرور تم نے وہاں کسی کو چھپا رکھا ہوگا۔

وہ شامت کی ماری افسردہ ہو کر بولی۔

افسوس! کہ تم مجھ ایسی لاجونتی پر ہمیشہ شک کرتے ہو۔ تم کیا جانو میں اناتھ یہاں کس حال میں جی رہی ہوں۔ آہ! اگر تم نے میرا جانکار بننے کی بجائے میرا آقا بننے کو ترجیح دی۔ اُس پریا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

گر یہ دامِ زن است۔ میں تمہاری چترائی کو خوب سمجھتا ہوں۔ جادوگر بولا۔ میرا ایک سنگی کہتا ہے کہ "عورت کے حربے یہ ہیں کہ دھوکہ دینے والی باتیں، مکر، قسمیں کھانا، بناوٹی جذبات کا اظہار، جھوٹ موٹ کے آنسو بہانا، دکھاوے کی مسکراہٹ، بے معنی خوشی، بے معنی بے اعتنائی، بے مقصد سوالات پوچھنا، نیک و بد میں تمیز نہ کر سکنا، عشاق کی طرف نگہِ غلط انداز سے دیکھنا۔" ایک دوسرا ہمہ دان تو اس بات پر شکر ادا کرتا ہے کہ "قدرت نے اسے مرد بنایا۔

شہزادی بلکنے لگی۔ مگر وہ گزاف گو حد سے بڑھنے لگا۔ لو! میرے ایک اور مہربان نے تو جیسے میرے دل کی بات کہ ڈالی۔ وہ کہتا ہے "عورت تیرا نام کمزوری ہے۔" اس ڈھٹائی کی حرف گیری سے وہ ششی بدن حسینہ اشانت ہو گئی۔ دفعتاً اس نے زوردار چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ جادوگر نے اسے بھونی کا ٹھسکا جانا اور بے پرواہ ہو کر بیٹھ گیا۔ چوں کہ بے سدھ ہوتے سمے شہزادی کو تہ خانے کی طرف سے شدید چنتا لاحق تھی چناں چہ وہ جلد حواسوں میں آ گئی۔ اب اس نے اپنی کملاہٹ کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپایا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

جادوگر نے پوچھا۔ پہلے تم روئی اور اب ہنسی کیوں۔

شہزادی نے جواب دیا۔ پہلے مجھے تمہارے انترگیانی دوستوں کے خیالات جان کر رونا آیا کہ انہوں نے نر، ناری کے بیچ سمبندھ کو کتنا کمزور کر دیا۔ جایا، پتی کے درمیاں مترتا کو پنپنے ہی نہیں دیا۔ اور میں ہنسی

اس لیے ہوں کہ تم جواُن کی سوچ کو درست مانتے ہو تو کل کلاں کو جب میں ایک آکاش پھل کو جنم دوں گی تب میں تمہارے لیے کس قدر روشوست ہوں گی۔ تمہیں میرے نزل ہونے کا وشواس ہوگا۔ میری گواہی کو سچ مان کر تم باپ بننے پر گرب محسوس کرو گے۔

جادوگر سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو خوامخواہ بھبکنے لگا۔

ادھر شہزادی تہ خانے والی بات سے عجیب کلبلاہٹ کا شکار تھی۔ اس نے ٹھک ٹھکیے کا دھیان بٹانے کی خاطر لگاوٹ کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اس کتر کی کا مزاج اصلاح پر آیا تو اس نے ایک ایک ایسی بھوگیا کا قصہ چھیڑ دیا جس کے ہاؤ بھاؤ پر وہ دل و جان سے فریفتہ تھا۔ گو یہ انتہائی ابھدرتا کی بات تھی مگر پھر بھی وہ کھنڈتا اس دروئی کے پہلو سے لگی مند مند محبت جگاتی رہی۔ تب کہیں جا کے پتھر پگھلا۔ پھر اس مدماتے نے وفورِ شوق کے عالم میں شہزادی کو جس ناؤں سے پکارا، وہ اس کا تھا ہی نہیں۔ جب وہ ظالم گہری نیند سو گیا تو شہزادی کو راج تنئے کی بھوک پیاس کا خیال آیا اور وہ کھانے پینے کا سامان لیے تہ خانے میں اتر گئی۔

اسے دیکھتے ہی راجنیا بے قراری سے بولا۔ میں اس چتر کار سے ملنا چاہتا ہوں۔

تم اس سے مل چکے ہو۔ شہزادی نے دھیرے سے کہا۔

یہی وہ لمحہ تھا جو صدیوں کی زنجیر سے ٹوٹ کر الگ ہو گیا تھا۔ کبھی نہ گزرنے کے لیے وہ کرشماتی لمحہ ٹھہر گیا تھا۔ شہزادہ محبت آشنا ہوا تھا! پہلی بار وہ امکان کی سربستہ مایا شکتی کو اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔

اس کے یوں مبہوت ہو جانے پر شہزادی نے بدن چرایا اور کھانے کی طرف اشارہ کیا۔

شانت ہو جاؤ۔ میں تمہاری رکشا کے لیے یہیں موجود ہوں۔ جادوگر بہت ندرالو ہے۔ کجر دم تک سویا ہی رہے گا پر اگر کہیں بھونچال آ گیا تو ضرور جاگ بھی سکتا ہے۔ اس نے دلاسا دیا اور ایک گوشے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے ایک رومال کاڑھنا شروع کر دیا۔

شہزادے نے درزیدہ نگاہوں سے دیکھا سیاہ لبادے میں اس پرمدا کا جمال جلوۂ مہتاب معلوم ہوتا تھا۔ جسے کالی ریشمی زلفیں میگھ گھٹا کی مانند گھیرے ہوئے تھیں۔

کھانے کے دوران وہ سورما مسلسل اپنی چاہت کو پا لینے کے امکانات پر غور کرتا رہا۔ اس نے بیشتر داستانوں میں سن رکھا تھا کہ کس طرح ایک شہزادہ آخر کار کسی شہزادی کو ظالم جادوگر کی قید سے چھڑا لے جاتا ہے۔ مگر یہ بھی ممکن ہو سکتا تھا کہ راج کماری اس کے ساتھ جانے سے ہی انکار کر دے۔ ایسی صورت میں وہ اسے اغوا کرنے کا ارادہ باندھ چکا تھا۔ کتنے بادشاہوں نے چن چن کر اپنی پسند کی عورتوں کو حرم سراؤں میں بندھو بنا کر رکھا تھا۔ لیکن وہ تو اسے اپنی رانی بنانے کا خواب آنکھوں میں بسائے ہوئے تھا۔ پھر بھی وہ اس لِلتا کی کی کھینچا سے خائف تھا۔ آہ! میری طرح کوئی عاشق بے سُرت، دیا پاتر نہیں ہوا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ مہابلی کلپنے لگا۔ شاید میری محبت کبھی پھل نہ ہو۔۔۔ آخر یہ میرے دل کا حال جان کیوں نہیں جاتی جب کہ عورتیں

مردوں کے عشق کا حال معلوم کرنے میں ایسا ہی ملکہ رکھتی ہیں جیسے ایک بدورات کے وقت صحرا میں اپنی منزل کی سمت ڈھونڈنے میں مشاق ہوتا ہے۔ آہ! یہ کیسی آگ ہے جس میں جل کر ہی قرار ملتا ہے۔ تب عشق نے اسے یوں سکون بخشا جیسے مینہ برسنے کے بعد دھوپ چمکنے لگے۔ وہ جان گیا کہ محبت اور خوبصورتی کی سیڑھی سے انسان کاملیت کو پالیتا ہے۔ ایک خوبصورت وجود کی کشش سے ہی خوب سے خوب تر خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ تب حسن اپنی انتہا پر پہنچ کر ایک حسین روح میں ڈھل جاتا ہے۔

ایسا غیبی ایک کوندا سا لپکا۔ خیرگی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ شہزادی کی کڑھائی والی سوئی سے روشنی پھوٹتی تھی۔ اس کے ہاتھ ایک جفاکش عورت کے ہاتھوں کی طرح سخت کھردرے اور بے کشش معلوم ہوتے تھے پھر پلک جھپکنے میں ہی کڑھے ہوئے رومالوں کا ڈھیر اتنا اونچا ہو گیا کہ وہ اس کی اوٹ میں چھپ گئی۔

اب شہزادے سے رہا نہ گیا۔ اس نے پوچھا۔

تم رومالوں پر کیا کاڑھتی ہو؟

کتھاورتا۔ وہ ادائے بے نیازی سے بولی۔

کتھاورتا؟

ہاں تم دیکھ سکتے ہو۔ شہزادی نے ایک رومال اس کے سامنے پھیلا دیا۔

شہزادہ رومال پر بسائے گئے سرسوت منظر میں کھبتا چلا گیا۔

یہ کون سا یگ تھا؟

وہ کہاں تھا؟

بے داغ دھرتی لہلہاتی تھی۔ زمیں پر خون کا ایک بھی دھبہ نہ تھا! بے ساختہ اس کے منہ نکلا۔

جو بھی ہو زمانہ امن کا متبادل کچھ اور نہیں ہو سکتا!

کمل نین شہزادی افرودایتی کے روپ میں سمکھ بیٹھی گھلاوٹ کی آنکھ سے دیکھتی تھی۔ اس کے گدرائے ہوئے انگ سے محبت پھوٹتی تھی۔ نفیس کشیدہ کاری والا سرخ کمربند جادو نگاہ حسینہ کی حشر سامانیوں کو افزوں کرتے ہوئے دعوتِ وصل دیتا تھا۔۔ وہ کل کنٹھ اپنی مادھری آواز میں جو کویتا گا رہی تھی اس کی لے مست کر دینے والی تھی گو شہزادہ الفاظ کا مطلب سمجھ نہیں پاتا تھا پھر بھی سرور کی لہریں روح کو ہلکورے دیتی تھیں اور وہ متوالا عالمِ کیف میں جھومتا تھا۔۔ جب وہ گانا ختم کر چکی تو اس نے نغمے کے معانی جاننے کی درخواست کی تب وہ گل اندام اپنے دلربا انداز میں یوں گویا ہوئی۔

”موسمِ بہار کے رنگین پھول کہ جنہیں گنا نہیں جا سکتا،
ان سب کی رعنائی ایک ناری کے بدن میں اتری ہے۔

سورج کی روپہلی کرنوں کی تمازت سے اس کا وجود سنہرا ہو گیا ہے،
اور بیکراں سمندر کی موجیں اس کے جوش و جذبے کی مظہر ہیں۔
صدیوں سے بہتے دریا جو اپنے بہاؤ کی وجہ سے شور مچاتے ہیں،
ان کی روانی عورت کی سوچ سے مشابہ ہے۔
چوں کہ وہ اپنے حواس پر قابو رکھنے پر قادر ہے،
اسی لیے وہ امن اور محبت کی پیامبر ہے۔''

گیت کے معانی بیان کر چکنے کے بعد وہ ہنس گامنی اٹھکھیل پن سے یونہی ایک سمت کو گلِ پیادہ کی ایک روش کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ یوں کہ افسوں گر کا سراپا فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا اور اس کے پلکے کا لال رنگ اور بھی شوخ دکھائی دینے لگا۔ اب اس عاشقِ دل رفتہ سے رہا نہ گیا۔ وہ ادھر پان کے واسطے بیقرار ہو چلا۔ بلاشبہ عشاق اپنی جان لٹا کر ہی دیدارِ محبوب سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ دنیا داروں کے کام عقل و ہوش سے انجام پاتے ہیں جب کہ ایک چاہنے والا کارِ جنوں سے غرض رکھتا ہے۔

وہ رنجک روپ ساگر میں ڈوبا ہوا تھا، ایسے اَنت سکھ میں، کہ جس نے اسے خود فراموشی کے بھید سے ہمکنار کر دیا تھا، تبھی ایک باریک سی نسائی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

جاگو شہزادے! ایک منگل سما چار سنو۔ طلسماتی ڈبیا کے توسط سے تمہارے ساتھیوں کا سندیش پہنچا ہے۔ وہ قلعے کی پچھلی دیوار کی جانب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

شہزادہ اپنی ادبھاونا کے زیرِ اثر تھا۔ وہ اس خواب سے چھوٹنا ہی نہ چاہتا تھا۔ اس نے جرأتِ رندانہ سے کام لیتے ہوئے شہزادی کو کلائی سے پکڑ کر اپنے قریب کھینچ لیا۔

تم میری ہو۔ میرے ساتھ چلو۔

وہ کوملانگی بانہہ چھڑانے کی سعی میں بے حال ہونے لگی۔ مگر وہ از خود رفتہ اظہارِ التفات سے باز نہ آیا اور اپنی درد انگیز کیفیت کو اس طرح بیان کرنے لگا۔

میرے اندر عشق طلوع ہو چکا ہے۔ جو میرے دل و جان پر نور بن کر چھا گیا ہے۔ محبت کوئی اختیاری فعل نہیں بل کہ یہ نوشتۂ تقدیر ہے۔ عشق کی راہ کٹھن اور طویل ہے اور ہر کوئی اس کی تاب نہیں لا سکتا۔ آہِ سوزاں میرے سینے کے اندر آتشِ شوق کو بھڑکاتی ہے۔ اور میری نمناک آنکھیں محبوبہ کی صورت دیکھنے کو ترستی ہیں گرچہ وہ میرے سامنے ہی کیوں نہ ہو۔ اب مجھے اپنے مہ تاباں کے علاوہ کسی اور کا خیال نہیں۔

اے تغافل شعار ستم پیشہ ساحرہ! تم اپنے حسن کے باغِ بہشت کی جھلک دکھلا کر اب مجھے ہجر کے تپتے صحرا میں چھوڑ دینا چاہتی ہو۔ بھلا ایک مریضِ عشق کے دل میں صبر کہاں ٹھہرتا ہے۔ وہ اسنتو شا تو صبر کا مفہوم ہی نہیں جان پاتا۔

جب وہ گھایل اپنے زخم دکھا چکا۔ دل کا حال سنا چکا تو وہ مصیبت زدہ ناری پہلے ہنسی پھر روئی۔

راج کنور اس ادا پر حیران رہ گیا پھر اس رشکِ پری سے ہنسنے اور رونے کا سبب دریافت کیا۔ شہزادی نے جواب دیا۔

مجھے ہنسی اس لیے آئی کہ میں نے پہلی بار کسی مرد کی آنکھوں میں انجھو دیکھے اور میں نے سن رکھا ہے کہ اشک دل کی زمین کو نرم کرتے ہیں۔ جب کہ میرے رونے کی وجہ یہ تھی کہ مرد کا ہمیشہ سے یہی سبھاؤ رہا ہے کہ وہ عورت کی من کا منا جانے بنا ہی اپنی مرضی اس پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک اٹل سک حقیقت ہے۔

شہزادے نے کہا۔ تم جو بھی کہو مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ تم روپ ریکھا سے ہو بہو افرودائتی کے مماثل ہو۔ میں نے تمہیں خواب میں دیکھا اور حقیقت میں پا لیا۔ اب میں تمہیں کھو کر ر بھاگا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میری پیاری! میں تمہارے الھڑ پن پر مرمٹا ہوں۔ پس آج سے ظالم جادوگر میرا رقیب ہے اور اگر وہ موڈھ میرے راستے میں آیا تو میں ضرور اسے ہلاک کر ڈالوں گا۔

یہ سن کر وہ دکھیا کپمنے لگی جیسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس ہی تو جائے گی۔۔۔ پھر اسے یاد آیا کہ اب پرتھوی پہلے جیسی سرسبز و شاداب نہ رہی تھی۔ اس پر جا بجا خون کے دھبے تھے۔ اور یہ کہ زمین پر اس کی حیثیت ایک مغلوب کی تھی۔ لال کمربند چھین لیا گیا تھا۔ اور اس کی نابنا کی کو ہوسنا کی کا گھن لگ گیا تھا۔ تب وہ اس سودائی کی منت سماجت کرنے لگی۔ مگر وہ زور آور نہ صرف اپنے ارادے پر ڈٹا رہا بلکہ ٹھرائی پر اتر آیا۔ زبردستی اسے بازو سے کھینچ ساتھ لیے چلا۔ شہزادی کے حلق سے ہکار نکلی۔

کوئی ہے؟ جو مجھے اس بلدھاری کے پنجے سے چھڑائے۔

یکایک زمین پوری شدت سے ہل گئی۔ سب اتھل پتھل ہو گیا۔ اور وہ دونوں تصاویر کے ڈھیر کے نیچے دب چلے۔ مگر تاحال شہزادے نے بانہہ نہ چھوڑی تھی۔

آخر تم مجھ ایسے مہارتھ کو کیسے ٹھکرا سکتی ہو۔ بھلا میرے جیسا ساہسی ایک ناری سے کیسے ہار مان سکتا ہے۔ میں ہر حال میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اس جیوت سے مکتی دلاؤں گا۔

سرت پکڑو راج کمار۔ وہ لاچار مانتی بنتی کرنے لگی۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میں کبھی تمہاری نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ ایک استر وتی اپنی ہری کوکھ کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ مجھے مکتی نہیں چاہیے۔

تب اس کلیش پر ونے سکماری کی بانہہ چھوڑ دی۔

تم گات سے ہو۔ افسوس! میں نے تمہیں بہت کلپایا۔

تہ خانے کی سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ شہزادی نے اپنی سوگند دے کر پراترت کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اور جیسے تیسے ڈھیر سے نکل کر کھڑی ہو گئی

آدم بو۔۔۔ آدم بو۔۔۔ جادوگر دھاڑا۔ مجھے یہاں کسی اور انسان کی بو آ رہی ہے ضرور یہاں

کوئی ہے۔

تب ستری نے انتہائی مکاری سے کام لیتے ہوئے بات گھڑی۔

اب تو یہ خوشبو تم کو دن رات آیا کرے گی۔ دراصل یہ خوشبو تمہارے اس دلارے کی ہے جس نے میری کوکھ کے اندر اٹھکیلیاں کرنا شروع کر دی ہیں۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔

وہ انیائی اس جواب سے کچھ بہل سا گیا مگر پھر اچانک ہی جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑا۔ یہ سب امک دھمک، انگڑ کھنگڑ کیا ہے؟ کیا میں نے تمہیں چتاونی نہیں دی تھی کہ للت کلا سے دور رہو۔

مگر للت کلا میری پوروں میں بسی ہوئی ہے۔ سانسوں میں رچی ہے۔ یہ میری آتما سے جڑی ہے۔ میں اس سے کیسے دور ہو سکتی ہوں؟ شہزادی روہانسی ہو گئی۔

جادوگر نے اسے جھونٹے سے پکڑ لیا۔ تم جو خود کو پرادھین سمجھتی ہو۔ یوں چھپ کر چھنالا کرتی ہو۔

تب اس ظالم نے الاہنے، مہنے دیتے ہوئے اس کے سیمیں تن کو نیلگوں کر ڈالا۔ جھونجل اتارنے کے بعد اب وہ ناشک اگنی لینے دوڑا تا کہ چتر شالا کو جلا کر بھسم کر دے۔

سمے بہت کم تھا۔ انبار سے نکل کر شہزادہ ایک پجاری کی مانند اپنی سسکتی تڑپتی محبت کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ سانس روکے، حد درجہ احتیاط کے ساتھ کہ کہیں وہ کوئی بے ادبی نہ کر بیٹھے، اس نے دردمندانہ انداز میں اس دیوی سے گیت سنانے کی گزارش کی۔ گرچہ یہ درخواست بے محل تھی کیوں کہ سمے واقعی بہت کم تھا اور وہ دونوں موت کے دہانے پر کھڑے تھے۔ پھر بھی شہزادی نجانے کیا سوچ کر اس کی منوکامنا کو رد نہ کر سکی اس نے بھرائی ہوئی آواز میں سرگم چھیڑ دی۔ پھر کویتا کے مفہوم سے آگاہ کیا۔

"لباس کے کناروں میں اس لیے ملائمت ہے کہ وہ اپنی نرم پوروں سے کپاس چنتی ہے۔
شام ڈھلتے ہی عالم پر نیند چھانے لگتی ہے کہ وہ اپنی مدھر آواز میں لوری سناتی ہے۔
اس کی نازکی جہاں کی شانتی کا باعث ہے۔
وہ سمندر سے زیادہ گہری اور دھرتی سے بڑھ کر زرخیز ہے۔
اور اس کی ذات میں ذہانت خزانے بھرے ہیں جو ابھی منظرِ عام پر نہیں آئے،
سو ابھی وہ صحرا کے پھول کی مانند ہے۔
وہ جو ہزاروں پردوں میں چھپائی گئی ہے اور قید و بند کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے،
اس کی سوچ ایک پرجوش کبوتر کی طرح ہے،
جو آکاش منڈل کی انتہائی وسعتوں میں اڑان بھرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
آخر وہ کس لیے جھٹلائی جاتی ہے،
کیا وہ بغیر ذہن کے پیدا ہوئی ہے؟"

اب راج کمار نے فرطِ محبت کے عالم میں شہزادی کے نازک گھایل پیروں پر الوداعی بوسہ دیا۔
آبِ ندامت، سیلِ رواں کی صورت بہہ نکلا۔
اس کے انجھو پاؤں پر ثبت ہو کر نقش میں ڈھل گئے۔ امر ہو گئے۔
"تمہیں شہزادی عورت کے نصیب کا تعین کرنا ہے۔
اے میری پیاری! تمہاری عظمت ایک قانون ہے۔
تمہیں اس قانون کو لاگو کرنا ہے۔
تمہیں اپنی چتر شالا کو جل کر بھسم ہونے سے بچانا ہے۔"

قلعہ بند شہزادی سے ملے ہوئے شہزادے کو ایک مدت بیت چکی ہے۔ گرچہ وہ مہیندر زندگی کی نیرنگیوں میں کھو چکا ہے۔ جی بہلانے کے لاکھوں سامان موجود ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھار اسے وہ عجب سی مہلا یاد آتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ کیا اب بھی وہ اُسی طرح ہنستی اور روتی ہوگی۔ کیا اب تلک وہ چتر کاری کرتی ہوگی اور رومالوں پر کتھا وارتا کاڑھتی ہوگی۔ کیا اب بھی اُس شوبھنا کا حسن سیاہ لبادے میں چاند کی طرح دمکتا ہوگا۔ اور اس کی چتر شالا کے ساتھ کیا ہوا ہوگا کیا وہ اس کی رکشا کر پائی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آنے والے وقت میں جادوگر میت بن کر اس کی کلا کو لیے نگری نگری گھومتا پھرے لیکن اگر اس گھمنڈی نے اپنا چلن نہیں بدلا اور اپنی دشٹ بھاؤنا پر قائم رہا تو انت کاری شہزادی ضرور اپنی منن شکتی کے بل بوتے پر کوئی ایسی راہ نکالے گی کہ اس کی پرادھینتا سے آزاد ہو جائے گی۔ تب ظالم جادوگر کا بنایا ہوا طلسم کدہ غائب ہو جائے گا۔ اور اس کا کوئی انتر منتر کارگر نہ ہو سکے گا۔ ایسا ہونا امکان کے اندر ہے۔ شہزادے کو پورا یقین ہے کہ تب کوئی شہزادی انامک نہ ہوگی۔

☆☆☆☆

محمد جمیل اختر

ٹوٹی ہوئی سڑک

وہ ایک چھوٹے سے گاؤں کی ایک چھوٹی سی سڑک تھی، جس کے اردگرد دور درخت ہی درخت تھے درختوں کے پیچھے سکول کی عمارت تھی ۔ اس سڑک پر آپ اگر چلتے جائیں تو آگے ہسپتال آجائے گا جہاں ایک ڈاکٹر صاحب بیٹھتے تھے، جو سب کو ایک ہی طرح کی کڑوی ادویات دیتے تھے ان کے پاس کوئی دوا میٹھی نہیں تھی دوا کے فورا بعد آپ کو چینی بھی کھانا پڑے گی، لیکن اب وہ ڈاکٹر صاحب معلوم نہیں کہاں ہوں گے کہ یہ بہت پرانی بات ہے۔

اس سڑک میں کچھ بھی خاص بات نہیں تھی لیکن معلوم نہیں مجھے وہ سڑک بھولتی کیوں نہیں ۔ اس کے ایک سرے پر بجلی کا کھمبا نصب تھا جب رات ہوتی تو بلب جلتا اور سب بچے اس کے نیچے کھیلا کرتے، جب بہت بارش ہوتی تو سڑک پر پانی ہی پانی ہوتا اور اپنی کشتیاں لے کر سڑک کے دریا میں اتر جاتے، معلوم نہیں مجھے وہ سڑک وہ کھمبا کیوں کر یاد ہے، وہاں ایک بچہ تھا جو شاید درخت کے ساتھ ٹیک لگائے اب بھی بیٹھا ہو، وہ جو ساری دوپہر درخت کے نیچے گزارتا تھا، اسے گاؤں سے اس سڑک سے اور وہاں کے پرندوں سے محبت تھی ۔ اسے اس گاؤں سے محبت تھی جہاں امن وسکون تھا۔

شاید وہ اب بھی سکول کی فیس جو اس سے راہ میں کہیں گر گئی تھی ڈھونڈھ رہا ہو، ساری دوپہر نکل گئی تھی ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گیا تھا لیکن اسے روپے نہ ملے، بغیر پیسوں کے نہ وہ سکول جا سکتا تھا اور نہ گھر، معلوم نہیں وہ کتنی بار سڑک پر آیا اور گیا تھا، وہ بار بار سورج کو دیکھتا کہ کہیں ڈوب نہ جائے یہ ڈوب گیا تو اندھیرے میں روپے کیوں کر ملیں گے لیکن سورج کو کیا خبر، سو وہ ڈوب گیا۔۔۔ وہ پریشان ہو کر کھمبے کے نیچے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔۔۔ شاید وہ اب بھی وہاں بیٹھا ہو۔۔۔۔۔

وہ بالکل ہی عام سی سڑک تھی، وہی لڑکا کہ جو میرے ساتھ شہر نہ آسکا، اپنے ہم جماعتوں سے جھوٹ بولتا تھا کہ سڑک کے کنارے درختوں میں جن پرندوں کے گھونسلے ہیں وہ سارے پرندے اس کے دوست ہیں، اور جب باقی لڑکے نہیں ہوتے تو پرندے درختوں سے اتر کر آتے ہیں اور وہ مل کر کھیلتے ہیں، سب کہتے تھے

جھوٹ ہے ایسا بھلا کیوں کر ممکن ہے ۔ سب نے کہا اگر ایسا ہے تو ہم چھپ کر بیٹھیں گے اور دیکھتے ہیں پرندے کیسے نیچے آتے ہیں، سب لڑکے جھاڑیوں میں چھپ گئے اور وہ لڑکا درخت کے نیچے بیٹھ گیا، پرندے نہیں آئے ، پرندوں کو کیا خبر کہ وہ کون ہے، لیکن وہ بیٹھا رہا شاید وہ اب بھی بیٹھا ہوا اسی درخت سے ٹیک لگائے پرندوں کو دیکھ رہا ہو کہ یہ کب نیچے آ کر اس سے کھیلیں گے۔ وہ پرندے اس کے دوست تھے لیکن وہ نہیں آئے ۔ اور سب لڑکے اس پر ہنسنے لگے تھے۔

وہ لڑکا بہت جھوٹا تھا وہ یہ بھی کہتا تھا کہ میں بہادر ہوں اور میں اکیلا کئی لوگوں سے لڑ سکتا ہوں، چھٹی کے بعد اسی سڑک پر چلتے ہوئے چار لڑکوں نے اس کی خوب دھنائی کی اور اس کی شرٹ کے بٹن بھی توڑ دیے، اسے تھپڑ پڑتا تھا اور وہ زمین پر اپنے بٹن تلاش کر رہا تھا۔ '' ٹھہرو مجھے بٹن اٹھا لینے دو۔ ٹھہرو۔ ایک منٹ ٹھہرو۔ یہ، یہ میری جیب ہے دیکھو، دیکھو۔ جیب چھوڑ دو۔'' جیب بھی پھٹ گئی تھی، بٹن بھی ٹوٹ گئے تھے۔ ''اب بتاؤ تمہیں تو بڑے کراٹے آتے تھے تم تو کئی لوگوں سے لڑ سکتے تھے اب بتاؤ۔'' اور وہ لڑکے چلے گئے اس نے بٹن تلاش کیے، جب سارے بٹن مل گئے تو اسے احساس ہوا کہ اس کی کہنی سے خون بھی بہہ رہا ہے ----

وہ وہیں سڑک کے کنارے بیٹھ کر رونے لگا۔ شاید وہ اب بھی وہیں بیٹھا رو رہا ہو ---- میں بھلا اسے کیسے ساتھ لا سکتا تھا وہ خود بہت ضدی تھا حالاں کہ گاؤں کے حالات اب پہلے سے نہیں رہے تھے۔

ہوا یوں کہ ایک ظالم دیو نے اپنے حامیوں سمیت گاؤں پر قبضہ کر لیا۔ ظلم کی سیاہ رات چھا گئی تھی، سورج نکلتا تھا لیکن دن نہیں ہوتا تھا۔ کالی سیاہ رات میں جس میں کوئی اگر اجالا کرنا چاہتا تو اسے سزا دی جاتی، غریب ڈرے ہوئے لوگ اب آہستہ آہستہ گاؤں چھوڑ کر جا رہے تھے ۔ دیوار و در کو، اب دیمک چاٹ رہی تھی ۔ وہ گاؤں اور وہ گلیاں کہ جو سارا دن بچوں کے شور و غل سے مسکرا رہی ہوتیں، اب ویران ہو کر سسک رہی ہوتیں، حتیٰ کہ وہ کھمبا، جس کے نیچے ہر شام بچے کھیلا کرتے ، اداس تھا۔

سڑک اور زیادہ ٹوٹ گئی تھی اور اس کے ارد گرد جھاڑیاں بھی بڑھنے لگ گئیں تھیں، اب گاؤں میں صرف دیو کے حامی اور چند ہی اور لوگ رہ گئے تھے، اور ظلم و ستم جاری تھا مخالفین کے گھر توڑے جا رہے تھے اور لوگ اس دیو کے خلاف کچھ نہ کر سکتے تھے، غریب لوگ بھلا کر ہی کیا سکتے تھے، وہ ایک شام کہ جب دیو کے کارندے آئے اور ہمیں بھی گھر خالی کرنے کو کہا۔ ہاں وہ گھر کہ جس کی ایک ایک اینٹ محبت سے رکھی گئی تھی، وہ دیواریں جو مکینوں کو جانتی تھیں، مکین دیواروں کو جانتے تھے، وہ گھر خالی کرنا تھے، سو سامان باندھ لیا گیا تھا،

لیکن وہ لڑکا اسی ٹوٹی ہوئی سڑک کے کنارے بیٹھا تھا جہاں اب جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں سکول بند ہوگیا تھا اور وہ ڈاکٹر صاحب جو کڑوی دوائیاں دیا کرتے تھے وہ بھی اب نہ آتے، لیکن پھر بھی وہ لڑکا وہیں بیٹھا تھا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ دیکھو یہ لوگ بہت ظالم ہیں، اب ہمارا گزارہ یہاں ممکن نہیں ہم غریب ناتواں لوگ ان ظالموں کے خلاف کر ہی کیا سکتے ہیں۔ اٹھو میرے پیارے، اب یہاں ویرانیاں ہی ویرانیاں ہیں، یہاں سکول ہے نہ ہسپتال، اور تمہارے سارے دوست بھی اب یہ گاؤں چھوڑ کر جا چکے ہیں سو ہمیں بھی جانا ہوگا پر وہ نہیں مانا اس کا خیال تھا کہ پرندے اس کے دوست ہیں، سو وہ وہیں رہے گا، اور وہ اسی ٹوٹی سڑک پر ہی رہ گیا۔۔۔۔ اور میں شہر آ گیا۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر احمد حسن رانجھا

بھوت بنگلہ

اس نے بوسیدہ کواڑ پہ لاغر ہاتھ کا بوجھ ڈالا۔ کواڑ چر چراتے ہوئے کھل گئے۔ لکڑی کے کواڑ کے ساتھ لگی لوہے کی کنڈی ''کھڑاک''، ''کھڑاک'' کواڑ کے ساتھ بجتی رہی۔ اس نے اندر داخل ہو کر دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ لیے۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ جب سانس لیتا تو اس کے سینے میں سیٹیاں سی بجنے لگتیں۔ جیسے ریل کا انجن کوکتا ہے۔ وہ کمر پہ ہاتھ دھرے صحن میں کھڑا ہے۔ سرونٹ کوارٹر کا صحن۔ یہ سرونٹ کوارٹر کوئی **بھوت** بنگلہ لگتا ہے۔ اسی سال کی عمر میں وہ خود بھی ایک **بھوت** بن چکا ہے۔ لاغر اور کمزور **بھوت**۔ وہ تنہائی کا شکار ہے۔ اس کے ارد گرد سارا دن ایک ملازم کے سوا کوئی نہیں پھٹکتا۔ وہ تنہا ہے۔ وہ تو ایسا **بھوت** ہے جو کسی کو ڈرا بھی نہیں سکتا۔ وہ کمر سے ہاتھ اٹھاتا ہے تو کمر کچھ اور جھک جاتی ہے۔ اس کے ہاتھوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ کپکپی سی پھیل جاتی ہے۔

اس کی نظر کمزور ہو چکی ہے۔ ایک موٹے شیشوں کی پرانی عینک اس کے پاس ہے۔ اس عینک کے شیشوں پر گرد تہہ در تہہ جم چکی ہے اور شیشے دھندلا چکے ہیں۔ عینک کی ایک کمانی درمیان سے ٹوٹ چکی ہے۔ اس نے جھاڑو کا تیلا رکھ کر اوپر دھاگا باندھ دیا ہے۔ اس بوجھ کی وجہ سے عینک ایک طرف جھکی رہتی ہے۔ یہ عینک اس کی نظر کی کمی کو کسی طور پورا نہیں کرتی۔ یہ بس اس کی تنہائی کی ساتھی ہے۔ اس کی صفائی میں کچھ لمحے بیت جاتے ہیں۔ زندگی **موت** کی طرف دو قدم آگے بڑھ جاتی ہے جیسے ٹرین نے دو اسٹیشن پار کر لیے ہوں۔

بھوت بنگلے کے صحن میں اس کی ٹوٹی پھوٹی چارپائی پہ کوئی بیٹھا ہے۔ یہ کون ہے؟ وہ جھکی کمر کے ساتھ دو قدم آگے بڑھا۔ اس نے آنکھیں سکیڑیں ہتھیلی کا چھجا بنا کے پیشانی پر رکھا۔ اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ چارپائی پہ وہ خود ہی بیٹھا تھا یا اس کا کوئی ہم شکل، اس نے اپنا جسم ٹٹولا۔ وہ تو اپنی جگہ پر موجود تھا، سامنے کون تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا چارپائی پہ جا کے بیٹھ گیا۔ اب اس کا ہم شکل بوڑھا دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اندر آ کر وہ رک گیا۔ اس نے پیشانی پہ ہاتھ رکھا اور بغور اسے دیکھنے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ کواڑ کھلے۔ ملازم شبیر حسین اندر داخل ہوا۔ اس نے ہاتھ میں ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ شبیر کے اندر آتے ہی بوڑھے کی شبیہ غائب ہو گئی۔ شبیر نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے چارپائی کی پائنتی کی طرف رکھ دی۔ ٹرے کے اندر سٹیل کا گلاس رکھا تھا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور صحن میں ایک طرف لگے نلکے کی طرف بڑھا۔ اس نے نلکا چلایا۔ نل سے پانی کی دھار بہہ نکلی اس نے بہتے پانی کے ساتھ گلاس صاف کیا۔ پانی

بھرااور واپس چارپائی کے پاس آ گیا۔ "بابا جی آپ کی آنکھیں سرخ ہیں؟ سوجھی ہوئی بھی ہیں۔"

"ہاں......" اس نے مختصر جواب دیا۔

"لگتا ہے رات بھر سوئے نہیں......" اس نے پانی کا گلاس بابا جی کو پکڑایا۔

"اوئے پتر اس عمر میں سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ سب دور دور رہتے ہیں۔ اوئے نیند بھی پرائی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی پھیرا ڈالتی ہے۔" بابا جی کی آواز میں لرزش تھی۔ ابھی اس کی بات جاری تھی کہ اسے چکر سا آ گیا۔ وہ لہرا کے چارپائی پر گرنے ہی لگا تھا کہ شبیر نے اسے تھام لیا۔ بابا جی کے جسم کا لمس اسے اپنے بازوؤں پہ محسوس ہوا۔

"آپ کو تو بہت سخت بخار ہے۔" شبیر کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"اوئے پاگلا! بڑھاپے میں بیماری ہی تو سب سے زیادہ وفاداری دکھاتی ہے۔ ساتھ ساتھ رہتی ہے قریب قریب پھرتی ہے۔ قبر تک ساتھ نبھاتی ہے۔" بابا جی کو کھانسی کا دورہ پڑا۔

"آپ کھانا کھائیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کو بلا کے لاتا ہوں۔" اتنا کہہ کر شبیر چلا گیا۔

اس کے سامنے ٹرے میں ایک میلی کندوری کے اندر روٹیاں لپٹی تھیں۔ ٹھنڈی روٹیاں۔ سٹیل کی پلیٹ میں تھوڑا سا بچا کھچا سالن تھا۔ وہ سالن بھی اس کی ضرورت سے زیادہ تھا۔ اس نے دو تین نوالے منہ میں ڈالے۔ اس کا دل کھانا کھانے کو نہیں کر رہا تھا۔ اسٹیل کا گلاس اس نے منہ سے لگایا۔

پانی کے دو چار گھونٹ لیے۔ ٹرے نیچے زمین پر رکھ کر وہ چارپائی پہ لیٹ گیا۔ بوسیدہ چارپائی اس کے نحیف جسم کا زور پڑنے پر چرچرا اٹھی۔ وہ لیٹا رہا۔ کافی دیر گزر گئی۔ کوارٹر کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ کھلے دروازے سے گھر کا پالتو کتا موتی اندر آ گیا تھا۔ اس نے چارپائی کے اردگرد چکر کاٹا۔ کھانے کی پلیٹ کو چاٹتا رہا۔ گلاس سونگھا۔ منہ اٹھا کے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر باہر نکل گیا۔

دس منٹ گزرے اور شبیر اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ پینٹ شرٹ میں ملبوس خوش شکل ڈاکٹر تھا۔

"ڈاکٹر صاحب! کریم صاحب کو بخار ہے جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا، ان کا بدن تپ رہا ہے۔" شبیر جو بات کو بار بار دہراتا تھا۔ کلینک سے لے کر اب تک چوتھی مرتبہ ڈاکٹر کو بتا رہا تھا۔ ایک بار بتا کے وہ بھول جاتا تھا۔ پھر جب وہ بات بتاتا تو اسے لگتا کہ وہ پہلی مرتبہ بتا رہا ہے۔ بتاتے ہوئے اسے اچانک یاد آ جاتا کہ یہ بات تو وہ پہلے بھی بتا چکا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کریم بابا کا ہاتھ تھاما۔ ہاتھ کافی گرم تھا۔ انہوں نے پیشانی کو چھوا۔ پیشانی بھی تپ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے بیگ میں سے تھرمامیٹر نکال کر اس کے منہ میں ڈال دیا۔ نبض پر ہاتھ رکھ کر اس نے نظریں گھڑی پر جما دیں۔ نبض معلوم کرنے کے بعد انہوں نے بلڈ پریشر ماپا۔ بیگ میں سے نکال کے ٹیکہ لگایا اور پیڈ پر کچھ دوائیں لکھ کر شبیر کے حوالے کیں۔

"یہ دوائیں لا کر باقاعدگی سے کھلا دینا۔ امید ہے دو تین دن میں ٹھیک ہو جائیں گے۔" ڈاکٹر نے اتنا کہہ کر بیگ سمیٹا اور باہر نکل گیا۔ شبیر اسے کلینک تک چھوڑنے گیا۔ واپسی پر وہ دوائیں بھی لیتا آیا۔

"کریم صاحب! میں نصیر صاحب کو بتاؤں گا کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔ آپ یہ دوائیں کھا لیجیے گا۔"

بابا جی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ شبیر نے گلاس دھویا بھی نہیں تھا۔ وہی گلاس جسے کچھ دیر پہلے موتی سونگھ گیا تھا، اس نے پانی کا بھرا ہوا گلاس چارپائی کے قریب رکھ دیا۔

وہ بدستور چارپائی پہ لیٹا ہے۔ کوارٹر کے صحن میں چارپائی ہے۔ کوارٹر کے دو کمروں میں کاٹھ کباڑ اور پرانا استعمال شدہ سامان رکھا ہے۔ ایک کمرے میں وہ رہتا ہے۔ وہ بھی تو کاٹھ کباڑ کی ہی حیثیت رکھتا ہے۔ جتنا فائدہ اس کی اولاد اس سے اٹھا سکتی تھی اٹھا چکی۔ اب وہ ان پہ بوجھ بن چکا تھا۔ بے فائدہ بے مصرف بوجھ۔ وقت کی بساط پر فقط ایک پٹا ہوا مہرہ تھا۔ وہ ایسی بیساکھی کی حیثیت رکھتا ہے جسے استعمال کرتے ہوئے اس کی اولاد اپنی منزل تک پہنچ چکی تھی۔ اب اسے ایک کونے میں پھینک دیا گیا تھا۔ وقت بھی تو انسان کا تعاقب کرتا ہے۔ پیچھے پیچھے آتا ہے۔ سائے کی طرح ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ چالیس سال پہلے وہ اس گھر کا مختارِ کل تھا۔ اس وقت بھی یہ کوارٹر یہیں اسی جگہ موجود تھا۔ اس کے عالی شان بنگلے کے عقب میں۔ بنگلے کی سنگ مرمر کی اونچی دیواروں سے پھسل کر نظریں کبھی اس کے عقب میں واقع اس کوارٹر تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ چالیس سال قبل اس نے اپنے باپ کو بھی ایک بوجھ سمجھ کر اسی صحن میں لا کر اتار دیا تھا۔

وہ چارپائی پر لیٹا ہے۔ اس کی نظریں آسمان کو گھور رہی ہیں۔ آسمان پر تارے مدھم لو کے ساتھ جل رہے ہیں۔ تاروں کی مدھم روشنی شاید وقت کے ساتھ اس کی آنکھوں کی طرح مدہم ہو گئی ہے۔ اسے کم کم دکھتا ہے۔ چارپائی پہ لیٹتے ہوئے اس نے دھندلے شیشوں کی عینک بھی اتار دی تھی۔ مدہم لو کے ساتھ چمکتے تارے۔ اس نے گردن گھما کے کمروں کی طرف دیکھا۔ سو واٹ کے بلب کی پیلی روشنی اس کے چبوترے پر پھیلی تھی اور صحن سے ہو کر داخلی دروازے تک جا رہی تھی۔

کمروں کے سامنے چبوترے پر اس کا ہم شکل بوڑھا بیٹھا ہے۔ اس نے عینک لگا کے غور سے دیکھا وہ اس کا بوڑھا باپ تھا جسے چالیس سال قبل اس نے یہاں دھکیلا تھا۔ اس نے گردن گھما کے دروازے کی طرف دیکھا۔ سو واٹ کے بلب کی پیلی یرقان زدہ روشنی میں اس نے دیکھا کہ دروازے سے نصیر اندر داخل ہو رہا ہے۔ شاید وہ اس کا پتا کرنے آیا ہے۔ اس نے سوچا یہ نصیر کی کمر کیوں جھکی ہے اور اس نے ہاتھ کمر پہ کیوں رکھے ہوئے ہیں۔ اس نے کپڑے کیوں پھٹے پرانے پہن رکھے ہیں۔ اس کی آنکھوں پہ دھندلے شیشوں کی عینک بھی ہے۔ یہ نصیر یک دم بوڑھا کیوں ہو گیا ہے۔ یہ پیشانی پہ ہاتھ رکھے اسے گھور کیوں رہا ہے۔ یہ کوارٹر اس کے لیے وقت کا بھوت بنگلہ بن چکا ہے۔ اس کی عینک کے دھندلے شیشوں کے سامنے کبھی چالیس سال پیچھے کبھی چالیس سال آگے کی شبیہیں ابھرتی رہتی ہیں۔

نازیہ خلیل عباسی

کسک

“اٹھ ری نجو! اٹھ۔ دیکھ، سورج سر پہ آچکا اور تو اب تک پڑی سوتی ہے۔ جانا نہیں ہے کیا تو نے کام پہ آج؟”۔ نجو کی ماں بختو سر پر دوپٹہ باندھے نجو کو آواز دے رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ چائے بھی بنا رہی تھی۔ مٹی کے چولہے سے نکلنے والا دھواں کافی حد تک جھونپڑی کے اندر بھی تھا۔ نجو نے بڑی آہستگی سے بوجھل آنکھیں کھولیں۔ شب بھر جاگنے کے بعد ابھی تو اس کی آنکھ لگی تھی۔ رات بھر کروٹیں بدلتی رہی لیکن نیند کی پری بھی اس کی خوشیوں کی طرح کہیں چھپ گئی تھی۔ بڑی بے دلی سے وہ اٹھی۔ قریب پڑا دوپٹہ سر پہ رکھا پھر وہ جھونپڑی سے باہر نکل آئی۔

بختو ابھی تک اس کو جلد اٹھنے کی تاکید کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اس نے نجو کے ہاتھ میں چائے کا پیالہ تھما دیا۔ “کچھ کھانے کو نہیں ہے، ماں؟”۔ نجو نے قدرے چیختے ہوئے پوچھا۔ “کیا ہو گیا ہے تجھے؟ کہاں سے لاؤں میں تیرے کھانے کے لیے؟ کل بھی تو کام پہ نہیں گئی اور اس سے پہلے بھی تو نے کام سے چھٹی کی۔ گھر دو پیسے آئیں گے تو کچھ بنے گا اور تیرے تو آج بھی تیور کام پہ جانے کے نہیں ہیں۔” بختو نے ایک ہی سانس میں سب سنا ڈالا۔

“یہ بھی لے لے، ماں! نہیں چاہیے مجھے تیری یہ چائے۔” بختو نے کونے میں پڑا چوڑیوں کا ٹوکرا سر پہ رکھا اور ساتھ والی جھونپڑی سے شانو کو آواز دی۔ وہ بھی چوڑیوں کا ٹوکرا سر پہ اٹھائے باہر نکل آئی۔ بختو خود کو کوسنے لگی کہ نجو آج بھوکی چلی گئی لیکن نجو کو دینے کے لیے اس کے پاس تھا ہی کیا۔ نجو سر پہ چوڑیوں کا ٹوکرا اٹھائے بستی سے کافی دور آ گئی تھی۔ شانو اس کے ساتھ تھی۔

“کیا بات ہے، نجو! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟”۔ شانو نے بڑے پیار سے پوچھا۔ “ہاں ٹھیک ہوں، مجھے کیا ہونا ہے۔ ویسی ہی ہوں جیسے ہمیشہ سے تھی۔” نجو کی عمر تو جوانی کی تھی لیکن اپنے احساس میں وہ خود کو بوڑھی سمجھنا شروع ہو گئی تھی۔ حالات کی تلخی نے بچپن اور بڑھاپے کے درمیان کی عمر سے اسے ناآشنا سا کر دیا تھا۔ نہ کبھی شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر سنگھار کیا، نہ کبھی گنگنائی۔ ایک عجیب سے کیفیت تھی جو اس کے لہو میں گردش کرتی رہتی تھی۔ ایک آگ تھی جو اس کے اندر دہکتی رہتی تھی۔ کبھی یہ آگ مدھم ہوتی اور کبھی اس کی روح تک کو جھلسا کے رکھ دیتی۔ احساس کی اس تپش نے اسے آج بھی سونے نہیں دیا۔ رات بھر کی تھکاوٹ اب بھی اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ شانو پھر کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن نجانے کیوں ہمت نہیں کر پا

رہی تھی اور وہ چپ ہو گئی ۔ اب وہ دونوں شہر کی پختہ گلیوں میں داخل ہو گئیں اور شانو نے آواز لگائی ۔ چند گھروں میں سے عورتوں نے شانو اور نجو سے چوڑیاں لیں ۔ اب نجو پہلے سے کچھ بہتر لگ رہی تھی ۔

چلتے چلتے دوپہر ہو گئی ۔ نجو کو بھوک نے ستایا تو دونوں نے تندور سے روٹیاں لیں ۔ شانو گھر سے تھوڑا سا سالن لے آئی تھی ۔ شہر کی تنگ گلیوں سے نکل کر اب وہ کھلی سڑکوں پہ آ گئیں، جو کافی سنسان تھیں ۔ گھنے درخت کا سایہ دیکھ کر دونوں ایک کوٹھی کے گیٹ کے باہر کنارے پر بیٹھ گئیں اور کھانا کھانے لگیں ۔ نجو کی تمام تر توجہ کھانے پر تھی ۔ شانو نجو سے کہنے لگی ۔ ''دیکھ، نجو! ہمارے آس پاس کتنی خوبصورت کوٹھیاں ہیں ۔ یہاں کے رہنے والے لوگ بھی کتنے خوبصورت ہیں ۔ نجو! کیا تیرا جی نہیں چاہتا کہ تو بھی کسی ایسے ہی بڑے گھر میں رہے! سچی، میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں کسی بڑے سے گھر میں بیگم صاحبہ بن کر رہوں ۔'' شانو نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے کہا، جیسے سچ مچ وہ کسی بڑے گھر کی بیگم صاحبہ بن گئی ہو ۔ نجو کے چہرے پہ تلخ سی مسکراہٹ تھی ۔ ''دیکھ، شانو!'' نجو نے شانو کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ۔ ''میں نے کبھی کسی خوبصورت بڑے عالی شان گھر کی خواہش نہیں کی ۔ ٹھیک ہے دولت میں بہت کشش ہوتی ہے لیکن مجھے کسی چھوٹے مگر محفوظ گھر کی تلاش ہے ۔ نہ جانے کیوں اس زندگی سے نفرت سی ہو گئی ہے ۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میں یہ زندگی نہیں گزار رہی، زندگی مجھے اپنے ساتھ بہائے لے جا رہی ہے ۔'' ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک خوبصورت گاڑی آ کر رکی ۔ شانو اور نجو نے پلٹ کر دیکھا تو گاڑی میں ایک لڑکا اور لڑکی سوار تھے ۔ ہارن کی آواز سے گیٹ کھلا اور گاڑی اس خوبصورت گھر کے اندر داخل ہو گئی ۔ گیٹ کھولنے والا جو شاید چوکیدار تھا ۔ اس نے شانو اور نجو کو ڈانٹتے ہوئے یہاں سے اٹھ جانے کا کہا ۔ دونوں نے ٹوکرے اپنے اپنے سر پر رکھے اور چلنے کو اٹھنے ہی لگیں تھیں کہ دوبارہ سے وہی چوکیدار باہر نکلا اور کہا کہ تم دونوں کو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں ۔ شانو کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔ دونوں چوکیدار کے پیچھے چل دیں ۔ چوکیدار نے انہیں لان میں بٹھایا اور خود گھر کے اندر چلا گیا ۔ تھوڑی دیر بعد وہی لڑکی لان میں آئی ۔ یہ لڑکی نجو اور شانو کی تقریباً ہم عمر تھی ۔ لڑکی نے شانو اور نجو کے ٹوکرے میں پڑی چوڑیاں دیکھیں ۔ ابھی وہ دیکھ ہی رہی تھی کہ وہ لڑکا بھی لان میں آ گیا، وہ بھی چوڑیاں دیکھنے لگا ۔ پھر اس نے نجو کے ٹوکرے سے ہرے رنگ کی چوڑیاں اٹھائیں اور لڑکی کو دیتے ہوئے کہنے لگا کہ یہ چوڑیاں تمھاری کلائی پر بہت سجیں گی ۔ ''کتنا خوبصورت رنگ ہے ۔'' لڑکی نے چوڑیاں لے لیں ۔ ان کی باتوں سے شانو اور نجو کو معلوم ہوا کہ یہ دونوں میاں بیوی ہیں ۔ لڑکی نے اور بھی چوڑیاں خریدیں اور ان دونوں کو چوڑیوں کی قیمت کے علاوہ بھی کچھ پیسے دیے ۔ دونوں کوٹھی سے باہر آئیں تو شانو بہت خوش نظر آ رہی تھی ۔ شانو بے اختیار نجو سے کہنے لگی: ''کتنا اچھا لگ رہا تھا ناں نجو ۔ میں نے کہا تھا ناں کہ یہ گھر صرف باہر سے ہی خوبصورت نہیں لگتے اندر سے تو اور بھی خوبصورت ہوتے ہیں ۔'' نجو نے شانو کی بات جیسے سنی ہی نہ ہو اور کہنے لگی ''شانو! جب میں اور تم باہر نکلتے ہیں تو ہر نظر مجھے تیر کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔ نفرت ہے مجھے اس ذلت بھری

زندگی ہے۔" نجو کی آواز پھٹ سی گئی اوراس نے شانو کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ایسے خواب نہ دیکھا کر شانو کہ جن کی کوئی تعبیر نہ ہو۔ہم جھونپڑے میں رہنے والے لوگوں کو اتنے سہانے خواب زیب نہیں دیتے۔یہی ہمارا مقدر ہے، اتنا نہ سوچا کر۔" شانو، نجو کو بوڑھی عورتوں کی طرح باتیں کرتا دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دی۔

واپسی پر بستی میں داخل ہوتے ہی نجو کی نظر وزیرے پہ پڑی۔وہ ہمیشہ کی طرح اس کے استقبال کے لیے کھڑا تھا۔نجو اسے نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔اپنے جھونپڑے میں پہنچ کر اس نے ایک کونے میں ٹوکرا رکھا اور چپ چاپ جا کر لیٹ گئی۔نجو کی ماں نے پیالے میں پانی ڈالا اوراس کے پاس آ گئی۔ "کیا بہت تھک گئی ہے رے تو آج نجو!" بختو نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے پانی دیتے ہوئے پوچھا۔نجو نے ایک ہی سانس میں سارا پانی پی لیا اور خاموشی سے سارے پیسے بختو کے ہاتھ پر دھر دیے۔وہ پیسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ "آج تو تیری اچھی دیہاڑ لگ گئی۔نجو! میں تیری پسند کی چیزیں پکاؤں گی آج۔" نجو کی ماں کے چہرے پر خوشی کے واضح تاثرات تھے۔اس نے بھی پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آنکھیں موند لیں۔

تھکی ہاری نجو کھانا کھانے کے بعد تکیے پر سر رکھتے ہی سو گئی۔صبح صبح شانو نے آ کر نجو کو آواز دی اور دونوں اپنے اپنے ٹوکرے اٹھائے اب بستی سے کافی دور آ گئی تھیں۔نجو آج بھی کافی پریشان تھی۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنا کیوں سوچتی ہے؟ نجو کو گھر سے باہر نکلنا سارا سارا دن گلیوں اور سڑکوں پر آوازیں لگانا کسی ذلت سے کم نہیں لگتا تھا۔شانو کی طرح وہ کسی بڑے عالی شان گھر کی خواہش مند ہرگز نہیں تھی۔اسے ایک چھوٹے سے محفوظ گھر اور کسی ایسے سہارے کی تمنا تھی جو اس کی عزت کرے، اسے اس کے مقام سے نوازے اور بس۔لیکن نجو کے خاندان میں اس قسم کی کوئی ریت روایت سرے سے تھی ہی نہیں۔نجو ہر طرح کی محنت کر سکتی تھی لیکن عزت ووقار کے ساتھ۔انہی سوچوں میں گم وہ چپ چاپ چلی جا رہی تھی کہ شانو نے اسے سڑک پار کرنے کا کہا۔وہ سڑک پار کرنے لگی کہ اچانک موڑ سے آنے والی گاڑی نجو سے جا ٹکرائی۔چوڑیوں کا ٹوکرا نجو کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ گر گئی۔شانو، جو، نجو کے پیچھے تھی جلدی سے آگے بڑھی اور نجو کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔گاڑی کا ڈرائیور گھبرا کر گاڑی سے اترا۔شانو اس پر برس پڑی۔ "اندھا ہے کیا؟ نظر نہیں آتا تجھے۔ ارے موڑ نہیں چلانی آتی تو کیوں سڑکوں پر دندناتا پھر رہا ہے۔ہائے تو نے تو ساری چوڑیاں بھی توڑ دیں۔" شانو نے سڑک پہ بکھری ہوئی چوڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔اس سے پہلے کہ ڈرائیور کچھ کہتا، گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص نے ڈرائیور کو بلایا اوراس کے ہاتھ میں پانچ سو کا نوٹ تھماتے ہوئے شانو اور نجو کی طرف اشارہ کیا۔شانو نے ڈرائیور سے نوٹ لیا اور نجو کی طرف بڑھا دیا لیکن نجو نے نوٹ لینے سے انکار کر دیا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھے ہوئے شخص سے مخاطب ہوئی۔ "نہیں صاحب! غلطی میری تھی کہ میں ایک دم سے گاڑی کے سامنے آ گئی۔" اور وہ پھر کچھ کہے سنے بغیر ٹوکرا اٹھا کر چل دی۔جاتے ہوئے نوٹ اس

شخص کی گود میں ایسے پھینک گئی جیسے اس نوٹ کی کوئی وقعت ہی نہ ہو ۔ ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا اور سامنے والی عالی شان کوٹھی میں داخل ہو گیا ۔ شانو پلٹ پلٹ کر جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھتی رہی ۔ “نجو تو ٹھیک تو ہے ناں ۔” شانو نے بڑے دھیمے لہجے میں پوچھا ۔ “ہاں شانو! ٹھیک ہوں ۔” نجو نے قدرے لاپرواہی سے جواب دیا ۔ تمام راستے شانو ڈرائیور اور اس کے صاحب کو برا بھلا کہتی رہی ۔ آج دونوں شام ہونے سے ذرا پہلے ہی لوٹ آئی تھیں ۔ وزیرا ہمیشہ کی طرح اپنی مخصوص جگہ پر کھڑا خاموشی سے نجو کو گھور رہا تھا ۔ ایک پل کے لیے نجو بھی رک گئی ۔ پھر نجانے کیا سوچ کر آگے چل دی ۔ بختو نے نجو کو دیکھا تو کہنے لگی ۔ “آج تو جلدی آ گئی ۔ کیا ہوا؟” ۔ “ہونا کیا ہے ماں! کچھ بھی تو نہیں ۔” بختو نے اس کو زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا اور گھر کے کام کاج میں لگ گئی ۔ نجو خاموشی سے بیٹھ کر ہاتھوں کی لکیروں کو غور غور سے گھورنے لگی ۔ اتنے میں شانو بھی آ گئی اور دن کو ہونے والے واقعے کے بارے میں بختو کو بتایا ۔ شانو کی باتیں نجو کے باپ نے بھی سن لیں ۔ بختو تو خاموش رہی لیکن نجو کا باپ نجو پر برس پڑا اور اسے پیسے نہ لینے پر ڈانٹنے لگا ۔ نجو کو اور کیا چاہیے تھا ۔ سلگتے ہوئے شعلوں کو ذرا سی ہوا لگی اور آگ بھڑک اٹھی ۔ نجو کی آنکھوں میں جتنا دریا تھا سب بہہ نکلا ۔

اس نے سوچا کہ زندگی کی گاڑی بغیر رکے ایک ہی ڈگر پر چلی جا رہی تھی ۔ روتے روتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی ۔ صبح جب شانو اسے بلانے آئی تو وہ کافی شرمندہ سی لگ رہی تھی ۔ اسے رات والے واقعے کا علم تھا اور نجو کی سوجھی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی جھک گئیں ۔ نجو سب کچھ سمجھ گئی اور کہنے لگی ۔ “شانو! پگلی، تیرا تو مجھ پر احسان ہے ۔ کافی دنوں سے میں رونا چاہتی تھی اور ابا کے ڈانٹنے کا مجھے کوئی دکھ نہیں ہوا ۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ۔” اس نے شانو کو تسلی دی اور وہ پھر اپنے اپنے ٹوکرے سر پر اٹھائے اب بستی سے کافی دور نکل آئیں ۔ عید کا دن قریب آ رہا تھا ۔ اس لیے آج دونوں نے شام کو دیر سے گھر آنا تھا ۔ وہ دونوں جب اس کوٹھی کے سامنے سے گزریں تو شانو بے اختیار پھر سے کل والے واقعہ پر ڈرائیور اور اس کے صاحب کو برا بھلا کہنے لگی ۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئی تھیں پھر سے وہی کار ان دونوں کے قریب آ کر رکی ۔ لیکن آج صرف ڈرائیور کار میں تھا ۔ اس کا صاحب نہیں ۔ “کیا پھر ٹکر مارنی ہے ہمیں، اے ابھی تک تجھے چین نہیں آیا، ٹھنڈ نہیں پڑی تیرے کلیجے میں ۔” شانو نے ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ دیا لیکن ڈرائیور جو کہ عمر میں تئیس چوبیس سال کے لگ بھگ تھا گاڑی سے نیچے اترا اور شانو کو کوئی جواب دیے بغیر نجو سے مخاطب ہوا ۔ “مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ۔ کل میری غلطی سے گاڑی تجھ سے ٹکرا گئی اور تیری چوڑیاں بھی ٹوٹ گئیں جس کا مجھے بے حد افسوس ہے ۔ میں ایک معمولی ڈرائیور ہوں، تیری زیادہ مدد تو نہیں کر سکتا لیکن اپنی خوشی سے تجھے کچھ پیسے دینا چاہتا ہوں ۔ انکار نہ کرنا ۔” “غلطی میری تھی ۔” نجو نے جواب دیا ۔ “دیکھ جو بھی ہوا، برا ہوا ۔ دل خراب نہ کر اور یہ پیسے رکھ لے ۔” یہ کہتے ہوئے اس نے نجو کو پیسے تھمائے اور گاڑی سٹارٹ کر کے چلا گیا ۔ نجو نے بہت چاہا کہ وہ انکار کر دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی ۔ سارا دن دونوں شہر کی مختلف گلیوں اور سڑکوں میں چوڑیاں بیچتی رہیں ۔ جب شام

آہستہ آہستہ گہری ہونے لگی تو ان دونوں نے اپنی بستی کا رخ کیا۔ آج وزیرا ہمیشہ کی طرح نجو کے استقبال کے لیے وہاں نہیں آیا تھا۔ ”کیا ہوا تیرے بھائی کو“۔ نجو نے شانو سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اسے رات کو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ ”پتہ نہیں، اب کیا حال ہو گا اس کا۔“ شانو نے جواب دیا۔ رات کو بختو نے نجو کو بتایا کہ وہ وزیرے کو دیکھنے جا رہی ہے۔ واپس آ کر اس نے نجو کو بتایا کہ وزیرا بہت بیمار ہے اسی لیے شانو صبح اس کے ساتھ کام پہ نہیں جا سکے گی۔ اگلی صبح نجو کو اکیلے ہی جانا پڑا۔ آج گھر سے نکلتے ہوئے وہ کل ملنے والے ڈرائیور کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آج پھر وہ اُسے ملا لیکن نجو نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے دیکھا ہی نہیں۔ آج وہ پیدل تھا اچانک وہ نجو کے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ ”آج تیری لڑاکا سہیلی نہیں آئی؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔ ”نہیں۔ اس کا بھائی بیمار ہے۔“ نجو نے لاپرواہی سے کہا۔ پھر اس نے نجو سے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور چلا گیا۔ نجو کافی دن اس ڈرائیور سے ملتی رہی جس کا نام نصیر تھا۔ اس دوران میں شانو کام پر نہ گئی، ایک دن نصیر نے نجو کو بتایا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ نجو کی تو جیسے سانس رک گئی لیکن نصیر بولتا ہی چلا گیا۔ وہ نجو کو ایک ایسے گھر میں لانا چاہتا تھا جس کے وہ خواب دیکھا کرتی تھی۔ چھوٹا سا گھر جہاں وہ عزت سے رہ سکے لیکن نجو نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے چل دی۔ ساری رات وہ نصیر کے بارے میں سوچتی رہی۔ صبح صبح وہ اٹھی اور شانو کی جھونپڑی میں گئی۔ وزیرا اب کافی بہتر تھا۔ شانو نے اسے بتایا کہ وہ کل سے اس کے ساتھ کام پر جائے گی۔ نجو آج پھر اکیلی کام پہ چلی گئی۔ بستی سے کافی دور اس نے نصیر کو اپنا منتظر پایا۔ نجو نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ یہ ناممکن ہے کیوں کہ ان کے ہاں برادری سے باہر رشتہ نہیں دیا جاتا۔ نصیر نے اس کی ایک نہ سنی اور نجو کو بتایا کہ اس کی ماں گاؤں سے آئی ہے اور آج شام وہ تمھارے گھر رشتہ مانگنے آئے گی۔ نجو نے بہت منع کیا لیکن نصیر نے اس کی ایک نہ مانی اور چلا گیا۔ نجو آج شام سے کچھ پہلے ہی گھر آ گئی۔ ابھی اسے آئے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ نصیر اور اس کی ماں آ گئے۔ بستی کا ہر فرد نصیر اور اس کی ماں کو گھور رہا تھا۔ آخر نصیر کی ماں نے بختو کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا۔ بختو نے سختی سے انکار کر دیا اور بے رخی سے بولی کہ وہ دوبارہ یہاں کبھی نہ آئیں۔ نجو کا باپ اس وقت گھر پہ نہیں تھا۔ نصیر اپنی ماں کو لے کر جھونپڑی سے نکل آیا۔ راستے میں اس نے نجو کو کھڑا دیکھا تو رک گیا۔ نصیر کی ماں کچھ آگے جا کر ٹھہر گئی۔ نصیر نے نجو کو بتایا کہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کے گھر والے اس رشتے سے انکار نہیں کریں گے لیکن اب بھی وہ اپنی بات پر قائم ہے اس لیے ٹھیک دو دن بعد وہ اس کا رات دس بجے انتظار کرے گا اور پھر دونوں اپنی الگ دنیا بسا لیں گے۔ نجو سے جب نصیر بات کر رہا تھا تو اسے وزیرے نے دیکھ لیا۔ جب نجو کی نظر وزیرے پر پڑی تو وہ نصیر کو کوئی جواب دیے بغیر اپنی جھونپڑی میں آ گئی۔ بختو نجو پر برس پڑی لیکن وہ بالکل خاموش رہی۔ ٹھیک دو روز بعد عید تھی۔ نجو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اگلی صبح بختو نے نجو کو کام پر نہ جانے دیا اور شانو بھی نہیں گئی۔ بختو نے نصیر کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ شام کو ہی شانو بستی کے ایک بزرگ کے ساتھ نجو کے گھر آئی۔ جنھوں نے وزیرے کے لیے نجو کا ہاتھ مانگا۔ شانو کے ماں باپ

دونوں فوت ہو چکے تھے۔ اسی لیے شانو نے بھائی کے رشتے کے لیے بستی کے بزرگ کو ساتھ لے لیا۔ شانو نے بتایا کہ وہ کسی اچھے موقع کی تلاش میں تھی کہ اس معاملے پر نجو سے پہلے خود بات کر لیتی لیکن اس کے بھائی وزیرے کے بے حد اصرار پر اسے آنا پڑا۔ بختو کو اور کیا چاہیے تھا۔ وزیرا چوں کہ برادری کا لڑکا تھا بختو نے فوراً ہامی بھر لی اور عید کی شام کو ہی نجو کی وزیرے سے منگنی ہو گئی۔ رات کو جیسے جیسے تاریکی بڑھنے لگی نجو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ جا سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ نصیر اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ نجو ہمت کر کے اٹھی۔ اس سے پہلے کہ وہ جھونپڑی سے باہر قدم رکھتی اس کی نظر اپنی ماں کے چہرے پر پڑی جس کے چہرے پر اسے عجیب سی معصومیت کا احساس ہوا۔ پھر اس کی نظر باپ کے چہرے پر پڑی جس کی آنکھیں تو بند تھیں لیکن چہرے سے کرختگی برس رہی تھی۔ ’’اگر میں چلی گئی تو ابا ماں کو قتل کر دے گا اور بستی والے بھی ابا کو نہیں چھوڑیں گے۔ اللہ، میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں۔ نہیں میں اتنی خود غرض نہیں ہو سکتی۔‘‘ نجو کے دماغ میں آندھیاں سی اٹھنے لگیں اور وہ صدیوں کے تھکے ہارے مسافر کی طرح بیٹھ گئی۔ شانو سے کی ہوئی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ ’’شانو! ایسے خواب نہ دیکھا کر جن کی کوئی تعبیر نہ ہو۔‘‘ یہ باتیں یاد آتے ہی نجو چپ چاپ جا کر لیٹ گئی۔ اس بات کو کافی دن گزر گئے اور پھر نجو اور وزیرے کی شادی ہو گئی۔ نجو کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، ہاں جھونپڑی ضرور بدل گئی تھی۔

اب پھر سے وہ اور شانو سر پر چوڑیوں کا ٹوکرا اٹھا کر گلی کوچوں میں آوازیں لگاتے ہیں لیکن اب نجو کا کوئی منتظر نہیں ہوتا۔

☆☆☆☆

سلمان باسط

کھاریاں اور میرے اساتذہ

کھاریاں کینٹ، کمالیہ سے طویل مسافت پر واقع تھا۔ ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم کھاریاں کینٹ پہنچے تو رات کافی بیت چکی تھی۔ ابا جی اپنی سرکاری مصروفیات کے باعث پہلے سے ہی وہاں موجود تھے۔ ابا جی کے ایک دو کولیگ اور کچھ ملازمین ہمارے ہمراہ تھے۔ رات کے اس مہیب سناٹے میں ایک جگہ گاڑی میں امی جی کو اور مجھے چھوڑ کر ڈرائیور اور باقی افراد بھائی جان کے ہمراہ ہمارے نئے گھر کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ گیدڑوں کے بولنے کی آوازوں نے ماحول کو اور بھی ہولناک بنا دیا۔ تاریکی، ہیبت ناک سناٹے اور کبھی کبھی گیدڑوں کی آوازیں اردگرد کی ویرانی اور میرے اندر خوف میں اضافہ کر رہی تھیں۔ امی جی بھی اندر سے اس دہشت ناک ماحول کے باعث پریشان تھیں مگر مجھے حوصلہ دیتی جا رہی تھیں۔ بھائی جان اور باقی تمام افراد کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ میرے حوصلے کی دیوار منہدم ہونے کو تھی کہ ابا جی کی آواز آئی، ''آ گیا میرا بیٹا؟'' میں لپک کر ابا جی کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے لگا ساری تاریکی چھٹ گئی ہے اور روشنی اور تحفظ کا اجلا احساس ہر طرف پھیل گیا ہے۔ کچھ ہی دیر میں ہم نئے گھر میں پہنچ گئے۔ یہ ایک سرکاری مکان تھا جو کالج کی طرف سے ابا جی کو الاٹ ہوا تھا۔ چاروں جانب فوجیوں کی رہائشوں میں گھری یہ پروفیسرز کالونی تھی۔ اب ٹرک سے سامان اتارنے کا مرحلہ شروع ہوا۔ کچھ دیر تو میں نے بھی حتی المقدور خوشی خوشی ہاتھ بٹایا مگر پھر نیند مجھے تھپک تھپک کر سلانے لگی اور میں ابا جی کے بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

اگلی صبح آنکھ کھلی تو گھر کی اطراف کا جائزہ لیا۔ گھر کے سامنے اور عقب میں خوبصورت لان تھے جن میں خوش رنگ پھول نظروں کو ایک ادا سے لبھا رہے تھے۔ حسنِ فطرت کے اس نظارے نے میرے دل میں کھاریاں کے لیے محبت کا پہلا بیج بو دیا۔ کمالیہ کی گرد آلود فضا سے اٹھ کر کھاریاں کے اس شاداب اور حسین ماحول میں آ جانا بہت ہی دلکش تجربہ تھا۔ چھاؤنی ہونے کے باعث ہر طرف پھول اور سبزہ تھا۔ کہیں کسی خودرو جھاڑی کو بد چلنی کی اجازت نہ تھی۔ سفید بنیانوں اور خاکی پتلونوں میں ملبوس فوجی جوان ہمہ وقت پودوں کی تراش خراش، پھولوں کی افزائش اور سبز گھاس کے کارپیٹ بچھانے میں مشغول نظر آتے تھے۔ کالج اور سکول کی عمارتیں متصل تھیں اور وسیع و عریض کھیل کے میدان تھے۔ مجھ ایسے کھیل کے رسیا کے لیے یہ بہت بڑی کشش کا باعث تھے۔ سکول کے پارک میں بچوں کے لیے جھولے بھی لگے ہوئے تھے۔ میں نے کھاریاں کینٹ کے ساتھ پہلا رشتہ ان جھولوں میں جھول کر استوار کیا۔ مجھے اسی سکول میں داخل ہونا تھا اور کمالیہ کے سکول کے

تشدد زدہ ماحول سے نکل کر اس سکول کی عمارت اور گراؤنڈز میں آنا عجیب سی رعنائی کا احساس دلا رہا تھا۔ ابا جی نے مجھے بتایا کہ اس سکول میں عمومی طور پر مار پیٹ کا رواج نہیں ہے۔ اس خبر نے میرے اندر سنسنی بھر دی۔

امی جی اور ابا جی کھاریاں آ کر اس لیے بھی خوش تھے کہ ہمارے ددھیالی اور ننھیالی گاؤں یہاں سے بہت قریب تھے۔ کھاریاں کینٹ اور کھاریاں شہر ساتھ ساتھ آباد تھے مگر دونوں کی ظاہری شکل وصورت میں واضح فرق موجود تھا۔ کھاریاں شہر پنجاب کے روایتی شہروں میں سے ایک تھا۔ وہی بے ترتیبی، تنگ بازار، پرانے مکان، لوگوں کا ہجوم، حفظانِ صحت کے تمام تر اصولوں سے کوسوں دور کھانے پینے کی اشیا کی دکانیں اور بھنبھناتی مکھیوں کی چھاؤں میں سجی مٹھائیوں کے تھال۔ کھاریاں کینٹ اور سٹی کی حدود ایک قدرتی نالے کے اوپر بنے ہوئے پل سے متعین ہوتی تھیں۔ مجھے ان تمام چیزوں کے باوجود کھاریاں شہر اچھا لگتا تھا۔ کیوں اچھا لگتا تھا اس کی وجہ کا ادراک بہت بعد میں جا کر ہوا۔ کینٹ ایک نسبتاً خاموش علاقہ تھا جہاں دور دور تک فوجیوں اور ان کی بیرکوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مجھے بعض اوقات اس خاموشی سے گھبراہٹ ہونے لگتی اور شدید بے رونقی کا احساس ہونے لگتا۔ سٹی کا علاقہ اپنی ہماہمی کے باعث زندگی کا پتہ دیتا اور میرا دل کچھ دیر کو بہل جاتا۔ ہماری رہائش کے قریب ہی ایک بازار تھا جسے نصیرہ بازار کہا جاتا تھا۔ نصیرہ دراصل ایک گاؤں تھا جو کینٹ کے علاقے میں واقع ہونے کی وجہ سے ایک مصروف بازار کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ بنیادی ضرورت کی تمام اشیا وہاں دستیاب تھیں اور گھریلو سودا سلف کی خریداری اکثر وہیں سے ہوتی۔ گوشت، سبزی اور دیگر چھوٹی موٹی چیزیں وہاں سے بآسانی دستیاب ہو جاتیں۔ کسی بڑی خریداری کے لیے کھاریاں شہر کے مین بازار میں جانا پڑتا اور اس سے بھی بڑی خریداری کے لیے گجرات یا جہلم کا رخ کرنا پڑتا۔ کھاریاں شہر میں شام کے وقت فوجی جوان شہری زندگی کا لطف لینے کے لیے موجود ہوتے۔ ریستورانوں پر بیٹھ کر نور جہاں کے گانے سننا اور اپنے تخیل کی دنیا کو آباد کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا۔ کینٹ کے علاقے میں نظم وضبط کے سانچوں میں زندگی گزارنے پر مجبور یہ فوجی جوان سٹی میں آ کر خود کو آزاد محسوس کرتے اور کسی فلمی نغمے پر خوش یا دکھی ہو کر ایک آدھ نعرہ بھی لگا لیتے اور یہ ان کی آزاد زندگی کا سب سے بڑا اظہار ہوتا۔

کینٹ میں زندگی ایک مخصوص چال چلتی جس میں کسی غیر معمولی تحرک یا ارتعاش کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ فوجی اپنی خاکی وردیوں میں ملبوس پریڈ کرتے۔ اگر پریڈ نہ بھی کرتے تو ایک ترتیب سے ادھر اُدھر حرکت کرتے۔ بوٹوں کی دھمک کے ساتھ فوجی جوانوں کی حرکت اور کسی حوالدار کا ''کاشن'' مجھے بہت لطف دیتا۔ ''سیدھے چل''، ''دائیں پھر'' اور ''آسان باش'' کی آوازیں آج بھی کانوں میں گونجتی ہیں تو میں بچپن کے دور کے اسی کھاریاں کینٹ میں پہنچ جاتا ہوں جب میں بھی فوجی افسر بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ جانے کیوں مجھے لیفٹیننٹ کرنل کا عہدہ بہت پسند تھا۔ شاید اس عہدے کا صوتی آہنگ تھا، کندھے پر دمکنے والے چاند تارے کا طلسم یا ایک فوجی یونٹ کی کمان کی کشش۔ کچھ ایسا ضرور تھا کہ میری خواہش تھی کہ میں جلد از جلد

لیفٹیننٹ کرنل بن جاؤں ۔ رات کو کچھ فاصلے پر فوجی بیرکوں کے لنگروں سے کھانا کھانے کے بعد فوجی جوان اپنی اپنی یونٹوں کی کینٹین پر بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے، چائے پیتے، فلمی نغمے سنتے اور پھر اپنی بیرکوں کے کمروں کے اندھیروں میں نوار کی پٹیوں سے بُنی ہوئی اپنی چارپائیوں پر لیٹ کر دور دراز بسنے والے اپنے پیاروں کو یاد کرتے اور جانے کس لمحے خواب دیکھتے دیکھتے نیند کی وادی میں اتر جاتے ۔

کچھ دن بعد ابا جی مجھے اور بھائی جان کو سکول لے کر پہنچے ۔ یہ کنٹونمنٹ بورڈ کے زیر اہتمام چلنے والا ایک انگلش میڈیم سکول تھا جس میں زیادہ تر فوجی افسران کے بچے زیر تعلیم تھے ۔ سفید شرٹس، سٹیل گرے ٹراؤزرز اور میرون ٹائی میں ملبوس لڑکے ایک ڈسپلن سے ادھر اُدھر خاموشی سے حرکت کر رہے تھے ۔ لڑکیوں کا یونیفارم ہلکے نیلے رنگ کی شرٹ اور سفید شلوار پر مشتمل تھا ۔ ابا جی سکول سے متصل کالج میں پروفیسر تھے ۔ ہم سکول کے پرنسپل صاحب کے کمرے میں پہنچے تو انہوں نے بہت والہانہ انداز میں ابا جی کا اور ہمارا استقبال کیا ۔ پرنسپل صاحب نے ہم دونوں بھائیوں کو ساتھ لپٹا کر پیار کیا اور ہمیں اپنے سامنے موجود کرسیوں پر بیٹھنے کو کہا ۔ ہمارے لیے یہ سب حیرت انگیز حد تک خوشگوار تھا ۔ کمالیہ کے سکول میں استاد اور پرنسپل کے بارے میں جو روح فرسا تصورات قائم ہوئے تھے، ان کی یکسر نفی ہو رہی تھی ۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کسی سکول میں بچوں کے ساتھ اتنی شفقت اور تکریم سے بھی پیش آیا جا سکتا ہے ۔ میری آنکھوں میں چکوال والے سکول کی پرنسپل مسز ملک کا شفیق چہرہ تیرنے لگا جسے میں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا مگر کمالیہ کے سکول میں جب جب اساتذہ کا درشت رویہ برداشت کرنا پڑتا، وہ مہربان چہرہ ماضی کی دھند ہٹا کر پورے چاند کی طرح روشن ہو جاتا ۔ پرنسپل صاحب نے کلرک کو بلا کر اپنے دفتر میں ہی داخلے کی رسمی کارروائی مکمل کروائی اور پھر ایک آیا کے ساتھ ہمیں ہماری کلاسز میں بھیج دیا ۔ اس وقت انگلش کی کلاس چل رہی تھی اور ٹیچر ففتھ کلاس کے لیے مختص ریڈیئنٹ ریڈنگ سیریز کی کتاب جنگلنگ بیلز پڑھا رہی تھیں ۔ میں آیا کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو ٹیچر پڑھاتے ہوئے رک گئیں، تمام بچے شوق و استعجاب کے ساتھ نئے آنے والے بچے کو دیکھنے لگے ۔ آیا نے ٹیچر کو بتایا کہ یہ پروفیسر رانا صاحب کا بیٹا ہے ۔ انہوں نے ایک استقبالی مسکراہٹ سے ”آہاں“ کہا اور سامنے بیٹھے ایک بچے کو پیار سے پیچھے جا کر بیٹھنے کو کہا ۔ پھر مجھے اپنے بالکل سامنے والی نشست پر بٹھا دیا ۔ میں ابھی کتابوں اور بیگ کے بغیر تھا ۔ ٹیچر نے مجھ سے پچھلے سکول کے بارے میں کچھ سوالات کیے جن کا میرے پاس کوئی خاطر خواہ جواب نہ تھا ۔ لہذا میں کچھ دیر ممیا کر خاموش ہو گیا ۔ ٹیچر نے شاید میری مجبوری سمجھ لی تھی یا اسے میری جھجک پر محمول کیا ۔ خود ہی بولیں، ”خیر ہے کوئی بات نہیں، آپ بیٹھ جائیں اور کل سے کتابیں لے آئیں، ابھی طارق اقبال کے ساتھ ان کی بک سے پڑھ لیں“ ۔ میں سکول کے بچوں کے لیے ایک ٹیچر کے منہ سے ”آپ“ اور ”ان“ جیسے الفاظ سن کر شدید حیرانی سے دوچار تھا ۔ میری ٹیچر نے پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ جاری کر دیا اور میں کلاس روم کا جائزہ لینے میں مشغول ہو گیا ۔ خوبصورت اور اجلے یونیفارم میں ملبوس بچے اور بچیاں سر جھکائے پڑھنے میں مشغول تھے ۔

کبھی کبھی کوئی بچہ تجسّس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھ لیتا اور پھر فوری طور پر نظریں کتاب پر گاڑ دیتا۔ کلاس روم کی دیواریں خوبصورت چارٹس اور دیگر اشیا سے مزیّن تھیں۔ بچے عمومی طور پر کلاس ڈسپلن کے پابند تھے مگر موقع پا کر کسی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے بچے کی نوٹ بک پر کچھ لکھ ڈالتے یا ہلکی پھلکی سرگوشی کر لیتے۔ مجھے اس طرح منہ اٹھا کر دوسروں کی طرف دیکھتے دیکھا تو ٹیچر نے ملائمت سے مجھے اپنے ساتھ والے بچے کی کتاب پر دیکھنے کی تلقین کی۔ میرے ساتھ طارق اقبال بیٹھا تھا۔ اس نے کتاب ذرا سا میرے آگے کھسکائی اور میں خوبصورت اور چمکدار کاغذ پر بنی ہوئی ان خوبصورت اور رنگین تصاویر کو دیکھنے میں منہمک ہو گیا جو کہانی کو تخیلاتی شکل دینے کے لیے کتاب پر بنی ہوئی تھیں۔ کلاس ختم ہوئی تو تمام بچے میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ لڑکے مجھ سے ہاتھ ملاتے جاتے اور اپنا اپنا نام بتاتے جاتے۔ لڑکیاں اپنی اپنی سیٹوں پر ہی تحیّر آمیز انداز میں مجھ نووارد کو دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اپنا نام بتانے کی ضرورت اس لیے نہ پڑی کہ ہماری ٹیچر سب کے سامنے میرا نام پوچھ چکی تھیں۔

بریک ہوئی تو میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ صبح امی جی نے مجھے لنچ ساتھ دینے کے لیے بہت اصرار کیا تھا مگر میں پہلے دن کچھ بھی لے جانے سے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کلاس روم میں ہی بیٹھا رہوں۔ بچے ایک ایک کر کے کلاس روم سے جانے لگے۔ مجھے بیٹھا دیکھ کر طارق اقبال پلٹا۔ میرے پاس آیا اور بولا، ”بریک کے لیے سب نیچے جاتے ہیں، گراؤنڈ میں۔ کلاس روم میں بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ آؤ چلیں“۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے۔ برآمدوں سے گزرتے ہوئے فٹ بال گراؤنڈ کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ ”تم کہاں رہتے ہو؟“ طارق نے خاموشی کی دیوار گرائی۔ میں نے کچھ بولنے کی بجائے اپنے عقب والے علاقے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ مجھے ابھی تک خاموش دیکھ کر طارق نے دوسرا سوال کیا، ”پہلے کس سکول میں پڑھتے تھے؟“۔ میں نے بتایا کہ ہم کمالیہ سے آئے ہیں اور پہلے میں وہیں پڑھتا تھا۔ ”کمالیہ؟ وہ کہاں ہے؟“ طارق نے نیا سوال داغا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کمالیہ کہاں ہے۔ میں نے پھر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے دور کی طرف دیکھا اور کہا، ”وہاں“۔ طارق نے ”اچھا“ ایسے کہا جیسے اسے جگہ کا اندازہ ہو گیا ہے۔ اس کے ابو فوج میں کرنل تھے اور وہ چار بہن بھائی تھے۔ کچھ دیر بعد ایک ملازم نما شخص اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا اور ہاتھ میں تھاما ہوا لنچ باکس اور پانی کی فلاسک طارق کو تھما دی۔ مجھے دیکھ کر طارق سے پوچھنے لگا، ”آپ کے دوست کا بیٹ مین ابھی لنچ لے کر نہیں آیا؟“ طارق نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے بیٹ مین کا لفظ پہلی بار سنا تھا اور مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ کس کی بات کر رہے ہیں۔ مجھے متذبذب دیکھ کر طارق نے لنچ باکس کھولا اور میرے سامنے رکھ دیا، ”آؤ کھائیں“۔ میں نے انکار میں سر ہلایا اور اٹھ کر ایک جانب چل دیا۔

بریک کے بعد کچھ اور کلاسز ہوئیں اور تمام اساتذہ میرا تعارف حاصل کرتے رہے۔ سکول میں

چھٹی ہوئی تو میں گھر کی جانب چل پڑا جو سکول کے بہت قریب واقع تھا۔ گھر پہنچا تو سب نئے سکول کے بارے میں استفسار کرنے لگے۔ میں حسبِ عادت فوری طور پر کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ بھائی جان سکول کے بارے میں بہت پر جوش تھے اور مجھ سے بھی رائے لینا چاہتے تھے۔ میں چڑ گیا اور کچھ بھی کہنے سے صاف انکار کر دیا۔ ہم نے کھانا کھایا، کچھ وقت بیتا تو میں نے آہستہ آہستہ سکول کی کتھا سنانا شروع کی۔ شام کو ابا جی کے ساتھ ہم دونوں بھائی نئی کتابیں اور بیگ لینے بازار گئے۔ میرے لیے یہ سب کافی سنسنی خیز تھا۔ خوبصورت نئی کتابوں کو گھر آ کر بار بار الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ باقی کتابوں کو بیگ میں ڈالا۔ انگلش اور اردو کی کتابیں اہتمام سے اپنے سامنے رکھیں۔ انہیں کھولا اور کہانیوں اور رنگین تصویروں میں کھو گیا۔ مجھے ہمیشہ تصویروں میں کشش محسوس ہوتی تھی اور میری عادت تھی کہ میں کہانی پڑھنے سے پہلے ساتھ بنی ہوئی تصویروں کی مدد سے ذہن کے قرطاس پر تخیل کاڑھا کرتا اور کہانی خود بُننے کی کوشش کیا کرتا۔ کبھی کہانی میرے تخیل سے ہم آغوش ہوتی دکھائی دیتی اور کبھی ایک سو اسی درجے کے زاویے پر کھڑی نظر آتی لیکن کہانی پہلے ہمیشہ مجھ تک تصویر کے ذریعے ہی پہنچتی رہی۔

ہم سکول کے تعلیمی سال کے بیچ میں داخل ہوئے تھے اور نیا کورس ہونے کی وجہ سے ہمیں کافی مشکل محسوس ہو رہی تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہم اردو میڈیم سے انگلش میڈیم میں منتقل ہوئے تھے۔ اس سکول میں اردو اور اسلامیات کے سوا باقی تمام مضامین انگلش میں تھے۔ انگلش کے مضمون کی کتابیں انگلینڈ کے کسی سلیبس کے مطابق تھیں اور ان کی طباعت ہی غیر معمولی طور پر دیدہ زیب تھی۔ ریڈیئنٹ ریڈنگ سیریز کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اس سلسلے کی چھٹی جماعت میں پڑھائی جانے والی کتاب "شائیننگ آورز" آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کتاب کی پہلی کہانی "وائز مین آف گوتھم" تھی جس کے ہلکے پھلکے مزاح سے میں کچھ زیادہ ہی لطف اندوز ہوتا اور اکیلا بیٹھ کر ہنستا رہتا۔ کورس نیا اور مشکل ہونے کے باعث ابا جی کو ہم دونوں بھائیوں کے ساتھ بہت محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ وقت کم ہونے کے باعث سکول ٹائم کے بعد مجھے میری انگلش ٹیچر مس ارجمند کے پاس ٹیوشن کے لیے بھیجا جانے لگا۔ مس ارجمند مجھے کہانی پڑھاتیں اور میں تصویروں میں کھویا رہتا۔ گھر آتا تو بھی یہی تصویری کہانیاں میرے ذہن میں بنتی بگڑتی رہتیں۔ رات کو بستر پر لیٹتا تو کبھی "دی بوائے ہو لوڈ میوزک" والی کہانی کا بچہ میرے سامنے آ کھڑا ہوتا جو بگھی میں بیٹھا اپنے باپ سے بڑی لجاجت سے کہ رہا ہوتا، "پلیز فادر ٹیک می ود یو"۔ اور میں اس کی بیچارگی اور تنہائی کے احساس سے دل گرفتہ ہو جاتا۔ کبھی "گاڈفرے گارڈن" نظم کا وہ بچہ میری آنکھوں میں نمی لے آتا جسے گاؤں کے لوگوں نے ایک کشتی میں بٹھا کر اکیلے سنگاپور روانہ کر دیا تھا۔ جانے کہانیاں کون سا موڑ مڑ جاتیں اور میں کسی نئی کہانی کو خواب میں بُننے کے لیے آنکھیں موند لیتا۔

کچھ دن بعد ہی مس ارجمند کی غالباً شادی ہو گئی اور وہ ملازمت چھوڑ گئیں۔ ان کی جگہ مس نگہت

حسن ہماری انگلش کی ٹیچر مقرر ہوئیں۔ مس نگہت ان اساتذہ میں سے تھیں جو اس پیشے میں حادثاتی طور پر نہیں بلکہ ایک مشن سمجھ کر آتے ہیں۔ وہ کلاس میں داخل ہوتیں تو مجھے کلاس روم کے در و دیوار پر دیدہ زیب نقش و نگار بنے محسوس ہوتے۔ تمام فضا یکسر بدل جاتی۔ اپنی جاذبِ نظر شخصیت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک دلآویز مسکراہٹ بچوں کی طرف اچھالتیں اور نہایت ملائم لہجے میں گڈ مارننگ کڈز کہتیں تو ساری کلاس یک زبان ہو کر پورے دل سے گڈ مارننگ ٹیچر کہتی۔ وہ عموماً کلاس میں کوئی نہ کوئی غیر معمولی چیز لے کر آتیں۔ کبھی کوئی پتہ، کبھی پھول، کبھی کوئی تصویر اور کبھی کوئی اور ایسی چیز ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ بچوں کی آتشِ شوق اس قدر بھڑک جاتی کہ وہ سر اٹھا اٹھا کر، ایک دوسرے کو پیچھے ہٹا ہٹا کر، کھڑے ہو ہو کر اس چیز کو دیکھنا چاہتے۔ پھر وہ مسکرا کر اس نا بغے کو سب کے سامنے نمایاں کرتے ہوئے پوچھتیں، ''ناؤ ٹیل می واٹ از دس''۔ بچے پورے ذوق شوق سے اپنے معصوم تخمینے لگاتے جاتے۔ کبھی کوئی بچہ شے کی حقیقت تک پہنچ جاتا اور کبھی یہ سربستہ راز مس نگہت کو خود ہی طشت از بام کرنا پڑتا۔ پھر وہ بچوں سے اسی چیز کے بارے میں اس طرح سوال پوچھتیں کہ ہمیں احساس ہی نہ ہوتا کہ پڑھائی کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ ہماری ٹیچر اس چیز کے بارے میں سوالات کر کے اس طرح سبق پر آتیں جیسے یہ سب محض اتفاق تھا کہ ہمارا سبق بھی اسی چیز سے براہِ راست یا بالواسطہ متعلق تھا۔ ہم سب بچے اس بات پر بہت حیران ہوتے۔ یہ بہت بعد جا کر پتہ چلا کہ یہ محض اتفاق نہیں ہوتا تھا۔ وہ ارادتاً اس دن کے سبق سے متعلق کوئی ایسی اچھوتی چیز اپنے ہمراہ لاتیں کہ بچوں کی دلچسپی بڑھ جاتی۔

ایک دفعہ گرامر پڑھاتے ہوئے مس نگہت نے بورڈ پر جلی حروف میں انگریزی کے الفاظ ''ہی، شی اور اٹ'' لکھے اور پھر خود کلاس کی پچھلی دیوار کے ساتھ دوزانو ہو کر ایک ماہر نشانہ باز کی طرح ہاتھوں کو بندوق بناتے ہوئے ''ہی، شی اور اٹ'' کا نشانہ باندھا اور منہ سے ''ڈز، ڈز، ڈز'' فائر کی آواز نکالی۔ پھر بورڈ پر جا کر ''ہی، شی، اٹ'' کے سامنے تین دفعہ انگریزی میں ڈز لکھا اور کہا ''کل ہی، شی، اٹ ووڈز، ڈز، ڈز''۔ مجھے اس دن کے بعد زندگی بھر نہیں بھولا کہ ''ڈز'' صرف واحد غائب کے ساتھ ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایسے کئی بہت سے ایسے ''ٹوٹکے'' انہوں نے سکھائے کہ انگلش گرامر کے بہت سے عقدے حل ہونا شروع ہو گئے۔ جب ابا جی نے میرے لیے ٹیوشن کی بات کی تو انہوں نے کہا، ''سلمان کو ٹیوشن کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ آپ مجھے کچھ وقت دیں'' اور میری ٹیچر نے غلط نہیں کہا تھا۔ مس نگہت نے مجھے مخاطب کر کے کہا، ''سلمان میری بات کی لاج رکھنا'' اور میں نے اپنی ٹیچر کا سر کبھی جھکنے نہ دیا۔ جب سالانہ امتحان ہوا اور میں نے ان کا سر فخر سے بلند کر دیا تو انہوں نے مجھے ساتھ لپٹا کر بہت پیار کیا۔ تب انعام میں ملے ہوئے تمام کپ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ صرف اپنی ٹیچر کا پیار اور حوصلہ افزائی یاد رہی۔ اردو میڈیم سے انگلش میڈیم میں آنے والے بچے کو ایسی نمایاں کامیابی دلوانے میں سراسر میری ٹیچر کا ہاتھ تھا۔ آج بھی جب ان کا شفیق چہرہ میری آنکھوں میں چمکتا

ہےتو کسی تشکر آمیز لمحے میں میری آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی ہے۔

مس نگہت نے ہمیں آٹھویں گریڈ تک انگلش پڑھائی۔ ان چند برسوں میں اپنی ٹیچر کے کانونٹ والے تلفظ سے ادا ہوتی ہوئی انگلش زبان جیسے میرے کانوں میں جلترنگ بجاتی رہی۔ کبھی کبھار مس نگہت ہمیں اپنی پسندیدہ انگریزی نظمیں سنایا کرتیں۔ میں ان نظموں کے منظرنامے میں کھو جاتا۔ انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کی سرسبز و شاداب وادیوں میں گھومنے لگتا۔ میری نظروں میں سبز پہاڑی ڈھلوانوں پر بکریاں اور سفید گائیں گھاس چرتی رہتیں۔ پن چکیوں کے پنکھے ہلتے رہتے۔ نیلے آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے تیرتے رہتے اور فطرت اپنی پوری بے حجابی کے ساتھ میرے سامنے رقص کناں رہتی۔ میرے ذہن میں انگلش زبان و ادب کا ایسا محبوبانہ تصور نقش ہو گیا کہ اس کا نتیجہ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کرنے کی صورت میں نکلا۔ اس کے ایک طویل عرصے بعد جب انگلستان جانے کا اتفاق ہوا تو مس نگہت کی سنائی ہوئی نظمیں میرے سامنے زندہ ہو گئیں۔ جب میں نے ورڈزورتھ کے ڈیفوڈلز کو اپنے سامنے جھولتے دیکھا تو مس نگہت حسن کے ہونٹوں سے پھسلتی ہوئی یہ شہرۂ آفاق نظم میرے کانوں میں ایک زمانے بعد پھر سے رس گھولنے لگی۔

میں خوش قسمت تھا کہ مجھے زندگی میں معیاری تعلیمی ادارے اور قابل اساتذہ ملے۔ میں پوری ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ آج اگر کسی سخن کا یارا ہے اور میرے دوستوں کو میرے بارے میں کوئی خوش فہمی ہے تو اس کا سہرا ان شاندار تعلیمی اداروں اور میرے محترم اساتذہ کے سر ہے۔ کینٹ پبلک ہائی سکول کھاریاں کینٹ ایک بہت معیاری ادارہ تھا۔ اساتذہ کا انتخاب بہت جانچ پرکھ کر کیا جاتا تھا۔ اس سکول میں بچوں کو صرف تعلیم ہی نہیں دی جاتی تھی، ان کی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ ہم ہر صبح جب سکول کے مین کمپاؤنڈ میں اسمبلی کے لیے اکٹھے ہوتے تو تلاوت کے ساتھ ترجمے کا اہتمام کیا جاتا۔ پھر اساتذہ میں سے کوئی ایک شفیق ہستی بہت پیار سے کسی اخلاقی پہلو پر گفتگو کرتی۔ پھر بچوں کا ایک گروپ علامہ اقبال کی معروف دعا کو ایک دلنشیں لحن کے ساتھ پڑھتا اور باقی بچے ان کی پیروی کرتے ہوئے ان اشعار کو دہراتے تو جیسے میری روح پگھلتی جاتی۔

یا رب! دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ ان اشعار کو سنتے ہوئے میں بہت بے چین ہو جایا کرتا:

محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دِکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

میں حیران ہوتا کہ شاعر نے ایسا کیا دیکھ رکھا ہے جو وہ اوروں کو بھی دکھانا چاہتا ہے مگر وہ نہیں دیکھ پاتے۔ یہ عقدے بہت بعد میں کھلے کہ اقبال دیدہ بینا سے محروم اپنی قوم کو کیا دکھانا چاہتا تھا۔ اس دعا کے بعد ہم سب سیدھے تن کر کھڑے ہو جاتے اور یک زبان ہو کر قومی ترانہ پڑھتے۔ ترانہ پڑھنے کے بعد تمام بچے قطار کی صورت میں اپنی اپنی کلاسوں کی طرف گامزن ہو جاتے جہاں ترسیلِ علم کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

سکول میں کئی ملازم تھے مگران سب میں نمایاں ایک خاتون تھی۔ دبلی پتلی مگر مستعد، سانولی رنگت اور مخصوص انداز میں اردو بولنے والی آیا سرنگا کبھی میرے ذہن سے محو نہ ہو سکی۔ اسے سکول کی انتظامیہ کی طرف سے جو بھی کام سونپا جاتا، برق رفتاری سے انجام دیتی۔ اس کی آواز میں ایک نغمگی تھی اور ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ہر بات ایک لے میں کر رہی ہے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کم کم ہی آیا کرتی۔ میں نے اسے ایسے ہی دیکھا تھا اور میری دانست میں وہ ایسی ہی پیدا ہوئی تھی جسے مسکراہٹ قدرت کی جانب سے ودیعت ہی نہیں ہوئی تھی۔ تب مجھے معلوم نہیں تھا کہ انسانوں کے اندر پنہاں دکھ بھی ان سے مسکراہٹیں چھین لیتے ہیں۔ کچھ بچے عیسائی ہونے کی وجہ سے اس کے بارے میں اس کے سامنے ہی بعض نامناسب کلمات کہہ دیتے لیکن اس کے چہرے کے تاثرات میں بھی معمولی سی بھی تبدیلی نہ آتی۔ شاید وہ ایسی حقارت آمیز باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔ مزید حیرت تب ہوتی جب وہ کسی بچے کے سامنے نہ تو زبانی ردِّعمل ظاہر کرتی اور نہ ہی کسی حرکت سے اس کا شائبہ تک آنے دیتی۔ اسی طرح بچوں کو پچکارتی رہتی اور اپنے فرائضِ منصبی کی بجا آوری میں منہمک رہتی۔ آیا سرنگا کا وہ شفیق مگر خاموش اور اداس سانولا چہرہ مجھے ہمیشہ بے چین کر دیتا۔ آج بھی وہ میرے ذہن میں اسی ملیح رنگت اور اداس چہرے کے ساتھ زندہ ہے۔

سکول کا چوکیدار ایک ریٹائرڈ فوجی تھا۔ فضل داد پتلے لمبوترے چہرے اور مضبوط گٹھے ہوئے جسم کا مالک شخص تھا۔ دن کے وقت وہ کم کم ہی نظر آتا۔ ہم چوں کہ کالج اور سکول کے قریب ہی رہتے تھے سو اکثر شام کو سکول کے جھولوں پر جھولنے کے لیے وہاں جاتے رہتے۔ فضل داد ہمارے علاوہ دیگر بچوں کو جھولوں کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتا تھا۔ ہم اس خصوصی سلوک کی وجہ سے خود کو بہت اہم سمجھا کرتے۔ میرے دیگر کھیل کے ساتھی جو اسی کالونی میں رہائش پذیر تھے، کسی باہر کے بچے کے جھولوں پر آنے کی شکایت فوراً فضل داد سے کیا کرتے اور فضل داد اپنی ڈیوٹی کا حصہ سمجھتے ہوئے انہیں وہاں سے یوں شُشکار دیتا جیسے وہ چھوٹے چوزے ہوں اور وہ چوکیدار کی شش کی آواز سے ہی ڈر کر بھاگ نکلتے۔ ان کو یوں جاتا دیکھ کر میرے دل پر بوجھ سا بننے لگتا جسے اتارنے میں مجھے بہت دیر لگتی۔ کئی دفعہ میں اس بوجھ کو نہ سہار سکتا اور خاموشی سے اٹھ کر گھر چلا جاتا۔ چوکیدار فضل داد کی آواز اس کے منہ سے ایسے برآمد ہوتی جیسے گھی کے کسی خالی کنستر سے برآمد ہو رہی ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے سماعت کو غیر معمولی طور پر حاضر رکھنا پڑتا۔ فضل داد نوکری کرنا خوب جانتا تھا اور اس معاملے میں خاصا چوکس تھا۔ جب بھی سکول انتظامیہ کا کوئی فرد اسے نظر آتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ فضل داد کسی

فوجی کوارٹر گارڈ کے سامنے تن کر کھڑا ہے۔ جوں ہی مزکورہ فرد دائیں بائیں ہوتا، وہ خود کو ”آسان باش“ کا کاشن دے کر زندگی کو آسان بنالیتا۔

میں نے اس سکول میں بہت محبت اور عزت پائی۔ میں چھٹی جماعت میں تھا۔ سکول میں ایک مباحثہ ہوا۔ امی جی نے مجھے تقریر لکھ کر دی اور ادائیگی کی کچھ پریکٹس بھی کروائی۔ میں مقررین کی فہرست میں عمر اور قد دونوں اعتبار سے سب سے چھوٹا تھا۔ جب میری باری آئی تو حاضرین کی سہولت کے لیے میرے سامنے سے روسٹرم ہٹا دیا گیا۔ سکول کے بچے اسی حرکت سے ہنسنا شروع ہو گئے۔ میں تھوڑا سا نروس ہو گیا مگر میں نے رٹی ہوئی تقریر شروع کر دی۔ تقریر آگے بڑھنے لگی تو سامعین خاموش ہو گئے۔ پھر جب میں نے امی جی کے لکھے ہوئے الفاظ کی ادائیگی زور شور سے کی تو ہال بے اختیار تالیوں سے گونج اٹھا۔ یہ عمل تقریر کے دوران بار بار دہرایا جانے لگا۔ تقریر ختم ہوئی تو دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ میں تقریر ختم کر کے لوٹا تو مس نگہت اپنی سیٹ سے اٹھیں اور مجھے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ بہت پیار کیا اور خوب شاباش دی۔ دوسرے بہت سے ٹیچرز نے بھی آ کر مجھے سراہا۔ میں حیران اور خاموش یہ سب دیکھ رہا تھا۔ مجھے زیادہ اندازہ نہیں تھا کہ میں نے ایسا کیا تیر مارا ہے مگر یہ ضرور ہے کہ میں اس دن مقرر بن چکا تھا۔ یہ میری خطابت کے دور کا آغاز تھا۔ اس کے بعد میں نے کبھی مڑ کر نہیں دیکھا اور یونیورسٹی تک اپنے پورے زمانہ طالب علمی میں بہترین مقرر قرار پاتا رہا اور اپنے سکول اور پھر کالج کی نمائندگی دیگر شہروں میں جا کر کرتا رہا۔ میرے گھر کا شوکیس ہمیشہ ان ٹرافیوں اور کپس سے بھرا رہا۔ آج پلٹ کر دیکھتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر اس روز مجھے امی جی تقریر لکھ کر نہ دیتیں اور ہمت نہ بندھاتیں تو شاید مجھ میں وہ اعتماد نہ آ سکتا جس کے بل بوتے پر میں نے زندگی میں بے شمار کامیابیاں سمیٹی ہیں۔ میں اس روز کے بعد سکول میں مشہور ہو گیا۔ وہی بچہ جو خاموشی سے دیوار کے ساتھ ہو کر گزرتا اور دوسروں سے زیادہ ہمت سے بات بھی نہ کر پاتا، اب ہر شخص کا مخاطب تھا۔ میرے اعتماد نے اس روز ایک لانگ جمپ لگائی اور ایک ہی جست میں کئی زقندیں بھر کے بہت آگے جا کھڑا ہوا۔ قدرت نے مجھے پیدائشی طور پر فنِ تقریر کی اس صلاحیت سے نواز رکھا تھا۔ جب موقع ملا تو یہ صلاحیت کھل کر سامنے آئی۔

اس سکول میں اور بھی بہت سے قابل اساتذہ موجود تھے۔ میری آنکھوں میں اس وقت ان کی شبیہیں تیر رہی ہیں جنہوں نے میری تعلیم، تربیت اور کردار سازی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ہمیشہ مسکرانے والے سر عزیز جو ہمیں سوشل سٹڈیز پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے ان کے مضمون کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے پر شورش کاشمیری کی اقبال پر ایک بہت خوبصورت کتاب ”اقبال، پیامبرِ انقلاب“ انعام کے طور پر دی جو آج بھی میری ذاتی لائبریری میں محفوظ ہے۔ میڈم شکیلہ جو مختصر قامت کی درمیانی عمر کی خاتون تھیں۔ بہت شفیق اور پوری یکسوئی سے پڑھایا کرتیں۔ سب بچے دل سے ان کی عزت کرتے تھے۔ سانولی رنگت والے سمارٹ اور نوجوان سر قیوم جو خوبصورت حسِ مزاح رکھتے تھے اور سب بچے ان کے ساتھ

آسانی سے گفتگو کر لیتے۔ نوجوان اور خوبرو مس زیب جو ہمیشہ سہمی سہمی نظر آتیں۔ چھوٹی چھوٹی تراشیدہ داڑھی اور جناح کیپ کے ساتھ ہمیشہ سوٹ میں ملبوس سر حیات نسبتاً خاموش اور سنجیدہ رہتے تھے۔ نرم خو اور نرم گفتار مس طاہرہ جو اسلامیات پڑھاتی تھیں۔ خوبصورت پٹھان سر عادل شیر جو حساب پڑھانے پر مامور تھے۔ سب بچے ان سے ڈرتے تھے۔ ایک سال میں نے ان سے بھی حساب پڑھا۔ میری چوں کہ اس مضمون کے ساتھ جبلّی طور سے ان بن تھی اس لیے یہ واحد مضمون ہے جس کے باعث مجھے کئی بار مار کھانا پڑی۔ سر عادل شیر میری نالائقی پر کڑھتے، دانت پیستے، اپنے سر پر ہاتھ مار کر کہتے: ”ووئے میں تیرے کو کیسے سمجھاؤں۔ تیرے کو سمجھ کیوں نہیں آتا؟“ اب یہ وہ نازک مقام ہوتا کہ مجھے اندازہ ہو جاتا کہ سر عادل شیر خان کا غصہ اب حدوں کو چھو رہا ہے۔ میں آگے آنے والے مرحلوں کے لیے تیار ہو جاتا اور سر عادل شیر اپنا مخصوص جملہ دہراتے، ”چھوڑتا نئیں ہوں“۔ اس کے بعد میری درگت بننا شروع ہو جاتی۔ مجھے سب کے سامنے اور پھر بالخصوص لڑکیوں کے سامنے مار کھانے سے بہت سبکی محسوس ہوتی مگر میرے علاوہ بھی کئی ایسے اقبال کے شاہین موجود تھے جنہیں حساب جیسے مضمون پر نچلی پرواز سے کوئی غرض نہ تھی۔ انہیں پٹتے دیکھ کر کچھ اطمینان سا ہو جاتا۔ سر عادل شیر کی جلالی طبیعت میں انقلابی تبدیلی اس وقت آئی جب ان کی شادی مس طاہرہ سے ہو گئی۔ ہر وقت غصے میں رہنے والے عادل شیر صاحب کے ہونٹوں سے مسکراہٹ یوں چپکی کہ جدا ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی مگر افسوس کہ تب تک میں ان کی کلاس سے جا چکا تھا اور ان کے نرم انقلاب سے فیض یاب نہ ہو سکا۔

ہمیشہ ناخن چبانے والے اور ٹانگوں کو ہلاتے رہنے والے سر جمیل بھی ہمیں حساب پڑھایا کرتے تھے۔ سر جمیل حساب کے مضمون کی طرف میری کم حیثیتی سے واقف تھے مگر مایوس نہیں ہوتے تھے۔ میں ساتویں جماعت میں تھا کہ سکول میں کھیلوں کے مقابلے ہو رہے تھے۔ میں ہر ایونٹ میں شریک ہوتا تھا۔ سو میٹر سے لے کر 1500 میٹر تک کی دوڑوں، لانگ جمپ، ہائی جمپ، پول والٹ، جمناسٹکس، ہاکی، کرکٹ، فٹ بال، بیس بال، باسکٹ بال، بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس تک ہر کھیل میں شریک ہوتا اور انعام بھی پاتا۔ ہائی جمپ لگاتے ہوئے میرے بائیں بازو کی کہنی میں فریکچر ہو گا۔ میرے بازو پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ سالانہ امتحان ہونے والے تھے۔ حساب کے پرچے میں ایک سیکشن جیومیٹری کا بھی ہوتا تھا۔ میرے پاس ایک معقول بہانہ آ گیا کہ میں تو جیومیٹریکل ڈرائنگ ہی نہیں کر سکتا۔ ابا جی نے سکول والوں کو میرے بازو کے فریکچر کے بارے میں آگاہ کیا۔ امتحان میں سر جمیل نے جیومیٹری کے سیکشن میں میری خاطر ایک ایسا سوال رکھا جس میں کچھ بھی ڈرا کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر میں خود کو اس حد تک استثنا دے چکا تھا کہ میں نے جیومیٹری کے سیکشن پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنے کی بھی زحمت نہ کی۔ شام کو سر جمیل نے ابا جی کو میری بے نیازی سے آگاہ کیا۔ ابا جی نے گھر آ کر میرے ساتھ جو مکالمہ کیا اس کی تفاصیل زیادہ خوشگوار نہیں۔ غنیمت یہ ہوئی کہ میں پینتیس یا چھتیس نمبر لے کر پاس ہو گیا ورنہ اسی جماعت میں ایک سال مزید لگانا پڑتا۔

میری شخصیت سازی میں اسی سکول کے ایک محترم استاد نے ایسا کردار ادا کیا کہ ان کے ذکر کے بغیر میری داستان ہمیشہ ادھوری رہتی ہے۔ یعقوب امجد صاحب ایک نابغہء روزگار استاد تھے۔ اپنے آبا سے جن اساتذہ کا تذکرہ سنتے آئے ہیں اور جن کے اخلاص اور اپنے پیشے سے سچی لگن کی کہانیاں ذہن پر نقش ہیں، یعقوب امجد صاحب ان کہانیوں کا ایک جیتا جاگتا اور متحرک کردار نظر آتے تھے۔ میانہ قامت، سانولی رنگت، جناح کیپ، چہرے پر بلا کا سکون، غیر معمولی خود اعتمادی اور گونجتی ہوئی پاٹ دار آواز، یعقوب امجد صاحب ان عناصر کے بغیر نامکمل تھے۔ اردو اور عربی کے مضامین پڑھانا ان کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ میں نے اس سکول میں تقریبا چھ سال گزارے اور اس دوران اکثر علم کے اس چشمے سے فیض یاب ہونے کے مواقع ملتے رہے۔ امجد صاحب اپنے وقت کو متاع عزیز سمجھ کر اس کی دل و جان سے قدر کیا کرتے۔ کلاس روم میں داخل ہونے کے لمحات سے لے کر کلاس کا وقت ختم ہو جانے تک وہ پوری دلجمعی اور تندہی سے پڑھاتے رہتے۔ وہ بولتے رہتے، میں سنتا رہتا۔ میر، غالب اور اقبال، امجد صاحب کے اندر دھڑکتے تھے۔ ان کا بیانیہ انداز کچھ ایسا دلنشیں ہوتا کہ میں کم عمری کے باوجود ادب عالیہ کی غلام گردشوں میں گھومنے لگتا، دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا، ان یادگار مشاعروں میں شریک ہوتا اور ان شہروں کی طرز معاشرت کا حصہ بن جاتا۔ میں نے دلی کو اپنی آنکھوں سے اجڑتے دیکھا۔ غالب کو کوچہ بلی ماراں میں دل گرفتگی کی کیفیت میں بوجھل قدموں کے ساتھ آتے جاتے محسوس کیا۔ میر کے ہمراہ بیل گاڑی میں دلی سے لکھنؤ تک کا سفر کیا۔ لکھنؤ کے مشاعرے میں جب میر کو کسی نے نہ پہچانا اور لکھنؤ کے بانکوں نے ان کی ہیتِ کذائی کا تمسخر اڑایا تو میری آنکھوں میں بہت سا دھواں بھر گیا۔ میں نے اقبال کو حقے سے کش لیتے اور کائنات کو تسخیر کر لینے والے اشعار کہتے بہت قریب سے دیکھا۔ مجھے یہ سب مناظر یعقوب امجد صاحب نے دکھائے۔ مجھے ایسا لگتا کہ میں سر امجد کا ہاتھ تھامے اردو ادب کے ونڈر لینڈ کی سیر کر رہا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ آٹھویں جماعت میں امجد صاحب نے ایک روز خوشی محمد ناظر کی شہرہء آفاق نظم “جوگی” سنائی۔ یہ نظم ہمارے نصاب کا حصہ نہ تھی مگر ہمارے ادبی ذوق کی آبیاری کی خاطر ہمارے استادِ محترم نے وہ نظم سنائی۔ جانے اس نظم میں کچھ ایسا تھا یا امجد صاحب کے پڑھنے کے انداز میں دلکشی تھی کہ نظم میرے اندر اتر گئی اور میں آج تک اس نظم کے سحر سے نہیں نکل سکا۔ نظم کی روانی، مناظر کے حسن اور پر شکوہ الفاظ کو امجد صاحب کی گونجتی ہوئی آواز نے زندہ کر دیا۔

امجد صاحب بچوں کی نفسیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی کہ کوئی بچہ کسی طرح بھی پیچھے نہ رہ جائے۔ حوصلہ افزائی، تلقین، نصیحت، پیار، سرزنش، کوئی ایسا گر نہ تھا جو بچوں کی شخصیت سازی اور تعلیم و تربیت کے لیے نہ آزماتے۔ کسی بچے کی غیر تسلی بخش کارکردگی سے کبھی مایوس نہ ہوتے بل کہ اس پر مزید محنت کرتے اور کبھی ہار نہ مانتے۔ ایک دفعہ اردو کا کوئی سبق پڑھاتے ہوئے “سر کا چاند” کی اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے سر سے جناح کیپ اتاری اور رکوع کی کیفیت میں جا کر اپنے سر کے

درمیان دائرے کی شکل میں چمکتا ہوا اور بالوں سے استغنا برتتا ہوا حصہ دکھایا اور ایک لمحے میں پوری کلاس کو ”سر کا چاند“ کی تصویری شکل نظر آ گئی۔ اصطلاح کو بچوں کے ذہن نشین کرنے کی دُھن رکھنے والے استاد نے ایک لمحے کے لیے بھی اس حرکت میں اپنی تضحیک محسوس نہ کی اور نہ یہ سوچا کہ ان کے شاگرد ان کا مذاق بھی بنا سکتے ہیں۔ بھائی جان طبعاً کم گو، کم آمیز اور شرمیلے تھے۔ یعقوب امجد صاحب نے ان کو اجازت دی کہ وہ ان کی کلاس میں شرارت کر لیا کریں اور جس سے چاہیں کلاس کے دوران باتیں بھی کر لیا کریں۔ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں اپنے شاگردوں کے ساتھ اس حد تک وابستگی کسی استاد میں نہیں دیکھی۔ امجد صاحب جب پڑھا چکتے تو ان کے ہونٹوں پر ایک اطمینان بخش تبسم کھیلنے لگتا اور وہ پوری کلاس کی جانب یہ تبسم اچھالتے۔ مجھے اس دم امجد صاحب بہت پیارے لگتے۔

میں نے جب تقریری مقابلوں میں حصہ لینا شروع کیا تو امجد صاحب کی نظرِ انتخاب مجھ پر ٹھہر گئی۔ وہ جب بھی کسی بچے میں کوئی جوہرِ قابل دیکھتے، اسے دوسروں سے علیحدہ کر لیتے اور پھر اپنی تمام صلاحیتیں اس کی تراش خراش میں صرف کر دیتے۔ اس تربیت کا نہ تو کوئی معاوضہ ہوتا اور نہ ہی وقت کی قید۔ جب تقریری مقابلے کے دن قریب آتے تو میرے شفیق استاد مجھے پورے ذوق و شوق کے ساتھ فنِ تقریر کے رموز سکھانا شروع کر دیتے۔ الفاظ کا زیر و بم، لہجے کی موزونیت اور سامعین کی نفسیات۔ امجد صاحب مجھے یہ سب سکھانے میں اپنی پوری توانائیاں صرف کر دیتے۔ ان کو جب کسی پر پیار آتا تو مولانا کہہ کر مخاطب کرتے۔ مجھے تقریر کی مشق کے لیے اکثر میری کلاس سے بلوا لیا کرتے اور وہ جس بھی کلاس میں موجود ہوتے، سب کے سامنے مجھے تقریر کرنے کو کہتے تاکہ مجمعے کا سامنا کرنے میں مجھے کوئی جھجک نہ رہے۔ ایک روز اسی طرح انہوں نے ایک اور کلاس کے سامنے مجھے تقریر کے لیے بلوا بھیجا۔ بچپن میں میری آواز باریک ہوا کرتی تھی اور اپنی پوری توانائی صرف کر دینے کے باوجود زیادہ بلند نہ ہو پاتی۔ میں تقریر کرنے لگا اور امجد صاحب مجھے بار بار آواز بلند کرنے کو کہتے رہے۔ میں اور اونچا بولنے کی کوشش کرتا مگر امجد صاحب ہر بار ”اور بلند“ کا نعرہ لگاتے۔ میں نے اپنی منحنی آواز کو مقدور بھر بلند کر لیا مگر امجد صاحب کی تسلی نہ ہوئی۔ انہوں نے ”اور بلند“ کی گرجدار آواز کے ساتھ اپنا زوردار ہاتھ میرے سر کی گدی میں جڑ دیا۔ میں نے تقریر تو جاری رکھی مگر آنکھوں میں آنسو اور آواز میں لرزش آ گئی۔ امجد صاحب میرے قریب آئے اور ملائمت سے پوچھا، ”مولانا! زیادہ زور سے تو نہیں لگی؟“ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ نفی میں سر ہلایا اور پھر سے تقریر کرنے لگا۔ جس دن تقریری مقابلہ ہونا تھا امجد صاحب نے مجھے کہا کہ تقریر کے دوران وہ مجمعے کے عقب میں سٹیج کے سامنے موجود ہوں گے، میں ان پر نظر رکھوں اور ان کے اشاروں کے مطابق عمل کروں۔ تقریری مقابلے کا پنڈال سکول کے وسیع و عریض فٹ بال گراؤنڈ میں سجا تھا۔ مختلف شہروں سے بہت سے لڑکے اور لڑکیاں اور ان کے اساتذہ اس مقابلے میں شرکت کے لیے موجود تھے۔ کنٹونمنٹ بورڈز کے عہدیدار اور مقابلے کی منصفی کے لیے ان کا مقرر کردہ ججز کا پینل بھی

سامنے تھا۔ میں اس وقت ساتویں یا آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ بڑے مجمعے کے سامنے تقریر کرنے کا تجربہ نہ تھا مگر امجد صاحب مسلسل میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ مجھے ہر بار کہتے کہ ان میں ایک بھی تم جیسا نہیں، تم ہی یہ مقابلہ جیتو گے اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ غیر یقینی کی کیفیت میں ان کے سامنے اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ میری باری آئی تو میں ان کی ہدایت کے مطابق تیز قدموں کے ساتھ سٹیج کی جانب بڑھا۔ روسٹرم پر پہنچا تو حاضرین کے عقب میں امجد صاحب کا مسکراتا چہرہ نظر آیا۔ میں نے تقریر شروع کی اور مجمعے پر نظریں دوڑانے کے ساتھ ساتھ امجد صاحب پر بھی نگاہ رکھی۔ جب آواز بلند کرنا مطلوب ہوتا تو امجد صاحب اپنے ہاتھ کو پلیٹ کی شکل دے کر قدرے بلند کرتے اور جب لہجے کو دھیما کرنا مقصود ہوتا تو اسی پلیٹ کو الٹا کر نیچے کی طرف لے جاتے۔ میں ایک پُتلی کی طرح ان کے اشاروں پر عمل کرتا رہا۔ حاضرین تقریر کے دوران وقفے وقفے سے بے ساختہ تالیاں بجاتے رہے۔ میں تقریر ختم کر کے سٹیج سے اترا تو مجمع تالیوں اور تحسینی کلمات سے گونج اٹھا۔ فیصلے کی گھڑی آئی تو مجھے انعام سے کہیں زیادہ صرف اس بات کی فکر تھی کہ سر امجد میری تقریر سے مطمئن تھے کہ نہیں۔ فیصلہ سنایا گیا تو مجھے پہلی پوزیشن کا مژدہ سننے کو ملا۔ میں لپک کر یعقوب امجد صاحب کے پاس پہنچا جنہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا، ”تم نے وہ کر دکھایا جو میں چاہتا تھا۔ تم نے میرا سر بلند کر دیا۔ ویل ڈن مائی چائلڈ“۔ اپنے مہربان استاد کی آنکھوں کے گوشے خوشی اور طمانیت سے بھیگے دیکھے تو مجھے لگا میں دنیا کی بلند ترین جگہ پر جا کھڑا ہوا ہوں۔

سکول سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی ہمیشہ امجد صاحب سے میرا رابطہ رہا۔ جب بھی میں ان سے ملنے جاتا وہ بڑی محبت سے پرانی تصاویر نکال لاتے جن میں مجھ سمیت ان کے بہت سے پرانے شاگردوں کے چہرے جگمگا رہے ہوتے۔ ایک دفعہ جب میں اپنی فیملی کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ میری بیوی کو بہو جیسا پیار دیا۔ بچوں کے دادا بن گئے اور ان پر اپنی محبت کے تمام در وا کر دیے۔ ان کو بھی میری اور دیگر شاگردوں کی وہ تصاویر دکھاتے رہے جو میرے پاس بھی محفوظ نہ تھیں۔ اس مختصر سی ملاقات میں بھی ان کے اندر کا استاد بیدار ہو گیا اور بچوں کی علمی استعداد کو جانچتے رہے۔ اپنی خوشی اور طمانیت کا اظہار کیا اور پھر ایک تاریخی جملہ کہا جو میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے، ”شاباش بیٹا تم نے امانت آگے کامیابی اور ایمانداری سے منتقل کی ہے“۔ مجھے لگا میرے سینے پر کسی نے سارے میڈل سجا دیے ہیں۔ مجھے آج اعتراف ہے کہ میری صلاحیتوں کو نکھارنے میں یعقوب امجد صاحب کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ آج میرے شفیق اور محترم استاد آسودۂ خاک ہیں اور مجھے وہ مٹی بھی عزیز ہے۔

اے خاکِ تیرہ دلبرِ مارا عزیز دار
ایں نورِ چشمِ ماست کہ بہ در گرفتہ ای

☆☆☆☆

ڈاکٹر نجیبہ عارف

جگہیں، چہرے، یادیں اور خیال

(۳)

ہائیڈل برگ اور اس کے تلازمات

ہائیڈل برگ میں مجھے ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ اس اپنائیت کی وجہ بہت تہ دار اور گہری تھی۔ سامنے کی بات تو یہ تھی کہ یہاں میں کچھ لوگوں کو پہلے سے جانتی تھی، ایک مرتبہ پہلے بھی ہائیڈل برگ آنا ہوا تھا اور میں نے اس کے قدیم قلعے کی گھنٹوں سیر کی تھی، پہاڑی کے ایک سرے پر بیٹھ کر دیر تک ہائیڈل برگ کے عین درمیان میں لیٹے ہوئے دریائے نیکر (Neckar) کی نیلی، چمک دار لکیر کے ساتھ ساتھ بہہ کر دیکھا تھا اور ایک سڑک کے کنارے نصب اس پتھر کے ساتھ تصویر کھنچوائی تھی جس پر جرمن زبان میں اقبال کا نام لکھا تھا۔ لیکن دور کہیں گہرائی میں اس شہر اور اس دریا سے میرا ایک اور رشتہ بھی نکلتا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے، کہ ہائیڈل برگ اور دریائے نیکر کے الفاظ میں نے پہلی بار تب سنے، بلکہ پڑھے تھے، جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ یہ بات ہے سنہ ۱۹۷۴-۵ کے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول خوشاب کی۔ خوشاب ان دنوں ضلع سرگودھا کی ایک تحصیل ہوا کرتا تھا۔ چھوٹا سا گرد آلود قصبہ، مگر اپنے اردگرد موجود زیادہ چھوٹے اور زیادہ گرد آلود قصبوں کے لیے ایک مرکزی شہر، جس میں ایک بڑا سول ہسپتال، تحصیل، تھانہ اور لڑکیوں اور لڑکوں کے ہائی سکول تھے۔ باقی سرکاری اداروں کی کارکردگی کا تو مجھے علم نہیں لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ خوشاب کا گرلز ہائی سکول ان دنوں پورے ضلع میں اپنی الگ پہچان رکھتا تھا۔ جب اس سکول کی لڑکیاں بین الکلیاتی مقابلوں کے لیے سرگودھا اور کبھی کبھی فیصل آباد جاتیں، تو لوگ دور سے پکارتے، "لو دیکھو! خوشاب کے جن آ گئے۔"

وہ بالکل ٹھیک کہتے تھے، یہ سب کی سب دیہاتی لڑکیاں ہوتیں جو خوشاب کے اردگرد کے دیہات سے پڑھنے کے لیے خوشاب آتی تھیں، صحت مند، جاندار، بے پروا، دیکھنے میں گھاس کاٹنے والی لگتیں، لیکن جب کھیل کے میدان میں اترتیں یا تقریر، بیت بازی اور فی البدیہہ شعر خوانی کے لیے مائک کے سامنے کھڑی ہوتیں تو پنڈال پہلے تو دنگ رہ جاتا، ہر طرف سناٹا چھا جاتا اور پھر تالیوں کی گونج سے چھت اڑنے کا امکان پیدا ہو جاتا۔ سرگودھا بڑا شہر تھا، بڑے بڑے سکول تھے، بڑے بڑے ہال تھے؛ جن میں داخل ہوتے ہی دل پر بوجھ پڑتا تھا، چمکتے ہوئے روسٹرم تھے، سٹیج پر لمبی پشت اور مخملی گدیوں والی تخت نما کرسیاں تھیں اور ساڑھیاں زیب تن کیے ہوئے خوب صورت استانیاں تھیں، جن سے بات کرتے ہوئے حلق میں گولے سے پھنس جاتے

تھے۔ خوشاب کی دیہاتی لڑکیاں وہاں کیا رنگ جماتیں۔ لیکن یہ ان ہونی بھی ہوئی اور وہ اس لیے کہ خوشاب کے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کو ایک ایسی ہیڈ مسٹریس مل گئیں، جو شاید اس علاقے کی تقدیر بدلنے پر مامور من اللہ تھیں۔ ان کا پورا نام تو ثریا عنایت تھا، لیکن وہ کہلاتیں مس عنایت تھیں۔ سراپا عنایت۔ لیکن ایسی عنایت نہیں جو سامنے دھری ہو، ایسی عنایت جو برسوں بعد اپنا رنگ دکھائے۔ جو نسلوں تک کی ہڈیوں میں اتر جائے، جو خاندانوں کی جڑوں میں تہذیب کا رس بن کر دیر تک ٹھہری رہے۔

وہ سرگودھا کی رہنے والی تھیں اور لاہور سے تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے کہ شاید وہ ایسی خوب صورت نہیں تھیں لیکن ان کی شخصیت کیا شاندار تھی۔ ان کا لباس، ان کا اندازِ گفتگو، ان کی پروقار چال، ان کا بارعب چہرہ جس کی طرف دیکھنے کی تاب نہیں ہوتی تھی۔ یہ سب تو تھا ہی لیکن ان کی جس ادا نے خوشاب میں پیدا ہونے والی کئی نسلوں پر اپنے اثرات مرتسم کیے، وہ ان کی اپنے طالب علموں کو دنیا کے سامنے اپنے شہکار کی طرح پیش کرنے کی آرزو تھی۔ انھوں نے اس سکول میں کیا کیا نہ کیا۔ تعلیمی میدان میں تو انھوں نے جو اقدامات کیے سو کیے لیکن شخصیتوں کی تعمیر و تہذیب میں جو کمال دکھایا، اس کا قرض ہم کبھی ادا نہیں کر پائیں گے۔ خود لاہور جا کر لائبریری کے لیے ہر طرح کی کتابیں لے کر آتیں، پھر لائبریری کا پیریڈ مقرر کر کے ہر جماعت کو باری باری لائبریری جانے کا پابند کرتیں۔ جب کوئی نئی کتاب آتی تو اچھے طالب علموں سے پوچھتیں کہ انھوں نے وہ کتاب پڑھی یا نہیں۔ پروین شاکر کی ”خوشبو“ انھوں نے ہی مجھے پڑھنے کو دی تھی، حالاں کہ گھر میں ہمیں اخبارِ خواتین میں سے بھی صرف بچوں کا صفحہ پڑھنے کی اجازت ہوتی تھی۔

انھوں نے کھیلوں اور ہم نصابی سرگرمیوں کے لیے ایک ایک استاد کو مقرر کر دیا تھا جو پہلے کچھ لڑکیوں کو، ان کی خفیہ صلاحیتوں کے اشارے پا کر، مختلف مقابلوں کے لیے منتخب کر لیتے، پھر تین ماہ تک مسلسل ان کی تربیت کرتے اور پھر انھیں ضلعی مقابلے میں بھیجتے۔ لیکن صرف یہی نہیں، مقابلے میں بھیجنے سے پہلے وہ لڑکیوں کے لباس پر بھی کڑی نظر رکھتیں۔ انھیں پہننے اوڑھنے کا سلیقہ سکھاتیں، بعض اوقات لباس کے معاملے میں مشورے دیتیں، کبھی ہوسٹل میں رہنے والی کھلاڑی لڑکیوں کے لیے اپنی زیرِ نگرانی لباس تیار کرواتیں، انھیں بالوں کو سلیقے سے باندھنے یا ترشوانے کی ہدایت دیتیں۔ مجھے بھی پہلی بار بال کٹوانے کی شہ انھی سے ملی تھی کیوں کہ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ میں لمبے بالوں کو سلیقے سے سنبھال نہیں سکتی۔ بال ہی نہیں، انھوں نے پہلی بار سرگودھا بھیجنے سے پہلے ہماری مباحثے کی ٹیم کے لیے ہماری والدہ سے سلیولیس قمیض اور ٹراؤزر بھی سلوائے تھے۔ سلیولیس قمیض کے نیچے انگریزی ڈیزائن کی بُنی ہوئی پوری آستین کی لال سویٹر بھی انھوں نے ہی ہمیں پہنوائی تھی تا کہ ہمیں کوئی ثقافتی دھچکا نہ پہنچے۔ اس منفرد یونی فارم نے ہمارے دیہاتی پن کی کم از کم آدھی جھجک ضرور دور کر دی تھی۔ اور بھی کتنی یادیں ہیں، جو مس عنایت کے تصور سے جڑی ہوئی ہیں۔ کتنے احسان ہیں، جو اس روح کو شاداب و سیراب کیے ہوئے ہیں۔

ان کے دفتر کے پیچھے چھاؤں کیے ہوئے انجیر کے گھنے درخت کی طرح ہر سبز اور پھل دار۔
سکول میں جابجا چھوٹے چھوٹے قطعوں پر، دیسی گلاب کے پھولوں سے لدی ہوئی کیاریوں میں
گھرے چمنوں کی طرح معطر اور خیال انگیز۔

مجھے یاد ہے جب میں نے چھٹی جماعت میں داخلہ لیا تو مس عنایت کو معلوم ہوا کہ میں پرائمری سکول میں تقریریں وغیرہ کرتی رہی ہوں۔ انھوں نے پہلے چند دنوں میں ہی مجھے اپنے دفتر میں بلا بھیجا، بانس کی تیلیوں کی چق اٹھا کر جب میں ان کے کشادہ دفتر میں داخل ہوئی تو میرا حلق سوکھ رہا تھا اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ ہیڈ مسٹریس کے دفتر میں حاضری دینا ان دنوں آسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے تقریریں کرنے کا شوق ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ انھوں نے کہا،

''اچھا کسی تقریر کا کوئی حصہ یاد ہے تو سناؤ!'' میں نے ڈرتے ڈرتے آغاز کیا لیکن تھوڑی ہی دیر میں تقریر کے بہاؤ میں بہہ گئی اور ڈرنا بھول گئی۔

شاید اسی دن مس عنایت نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھ پر اپنا کمالِ فن آزمائیں گی۔ اس طرح وہ نجانے کتنوں کو منتخب کر چکی تھیں۔ بس پھر انھوں نے مجھے اپنی نگاہ میں رکھ لیا۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں، جیسی بھی ہوں، ویسا بننے میں اس نظر کا فیضان شامل رہا ہے۔ انھوں نے میری امی سمیت، جو اسی سکول کی استاد تھیں، تین اساتذہ کو بلا کر انھیں تاکید کی کہ مجھے آئندہ آنے والے تین مقابلوں کے لیے تیار کریں۔ ایک تو فی البدیہہ مباحثہ تھا، دوسرا مقابلۂ بیت بازی اور تیسرا تحت اللفظ شعر خوانی۔ تینوں اساتذہ نے میرے سکول کے پورے دن کے نو پیریڈز کو برابر برابر تقسیم کیا اور مجھے بتا دیا کہ کس کس پیریڈ میں مجھے کس کس استاد کے ساتھ ان کی کلاس میں جانا ہے۔ گھر میں امی کا تدریسی و تربیتی پروگرام پہلے سے جاری تھا۔ اس کے بعد سکول میں بھی تربیت کا ایک متوازی پروگرام شروع ہو گیا اور ایک لمبی کہانی کا آغاز ہوا۔

میرے لیے تو یہ حکایت بہت لذیذ ہے اور میں اسے تا دیر مزے لے لے کر دہرا سکتی ہوں لیکن فی الحال صرف تحت اللفظ شعر خوانی کا ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ ان دنوں بین الکلیاتی مقابلۂ شعر خوانی کے لیے با قاعدہ ایک نصاب مقرر تھا جو ضلعی سطح پر ہر سکول کو بھیج دیا جاتا تھا۔ جب میں چھٹی میں تھی تو یہ نصاب تھا، کلیاتِ اقبال (اردو)۔ اب سوچتی ہوں تو یقین نہیں آتا کہ ان دنوں ہائی سکول کے طالب علموں سے کیسی توقعات رکھی جاتی تھیں اور وہ طالب علم ان توقعات کو پورا بھی کر گزرتے تھے۔ حیرت تو یہ ہے کہ یہ باتیں کسی بڑے شہر کے بڑے اسکول کی نہیں، ایک چھوٹے سے قصبے کے پس ماندہ سے سکول کی ہیں، جہاں پڑھانے والے کم و بیش سبھی استاد مقامی ہوتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی کسی معروف ادارے سے تعلیم یافتہ نہیں تھا، کسی کے پاس بڑی بڑی ڈگریاں نہیں تھیں؛ زیادہ سے زیادہ بی اے۔ بی ایڈ۔ اور زیادہ تر تو ایس۔ وی۔ یا جے۔ وی۔ خود مس عنایت بھی بی اے۔ بی ایڈ ہی تھیں۔ کوئی غیر معمولی طور پر خوشحال گھرانے سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ کسی کے گھر

میں بچوں اور خاندان والوں کی دیکھ بھال کے لیے نوکر چاکر نہیں ہوتے تھے۔ اکثر اساتذہ مشترکہ خاندانی نظام کا حصہ تھے جہاں انھیں پورے خاندان کی ذمہ داریاں اٹھانی اور نبھانی پڑتی تھیں۔ اس سب رکاوٹوں اور دشواریوں کے باوجود، ان کا وژن، ان کی محنت، ان کی پیشے سے قلبی وابستگی، انھیں مسیحا بنائے دیتی تھی۔

ان تین مہینوں کے دوران، اور اس کے بعد مسلسل پانچ سال تک ہر سال، میں نے مختلف کلاسوں کے سامنے تختۂ سیاہ کی طرف پیٹھ اور لڑکیوں کی طرف منھ کر کے، زمین پر بیٹھے بیٹھے، پوری کلیات اقبال (اردو) تین تین مرتبہ بلفظ بلفظ، بآوازِ بلند، پڑھی۔ وہیں میں نے پہلی بار بانگِ درا کے حصہ دوم میں نظم ''ایک شام'' پڑھی تھی جس کا ذیلی عنوان تھا: ''دریائے نیکر (ہائیڈل برگ) کے کنارے پر''۔

خوشاب کے گرلز ہائی سکول کی چھٹی جماعت کی لڑکی، جس کے پاس صرف ایک ہی شے فراواں تھی، اس کا تخیل، اور جس کے سامنے بڑے شہر کا ایک ہی نقشہ تھا، سرگودھا: جب جماعت کے ننگے فرش پر بیٹھ کر، بآوازِ بلند پڑھتی تھی:

خاموش ہے چاندنی قمر کی   شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش   کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بیہوش ہو گئی ہے   آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے   نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے   یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا   قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل! تو بھی خموش ہو جا   آغوش میں غم کو لے کے سو جا

تو جہاں اس کے تصور کے آسمان پر غم کو آغوش میں لے کے سو جانے والے خموش دل کی راحت کا تصور بیدار ہوتا تھا، اور جہاں ش۔۔ش۔۔ش کی سرگوشیوں سے ایک ایسے لاانتہا سکوت کا احساس پیدا ہوتا تھا جو زمین و آسمان کی بے کرانی پر محیط ہو، اور جہاں چاندنی میں نہائے ہوئے سبز پوش اشجار، کہسار اور دشت و دریا سے رشتہ استوار ہوتا تھا، وہیں، اس کے ذہن کے پردوں پر ایک بالکل انجانی تصویر بھی جھلملاتی تھی۔ ''دریائے نیکر (ہائیڈل برگ)'' کے کنارے کی تصویر۔

وہ بچی ہائیڈل برگ کا کوئی تصور نہیں کر پاتی تھی۔ دریا البتہ اس نے اچھی طرح دیکھ رکھا تھا۔ کناروں تک بھرا ہوا، کبھی بے نیازی سے اپنی ہی دھن میں مست، چپ چاپ، اور کبھی کسی اندرونی جوش سے سرشار، بپھرا ہوا۔ دریا تو اس کے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا جہاں جانے کا موقع ملتا یا نہ ملتا، اس کے ہونے کے احساس کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ لیکن یہ ہائیڈل برگ کہاں تھا، دنیا کے کس گوشے میں، کرۂ ارض کے نقشے پر جرمنی کی لکیروں کے اندر ایک نقطہ دیکھ کر کیا پتا چلتا کہ ہائیڈل برگ کیسا ہے اور اس میں بہنے

والا دریائے نیکر کس رنگ کا ہے، جہاں جا کر اقبال قدرت کے مراقبے کا حصہ بن گئے تھے۔

اس دریائے نیکر اور اس کے اردگرد کی فضا کے بارے میں اس بچی کے خیال نے کتنے ہی منظر تراشے تھے، اپنے تخیل کی شدت سے اس کی فضا کو اپنے اندر زندہ کیا تھا، اس کے خرام کے فسوں کا حصہ بنی تھی، اس کی خاموشی کی سب آوازیں سنی تھیں، اس کے بہتے ہوئے پانی کی سطح پر جھک کر اپنا عکس دیکھا تھا، اس میں تیرتے ہوئے چاند سے باتیں کی تھیں، شاخوں سے چھنتی ہوئی چاندنی کو سائے کی طرح گلے لگایا تھا۔ اقبال کی وہ ایک شام اس کی زندگی کے ہر صفحے پر نقش ہو گئی تھی، اس کے لاشعور کا حصہ بن گئی تھی۔

اسی لیے مجھے ہائیڈل برگ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اسی لیے میں نے یہیں آنے کا بہانہ ڈھونڈا تھا۔ اسی لیے میں نے دو ہفتوں کا پروگرام بنایا تھا۔ سوچا تھا کہ روز شام کو اکیلی نیکر کے کنارے جا کر ٹہلا کروں گی، اپنے زمانے میں، اپنے بچپن کے زمانے میں اور اقبال کے زمانے میں جیوں گی۔ ایک ایک لہر کو اپنے تخیل کی موج سے ملا کر دیکھوں گی، کہاں کہاں شباہت ایک سی ہے، کہاں کہاں میرے خیال نے غوطہ کھایا ہے اور کہاں کہاں دریا موڑ مڑ گیا ہے۔ لیکن یہ خواب بھی ٹوٹ گیا اور ٹوٹا بھی ایک دوسرے خواب کے ہاتھوں۔

میں ایک بار بھی اکیلی دریا کے کنارے تک نہ جا سکی۔ جتنے دن میں وہاں رہی، روز بارش اور اکثر برف باری ہوتی رہی۔ ہوا اس قدر ٹھنڈی تھی، کہ سارے رومانوی خیالات دھواں بن کر اڑ گئے۔ صرف ایک بار میں کرسٹینا کے ساتھ دریا تک گئی۔ لیکن پل پر کھڑے ہونے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ اس قدر سرد ہوا چہرے پر برسنے لگی کہ بے اختیار میں نے منھ موڑ لیا۔

شاید اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

شاید اب خواب اور حقیقت کو ایک کر دینا ممکن نہیں رہا تھا۔

شاید اب صرف منظر کافی نہیں رہا تھا، دل کے تقاضے بڑھ گئے تھے۔

ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ

ہائیڈل برگ میں ایک جگہ اور بھی ایسی تھی جہاں میرے قلب و نظر کی تسکین کے کئی سامان تھے؛ ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ۔ ایک نسبتاً قدیم عمارت، جس کے بیچوں بیچ سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کا مہمان خانہ اسی عمارت کی سب سے بالائی منزل پر واقع ہے لیکن اکثر لوگ وہاں تک پہنچنے کے لیے لفٹ کی بجائے سیڑھیوں کا استعمال کرتے ہیں۔ لفٹ صرف وہی استعمال کر سکتے ہیں جو اس مہمان خانے میں مقیم ہوں یا جن کے پاس یہاں تک رسائی کی باقاعدہ اجازت ہو۔ اس لفٹ کے دروازے بہت بھاری لوہے کے بنے ہوئے ہیں اور بے اختیار جرمن قوم کی ترجیحات کی یاد دلاتے ہیں۔ میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ جرمنی کی مصنوعات میں مضبوطی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ نزاکت اور لطافت کی بجائے قوت اور طاقت سے محبت شاید ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ مجھے یاد آیا پچھلی مرتبہ جب میں برلن گئی تھی تو ان کی قومی اسمبلی میں بھی جانے کا

اتفاق ہوا تھا۔ اسمبلی میں مرکزی نشست گاہ کے عین درمیان ایک بہت بڑا عقاب آویزاں تھا۔ یہی عقاب ان کے سرکاری جھنڈے پر بھی نقش ہے۔ اقبال اگر جرمن قوم اور اس کے فلسفے سے متاثر تھے تو کوئی عجب نہیں کہ ان کے تصورِ شاہین کا ماخذ بھی یہی عقاب ہوا اور پھر نطشے (۱۸۴۴۔۱۹۰۰) بھی تو اسی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔

ہائیڈل برگ کی پہلی صبح کرسٹینا کے فون سے آنکھ کھلی تھی جو کہہ رہی تھیں کہ وہ میرے لیے ترکی نان لے آئی ہیں اور اب میرے کمرے میں آ رہی ہیں تاکہ میں ناشتے میں استعمال کر سکوں۔ پھر وہ تین منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئیں تاکہ مجھے نان دے سکیں۔ مجھے سخت ندامت ہوئی، انھوں نے یہ نان اپنے میاں کو بھیج کر منگوائے تھے۔ کرسٹینا کے جانے کے بعد میں نے کھڑکی کے پردے ہٹائے تو سارا شہر برف کی چادر اوڑھے سامنے آ گیا۔ بہت دلکش منظر تھا۔ درختوں سے سفید پتے لٹک رہے تھے، گھاس پر چاندنی بچھی تھی، سڑکوں پر دوڑتی ہوئی کاروں کی چھت پر برف کے گدّے پڑے تھے۔ میں نے بے اختیار بالکونی کا دروازہ کھول دیا۔ کرسی برف سے بھری ہوئی تھی۔ چھوٹی سی گول میز پر برف کا ناشتہ سجا ہوا تھا۔ لیکن میں نے اندر آ کر ترکی نان کا ناشتہ کرنے کو ترجیح دی۔

ناشتے کے بعد میں نے بیگ اٹھایا اور لائبریری چلی گئی۔ سب سے پہلے کرسٹینا کی مدد سے لائبریری کارڈ بنوایا اور پھر کتابیں ڈھونڈنے کی تکنیک سے متعلق رہنمائی حاصل کی۔ کرسٹینا کے جانے کے بعد میں وہ کتابیں ڈھونڈنے لگی جو رات کو نوٹ کی تھیں مگر بہت جلد محسوس ہونے لگا کہ اس لائبریری سے مانوس ہونے میں کچھ وقت لگے گا کیوں کہ یہ ویسی صارف دوست نہیں ہے جیسی سواس کی لائبریری ہے۔ لائبریری کا سامنے کا حصہ تو جدید اور آرام دہ ہے لیکن جنوبی ایشیا کے لیے مخصوص عمارت قدیم ہے۔ عمارت کا یہ حصہ خاصا پیچیدہ ہے، راہداریاں پیچ دار، گلیاں سنسان، بھاری بھاری دروازے، گھومتی ہوئی سیڑھیاں، ایک طرف سے داخل ہوں تو دوسری طرف سے باہر نکل جاتے ہیں، تاریک تاریک کمرے، جن میں داخل ہوں تو خود بخود روشنی جل اٹھتی ہے مگر تاریکی کا لمس دیر تک محسوس ہوتا رہتا ہے۔ پھر اس لائبریری میں وائی فائی کی سہولت نہیں ہے اور لائبریری کمپیوٹر پر بھی انٹرنیٹ استعمال کرنے کے لیے یونیورسٹی کا مستقل ممبر ہونا ضروری ہے لہٰذا مجھے یہ سہولت بھی میسر نہیں آئی۔ حتیٰ کہ کیٹیلاگ دیکھنے کے لیے بھی ایک مخصوص کمرے میں جا کر، جو نیچے تہ خانے میں ہے، کمپیوٹر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ کتابیں ڈھونڈنا آسان نہیں ہوتا، پھر کچھ کتابیں جو مجھے درکار تھیں وہ صرف مرکزی لائبریری میں تھیں جو شہر میں ہے، کچھ شیلف پر موجود نہ تھیں، شاید کسی اور کے استعمال میں ہوں اور کچھ جو ہاتھ آئیں انھیں اوپر تک لانا مشکل ہو گیا۔ نیچے ٹھنڈ بھی بہت تھی۔ مجھے دوبارہ اوپر آ کر سویٹر پہننا پڑا۔ پہلے پہل مزا نہیں آیا لیکن آہستہ آہستہ اور کرسٹینا کی مسلسل مدد سے، میں اس لائبریری سے بھی مانوس ہو گئی۔ اس لائبریری کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انیسویں صدی کی مطبوعات کے کئی نسخے یہاں موجود ہیں۔ خاص طور پر اردو نصابات کے نمونے بآسانی نظر آتے ہیں۔ ہماری تاریخ کے وہ گوشے جہاں جھانکنے میں ہم

خود بھی دلچسپی نہیں رکھتے، یہاں آسانی سے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

ہائیڈل برگ کا قیام رنگ رنگ کی سرگرمیوں کی وجہ سے بہت پر لطف گزرا۔ دوپہر کو اکثر میں، کرسٹینا، ام المنان، مالا، گوتم اور تامل زبان کے جرمن استاد ڈاکٹر تامس لیہمان یونی ورسٹی کے کینٹے ٹیریا میں جسے یہ لوگ "میزا" کہتے ہیں، لنچ کیا کرتے تھے۔ لنچ کے دوران جرمن قوم کی معیشت، یورپی یونین کے مسائل اور تاریخ و معاشرت کے کئی پہلوؤں پر بحث ہوتی۔ ام المنان طویل مدت سے یہاں اردو پڑھا رہی ہیں۔ بے حد مہربان، بہت خیال رکھنے والی خاتون۔ ایفرٹ میں بھی ان کے ساتھ تین ہفتے گزارنے کا موقع ملا تھا۔ تب سے اب تک کسی نہ کسی طور ان سے رابطہ رہا۔ اب بھی ان کا یہاں ہونا بہت تسلی دیتا تھا۔ مالا سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ باوقار شخصیت اور دھیمے مگر مستحکم لہجے کی مالک۔ پورا نام مالا الفاروق تھا۔ کلکتہ سے تعلق رکھتی تھیں اور بنگالی کی استاد تھیں۔ ایک روز مالا نے اپنے شوہر سے بھی ملوایا جو یہاں ریڈیو کی اردو سروس میں کام کرتے تھے اور اب ریٹائر ہو چکے تھے۔

یہ تو وہ لوگ تھے جس سے تقریباً روزانہ ملاقات رہتی۔ ان کے علاوہ وقار صاحب اور بلوچ صاحب سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔ وقار صاحب یہاں اقبال چیئر پر تعینات تھے اور اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھے۔ قائد اعظم یونی ورسٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے بہت خلوص سے کھانے کی دعوت دی لیکن ایک حادثے کی وجہ سے عین وقت پر یہ دعوت منسوخ کرنا پڑی۔ ایک روز ڈاکٹر عنایت اللہ بلوچ صاحب مجھے ملنے آ گئے۔ یہ کئی برس سے یہاں مقیم ہیں۔ ان کے ساتھ دو گھنٹے کینٹے میں بیٹھی رہی، کافی پی اور بہت سی باتیں کیں۔ خلافت، جمہوریت، بلوچ مزاحمت، مغرب اور دائیں اور بائیں بازو کی خصوصیات پر بہت عالمانہ گفتگو کی۔ یہ ساری گفتگو ان کے زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ تھی اور اس لائق تھی کہ اسے محفوظ کیا جاتا۔ انھیں شکایت تھی کہ مغربی ممالک اپنے شہریوں کو تو خوش رکھتے ہیں مگر باہر لوٹ مار کرنے سے ذرا نہیں شرماتے۔ ان کی تمام تر ترقی غریب اقوام کے لہو پر منحصر ہے۔

دوسری طرف جرمن لوگ بھی اپنی معیشت اور سرکاری پالیسیوں سے خوش نظر نہیں آئے۔ لنچ پر جب بھی گوتم اور ڈاکٹر لیہمان سے بات ہوئی تو انھیں جرمن معیشت کی بدحالی سے پریشان ہوتے دیکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت منافع کی شرح روز بروز کم کر رہی ہے اور افراطِ زر بڑھتا جا رہا ہے۔ پہلے جرمنی ایک فلاحی مملکت تھا۔ شہریوں کے حقوق کی حفاظت ہوتی تھی۔ انھیں تعلیم، صحت اور رہائش جیسے بنیادی سہولتوں کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی مگر اب یہاں بھی سرمایہ دار ممالک کی طرح ہر سہولت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ دوسری طرف مشرقی جرمنی کے ادغام سے معیشت پر بہت بوجھ پڑ رہا ہے۔ یورپی یونین کے قیام کے بعد بھی جرمنی کی معیشت مندی کی زد میں آ گئی ہے۔ رومانیہ، ہنگری جیسے ممالک سے لوگ دھڑا دھڑ روزگار کی تلاش میں ترقی یافتہ ممالک میں آ رہے ہیں اور اس کی قیمت ان ممالک کے شہریوں کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔

مجھے یاد آیا کہ ۲۰۰۸ میں ایفرٹ میں قیام کے دوران بھی میں نے ایک ایسے سیمی نار میں شرکت کی تھی جس میں مشرقی جرمنی کے ادغام کے بعد مغربی جرمنی کی معیشت پر پڑنے والے اثراتِ بد کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس سیمی نار میں ہونے والی گفتگو کا لب لباب بھی یہی تھا کہ مشرقی جرمنی سے آنے والوں کا تعلیمی معیار کمزور ہے اور ان کی استعدادِ کار بھی نسبتاً کم ہے لیکن انھیں برابری کے حقوق حاصل ہیں۔ مجھے ان لوگوں کی گفتگو سن کر بار بار یہ خیال آتا تھا کہ ہم ترقی پذیر ممالک کے لوگوں کے لیے یہ ترقی یافتہ ممالک کسی جنت سے کم نہیں لیکن یہاں کے رہنے والے بھی اپنی زندگیوں سے خوش نہیں ہیں۔ تو پھر خوشی اور اطمینان قلب کہاں ہے؟ کیا صوفیوں کا یہ کہنا درست ہے کہ یہ انسان کی ذاتی قلبی کیفیت ہے، اسے اجتماعی معاشرتی احوال سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ میں تقریباً ہر روز ہی شام کو کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی رہی۔ ایک شام، ایک انڈین جوڑے نے انڈیا میں ٹینٹ سینما پر تصویری نمائش کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کافی لوگ تھے جو شہر سے آئے تھے، جرمن ہند وفاؤنڈیشن اور کئی دوسری تنظیموں کے لوگ بھی تھے۔ یہ لوگ انڈیا میں ٹینٹ سینما پر فلم بنا رہے تھے جس کی جھلکیاں بھی دکھائی گئیں۔ ٹینٹ سینما مہاراشٹر کے دیہی علاقوں میں تھیٹر سے ملتی جلتی قدیم روایت ہے جو اب بھی قائم ہے۔ اس چلتے پھرتے سینما کے ذریعے بالی وڈ کی مقبول ترین فلموں، مقامی زبان کے ڈراموں اور مزاحیہ، دیومالائی یا تاریخی قصوں کو ڈرامے کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے اور ان علاقوں میں اب بھی خاصا مقبول ہے۔ محققین کا مقصد یہ تھا کہ اس ٹینٹ سینما کو تھیٹر کی تاریخ اور روایت میں اس کا جائز مقام دلایا جائے اور مقامی سماج پر اس کے اثرات کا مطالعہ کیا جائے۔ نمائش میں جو تصویریں آویزاں کی گئیں ان کے نیچے درج بیانات بھی دلچسپ تھے۔ ایک تصویر کے نیچے لکھا تھا:

یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے، میں نے ایک چلتے پھرتے سینما میں داخل ہونے کی کوشش کی تو اس کے مالک نے مجھے کہنی سے پکڑ کر باہر نکال دیا، حالاں کہ یہ مفت سینما تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ روپیہ میرے پاس موجود تھا سو میں نے اگلے ہی روز ایک ایسا ہی سینما خریدا اور اگلے دن سے شو پیش کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی میں اپنے علاقے میں چلتے پھرتے سینما کا شہنشاہ بن گیا۔

قادر بھائی مُنیار۔ مالک جنتا ٹورنگ ٹاکیز، سنگولا۔

ایک اور تصویر کے نیچے لکھا تھا:

میں نیند میں بھی پروجیکٹر ٹھیک کیا کرتا تھا۔ مجھے ان کے خواب آتے تھے۔ پھر میں نے سوچا، ہوں گے ان کے بنانے والے جرمن، امریکی یا کچھ اور، لیکن آخر وہ انسان ہی تو ہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ میں ان غیر ملکی پروجیکٹروں کے قریب جگہ نہیں بنا سکتا۔

پرکاش پھلادی۔ پروجیکٹر مکینک

ایسی ہی چند ایک اور تصویریں بھی تھیں۔ یہ تصویری نمائش مختلف شہروں میں پیش کی جانے والی تھی۔ لوگوں نے خاصی دلچسپی سے یہ نمائش دیکھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ انڈیا محققین کی دلچسپی کا مرکز بن چکا ہے، لوگ وہاں کی چھوٹی چھوٹی بات کو اہمیت دیتے ہیں اور مقامی ثقافت کا اظہار سمجھ کر مرکزی دھارے میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہم ہیں کہ خود اپنے تہذیبی ورثے سے بے خبر، بے زار اور شرمندہ رہتے ہیں اس لیے کسی اور کی توجہ بھی ادھر نہیں جاتی۔ مجھے روہی کے صحرائی گیت یاد آئے، خود اپنے علاقے اٹک کی میراثیوں کی اونچی پاٹ دار آواز، اور دل سوز بولوں والے شادی بیاہ، پردیس، وچھوڑے اور مسافرت کے "گاون" یاد آئے، ڈھولک اور گھڑا بجانے والے گنی فن کار یاد آئے، نمونے کا ٹھپہ لگائے بغیر سفید چادروں کے کنارے پر سندھی ٹانکے کی نیلی بیلیں کاڑھنے والی گھریلو لڑکیاں یاد آئیں، پھلکاریاں بنانے، ہاتھ کے پنکھے اور رنگین چنگیریں سجانے والی ان پڑھ عورتیں یاد آئیں، ہمارے گھر کام کرنے والی حافظ آباد کی نذیراں یاد آئی جو چرخے پر کپاس کات کر دیسی کھیس بنوا سکتی ہے، کروشیے سے ایسے ایسے نمونے بنا لیتی ہے کہ انسان دیکھتا رہ جائے، رضائیاں اور گدے سی سکتی ہے، ایک چیز سے دوسری چیز، ایک خیال سے دوسرا خیال۔ دکھ اس بات کا کہ ہم اپنی لوک ثقافت سے کس قدر نا آشنا ہوتے جا رہے ہیں، کتنے بے نیاز ہیں، کتنے بے قدرے ہیں۔ ہم اپنے تہذیبی ورثے کو کیسے لٹ جانے دے رہے ہیں اور پھر تشخص کے نعرے لگانے سے بھی باز نہیں رہتے۔ ہماری جمالیاتی تاریخ ہماری نفسیات سے کیوں خارج ہوتی جا رہی ہے؟ اس خلا کو بھرنے کے لیے کہیں ہم گھاٹے کا سودا تو نہیں کر رہے؟

ایسی ہی ایک اور شام کو ایک جرمن طالب علم نے کراچی میں رہنے والی ایک ہندو کمیونٹی یعنی کالی کے پجاریوں پر ایک فلم دکھائی جو اس نے خود فلمائی تھی۔ ان کے انٹرویو سن کر محسوس ہوتا ہے کہ کالی کے پجاریوں کی یہ جماعت کسی سیاسی تنظیم سے وابستہ ہے۔ ان کی مذہبی رسوم اور ان کے خیالات و نظریات خاصے حیران کن ہیں۔ ہندوستان کی طرف مراجعت ان کا اجتماعی مذہبی خواب ہے جس کی تعبیر پانے کے لیے وہ قربانی کی رسم ادا کرتے ہیں۔ یہ رسم ادا کرنے کا طریقہ خاصا قدیم اور اساطیری معلوم ہوتا ہے۔ ایک دائرے میں ان کا پیشوا رقص کرتا ہے اور اس کے ساتھ پوری کمیونٹی کے افراد رقص میں شامل ہو جاتے ہیں۔ رقص جوں جوں تیز ہوتا جاتا ہے، پیشوا کے چہرے پر ازخود رفتگی کی وحشت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی سی خنجر نما چھری ہے جو اس رقص کے اختتام پر ایک لمحے کو جھکتی اور پھر خون میں ڈوبی ہوئی ہوا میں بلند ہوتی ہے۔ قربانی ہو جاتی ہے اور سب لوگ خوشی کے شادیانے بجاتے ہیں۔ تعجب ہوا کہ پاکستان میں رہتے ہوئے کبھی ان لوگوں کے بارے میں کوئی خبر سامنے نہیں آتی حالاں کہ وہ یہاں خوب اچھی طرح آباد ہیں۔ ان کی یہاں جائیدادیں ہیں، وہ کراچی سے پشاور تک کاروبار کرتے ہیں، اپنے مذہبی تہوار مناتے ہیں اور اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ زندگی گزارتے ہیں۔

سیمیناروں کی نسبت فلموں وغیرہ پر یہاں بھی کافی لوگ آ جاتے ہیں اور بہت دلچسپ سوال جواب ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود سیمی نار بھی باقاعدگی سے ہوتے ہیں۔ میرے وہاں ہوتے ہوئے ایک نہایت دلچسپ سیمی نار ہوا۔ ایک خاتون ہندوستان کے فارسی مخطوطات اور مطبوعات کی مدد سے پانچ سو برس پہلے کے ہندوستانی کھانوں کی ترکیبوں پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے موضوع سے متعلق ایک نہایت دلچسپ لیکچر دیا۔ کون سی سبزی کب اور کہاں سے آئی، کون سا مصالحہ کس دور میں استعمال ہونا شروع ہوا، کون سی ڈش پہلے کس طرح بنائی جاتی تھی، یہ تمام معلومات انھوں نے مختلف قدیم فارسی تصانیف سے اخذ کی تھیں۔

دوسرا سیمینار میرا تھا جو ۱۵۷۸ء سے ۱۷۵۷ تک کے عرصے میں ہندوستان سے یورپ جانے والے سیاحوں کے تجربات و مشاہدات کے تجزیے پر مشتمل تھا۔ کرسٹینا نے تعارف کروایا اور میں نے اپنے مقالے کا لب لباب کچھ تصویری شواہد کی مدد سے پیش کیا۔ لوگوں نے دلچسپی سے سنا اور سوال جواب کا سیشن بھی چلا۔ سیمینار کے اختتام پر پروفیسر ہانس ہارڈر نے، جو وہاں کے جنوب ایشیائی مطالعات کے شعبے کے صدر اور ایک تحقیقی مجلّے StudiesAsianSouth andIndologyofJournal کے مدیر بھی تھے، آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا اور فرمائش کی کہ میں اپنا یہ مقالہ ان کے مجلّے کے لیے ارسال کر دوں۔ میں نے وعدہ تو کر لیا مگر یہ وعدہ کہیں سال بھر کے بعد جا کر ہی ایفا ہو سکا۔

کرسٹینا کے ساتھ شہر کی سیر کا بھی خوب لطف اٹھایا۔ ایک دن کرسٹینا مجھے اولڈ سٹی لے گئیں۔ جاتے ہوئے کافی دیر تک ٹرام کے انتظار میں کھڑے ہونا پڑا۔ کرسٹینا بار بار کہتی رہیں کہ جرمنی اب ویسا نہیں رہا۔ کہنے کو ایک امیر ملک ہے مگر اب یہاں ٹرام اور ٹرینیں تک وقت پر نہیں چلتیں، پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ٹرام ایک منٹ بھی تاخیر سے نہیں پہنچتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں کوئی بھوک سے نہیں مرتا لیکن امیر اور غریب میں فاصلہ بہت بڑھتا جاتا ہے۔ وہ اپنی قومی زندگی سے آزردہ نظر آئیں۔

اس روز ہم شام تک شہر کے قدیم حصے میں گلیوں اور سڑکوں پر گھومتے رہے۔ ٹھنڈ بہت تھی لیکن سیر کا لطف اپنی جگہ تھا۔ ہم نے کوٹ اور مفلر خوب اچھی طرح لپیٹ رکھے تھے۔ سب سے پہلے ہم نے یونی ورسٹی کی قدیم عمارت دیکھی۔ اس میں ایک میوزیم بھی تھا جہاں یونی ورسٹی کی تاریخ محفوظ کی گئی تھی، پرانی تصویریں، تحریریں، مجسمے، نشانیاں اور یادگاریں۔ ایک تنگ و تاریک گلی میں پرانا قید خانہ بھی تھا جہاں شرارتی لڑکوں کو، جب ان کی شرارتیں حد سے بڑھ جاتی تھیں، قید کر دیا جاتا تھا۔ قید خانے کی کوٹھڑیاں تنگ و تاریک تھیں اور بل کھاتی ہوئی، تنگ سیڑھیوں سے گزر کر ان تک پہنچا جا سکتا تھا۔ قیدی لڑکوں نے وقت گزاری کے لیے جیل کی دیواروں پر فن کے شہکار تخلیق کر رکھے تھے۔ جرمن زبان میں لمبی لمبی، خوش خط عبارتیں، جن میں سے بعض کا ترجمہ کرسٹینا نے میری خاطر کیا، زیادہ تر تحریریں حب الوطنی کے جذبات سے لبریز تھیں۔ کچھ تحریروں میں ذاتی

جذبات کی عکاسی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ نہایت عمدہ تصویریں، جن میں سے بیشتر فوجیوں اور لیڈروں کی تھیں۔ ان عبارتوں اور تصویروں سے احساس ہوتا تھا کہ جرمن قوم میں قومیت کا جذبہ کتنا شدید اور قوی رہا ہے۔ اکثر عبارتوں اور تصویروں کے ساتھ تاریخ بھی لکھی ہوئی تھی۔ سب سے پرانی تاریخ جو مجھے نظر آئی، ۱۹۰۳ء کی تھی۔

شام کو کرسٹینا کے شوہر اولی بھی آ گئے اور ہم نے ایک قدیم کیفے میں بیٹھ کر کافی پی اور بہت سی باتیں کیں۔ زبان کے متعلق، جرمنی اور پاکستان کے متعلق۔ اولی کے انڈیا اور پاکستان کے تجربات سے متعلق اور ان کی اکلوتی بیٹی سے متعلق جو انگلینڈ میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ جرمنی چھوڑ کر انگلینڈ کیوں گئی ہے؟ جواب ملا کہ جرمنی میں برطانوی نظامِ تعلیم کو بہتر سمجھا جاتا ہے۔ امریکی یونی ورسٹیاں بھی اچھی ہیں مگر اندازہ ہوا کہ وہ لوگ امریکہ سے زیادہ خوش نہیں ہیں اور برطانیہ کو خود سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھتے ہیں۔ اولی اور کرسٹینا نے اگلے روز اپنے گھر کھانے پر بھی مدعو کیا لیکن اگلے روز موسم اس قدر طوفانی رہا کہ میں جا نہیں پائی۔

البتہ واپس آنے سے ایک دن پہلے میں نے اپنے کمرے میں سب دوستوں کی ایک مختصر سی دعوت کر ڈالی۔ بریانی، کباب، پاستا، دال، بھجیا اور انڈوں کا حلوہ۔ سب نے خوب مزے سے کھانا کھایا۔ اگلے روز میں ام المنان کے ساتھ ٹرین میں فرینکفرٹ کے لیے روانہ ہو گئی۔ ام المنان ایک شادی میں شرکت کے لیے پاکستان جا رہی تھیں۔ انھیں قلق رہا کہ وہ مجھے اپنے گھر نہیں بلا سکیں۔ ان کا گھر ہائیڈل برگ اور فرینکفرٹ کے درمیان ایک چھوٹے سے شہر میں ہے۔ اسی لیے ہم نے واپسی کا پروگرام اکٹھے بنایا اور ٹرین میں خوب باتیں کیں۔ جرمنی کی ٹرینیں زیادہ مضبوط ہیں۔ یہاں کے لوگ بھی لندن کی نسبت زیادہ منظم نظر آئے۔ لندن بین الاقوامی شہر ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ، قسم قسم کے چہرے، شہریتیں، نسلیں۔ جرمنی میں حالات مختلف ہیں۔ اپنی تہذیب پر نازاں، پرسکون اور بااعتماد جرمن قوم، سطح پر جینے کے بجائے زندگی پر زیادہ گہری نظر ڈالنے کی عادی ہے۔

فرینکفرٹ

۲۰۰۸ء میں جب میں پہلی بار فرینکفرٹ آئی تھی تو اس شہر نے مجھ پر بہت گہرا اثر کیا تھا۔ تب میں نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا:

”دوپہر کا ایک بجا ہے۔ فرینکفرٹ بادلوں کی دبیز تہ میں لپٹا ہوا ہے۔ امارات ائر کا جہاز بادلوں کے غلاف کو چیرتا ہوا زمین کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آہستہ سے اس نے زمین کی سطح پر پاؤں رکھا اور جیسے دھند میں تیرنے لگا۔

یورپ کی سرزمین پر پہلا قدم۔

نجانے کتنے قافلے اس راہ سے گزرے ہوں گے لیکن نہ کہیں بجھی ہوئی آگ کا دھواں ہے نہ ٹوٹی ہوئی طناب کا نشاں۔

مٹی ہوئی صدیوں کے ہیولے پھر بھی میرے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔

سرخ ڈھلوان چھتوں والے مکانوں کے جھنڈ کسی بھولے ہوئے خواب کے نقش بناتے محسوس ہوتے ہیں۔

نظر کسی اور منظر کی متلاشی ہے۔ دل کسی اور لے پر دھڑک رہا ہے۔

وقت کے دھندلے شیشے کے آر پار دیکھنے کی خواہش کبھی کبھی کتنی شدید ہو جاتی ہے۔

اس ہلکی بھوری اور سرمئی زمین نے کتنے لعل و گہر اگلے ہیں۔

کیا تاثیر ہے اس مٹی کی، اس ہوا کی اس پانی کی؟

جی چاہتا ہے اسے چکھ کر، چھو کر اور پی کر دیکھوں لیکن ایسے سوالوں کے جواب حواس کب دے سکتے ہیں۔

تو پھر کہاں سے آتے ہیں یہ جواب؟ افلاک سے تو اب سنا ہے صرف عذاب آتے ہیں۔ پھر کسی جغرافیائی خطے کی مردم خیزی کو کوئی کیسے جی کر دیکھے۔ یہ جاننا تو شاید آسان ہے کہ کسی خاص زمین کے پھل زیادہ میٹھے کیوں ہوتے ہیں۔

مگر یہ سمجھنا کس قدر مشکل ہے کہ اتنے بے شمار فن کار، فلسفی، دانش ور اور عظیم الشان تحریکوں کے محرک کسی ایک علاقے سے کیوں جنم لیتے ہیں اور وہ بھی کسی ایک زمانے میں نہیں، مختلف ادوار اور مختلف زمانوں میں۔ گوئٹے، ہٹلر، کانٹ، نطشے، شوپنہار، مارٹن لوتھر، فرائیڈ، کارل مارکس، اینگلز، ہرمن ہیسے، ہائمن، یہ چند نام تو یونہی بیٹھے بٹھائے یاد آ گئے بغیر کسی دقت اور کوشش کے۔ ذرا سوچنے لگو تو چراغوں کی قطاریں سی جھلملانے لگتی ہیں۔ جیسے تاروں بھرا آسمان ہو۔ ایسے ستارے میری زمین سے کب پھوٹیں گے؟ میرا گھر کب جگمگائے گا؟

اور پھر ایک خاموشی، ایک خلا ----

اب کبھی دوبارہ جرمنی آتے ہوئے، بل کہ یورپ کے کسی بھی ملک کی سرزمین پر اترتے ہوئے، دل میں ایسی سنسنی محسوس نہیں ہوگی۔ ایک اور پہلا تجربہ خرچ ہو گیا۔ یہ ایسا خرچ ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہوتی۔ زندگی اپنا نیا پن دھیرے دھیرے کھو دیتی ہے، مانوسیت کتنی بوجھل اور بیزار کن ہوتی ہے۔ عمر کے ایک حصے میں تو یہ خارج سے اٹھ کر انسان کی طبیعت اور مزاج کا حصہ بن جاتی ہے۔ پھر نئے منظر بھی پرانے، متوقع اور بے معنی لگتے ہیں۔ اس عمر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اگر ایک بار پھر کسی سنسنی کو چھو لیا تو غنیمت ہے۔

امیگریشن کا مرحلہ اس قدر جلد اور سہولت سے طے ہو گیا کہ حیرانی ہوئی۔ ایک صاف ستھرا اور

پرسکون سا ہوائی اڈہ۔ نہ کوئی بھاگ دوڑ، نہ دھکم پیل۔ نہ لمبی لمبی قطاریں، نہ انتظار کی طویل گھڑیاں، خوشگوار سا احساس ہوا۔

جولائی کا آخری ہفتہ شروع ہو رہا ہے۔ سنہری دھوپ دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ میں تو میزبانوں کی ہدایت کے مطابق کم از کم بارہ اور زیادہ سے زیادہ پندرہ سولہ ڈگری درجۂ حرارت سے نمٹنے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔ یہاں درجہ حرارت تیس کی حد پار کر رہا تھا۔ جونہی ہم گاڑی میں سوار ہوئے، موسم کے تیور کھل کر سامنے آ گئے۔ پسینے میں بھیگے ہوئے طارق کا کہنا تھا کہ ایسا موسم جرمنی میں کبھی کبھار ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ویسے تو اب دنیا بھر میں موسموں کے رنگ ڈھنگ بدل رہے ہیں۔ کرۂ ارض سورج کے نشتروں کی زد میں ہے اور انسان اپنے ناخن تدبیر سے اپنا ہی سر کھجائے جاتا ہے۔ اردگرد پھیلی ہوئی کائنات جسے وہ تسخیر کے زعم میں پامال کرتا چلا جا رہا تھا اب پلٹ کر انتقام پر اتر آئی ہے۔ اس کا وار سہنے کی کتنی ہمت ہے، ابھی یہ دیکھنا باقی ہے اور بند گاڑی میں حبس سے دم گھٹا جاتا ہے۔ اتنی تیز رفتاری کے دوران گاڑی کے شیشے کھولنا بھی ممکن نہیں اور سورج کے نیزے ہر مسام میں اتر رہے ہیں۔

فرینکفرٹ شہر خیال سے خاصا مختلف نکلا۔ میں تو سمجھے بیٹھی تھی، اتنا پرانا شہر ہے، گنجان اور ہنگامہ پرور ہوگا مگر یہاں تو قصہ ہی دوسرا نکلا۔ شہر کے ماحول میں ایک ٹھہراؤ، ایک دھیما پن، ایک تحمل ہے، گاڑیوں کی رفتار تیز ہے مگر ایک دوسرے کو کچل ڈالنے کے عزائم شہروں کی فضا میں جو عفونت پھیلا دیتے ہیں، وہ کہیں نہیں۔ پتھروں کی بنی سڑکوں پر چلتی ہوئی جدید ترین گاڑیاں قدیم و جدید کا ایک ایسا امتزاج اور ہم آہنگی پیش کر رہی تھیں کہ ان سے ڈر نہیں لگا، مرعوبیت کا احساس نہیں ہوا، اجنبیت کی بے مہری نہیں چبھی، ایک ہلکی ہلکی سی اپنائیت کی نرمی اردگرد منڈلاتی نظر آئی۔ چلو اپنائیت نہ سہی مگر غیریت بھی نہیں تھی۔

ماموں سلیم اور سعیدہ باجی کا گھر شہر کے مرکز میں ہے۔ یہ اس تاریخی شہر کا سب سے زیادہ تاریخی علاقہ ہے۔ دریائے مائن کے کنارے آباد یہ بستی کئی ہزار برس قبل بھی حضرت انسان کا مسکن تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت ان پتھروں پر چلنے والے، ان دریاؤں میں کشتیاں چلانے والے لوگ کون تھے، کیسے تھے، کہاں چلے گئے۔ یورپ کے دریا بالکل پالتو جانوروں کی طرح نرم خو، بے ضرر اور حلیم الطبع معلوم ہوتے ہیں۔ شہروں کے عین بیچ میں آرام سے لیٹے رہتے ہیں، جیسے کوئی زچہ کتیا عین سڑک کے درمیان لیٹ کر اپنے نومولودوں کو دودھ پلائے جا رہی ہو۔ ہمارے ہاں کے دریا کس قدر جنگلی، نامانوس اور وحشت انگیز ہوتے ہیں۔ ان کی اس بیگانہ روی میں کس قدر رومان ہوتا ہے۔ ان کے ٹوٹے ہوئے کناروں سے اترتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ان کے اندر کیسی کیسی دنیائیں آباد ہیں ابھی بھی ایسا لگتا ہے جیسے ان کے اندر بونوں کے شہر آباد ہوں گے، لمبی لمبی دریائی گھاس کسی نیک بونے کی ڈاڑھی معلوم ہوتی ہے۔''

☆ ☆

اس بار چاہنے کے باوجود میں دریا کے کنارے نہ جا سکی۔ برفباری کی شدت نے موقع ہی نہ دیا۔ فرینکفرٹ میں میرا زیادہ وقت کمپیوٹر کے سامنے یا بالکونی کی کرسی پر گزرا، جہاں سے درختوں سے لٹکے برف کے سفید فانوس اندھیری رات کو روشن کرتے نظر آتے تھے۔ ڈاؤن ٹاؤن کے اس پرانے قلعے کو بھی نہ دیکھا جو اب بھی قدیم خوشبوؤں میں لپٹا ہوا محسوس ہوتا ہے، نہ اس چرچ میں جا سکی جہاں میں نے جیزز کرائسٹ کے پاؤں چھوئے تھے تو محسوس ہوا تھا کہ پاؤں مجسمے کے نہیں، سچ مچ جیزز کرائسٹ کے ہیں۔ یہودیوں کی اس یادگار کو بھی نہ دیکھا جہاں انھوں نے نازی مظالم کی داستانیں زندہ کر رکھی ہیں۔ وہ زیر زمین خفیہ پناہ گاہیں جہاں بچے اور عورتیں کئی کئی دن چھپے رہے تھے اور بالآخر موت نے انھیں ڈھونڈ نکالا تھا۔ پچھلی بار جرمنی کے دورے کے دوران ہم نے نازی کیمپوں اور دیوار برلن کی عبرت انگیز باقیات کو دیکھا تھا اور امریکی چیک پوسٹ کے ساتھ اس میوزیم کا بھی دورہ کیا تھا جہاں تصویروں، ویڈیو اور پرانے ساز و سامان کی نمائش کے ذریعے مشرقی یورپ اور خاص طور پر مشرقی جرمنی سے بھاگ کر مغربی جرمنی آنے والے یہودیوں کی کامیاب اور ناکام مسافتوں کی داستانوں کو زندہ رکھنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ خدا جانے ان کہانیوں میں سچ کتنا ہے اور پراپیگنڈا کتنا؟ لیکن اگر دس فی صد بھی سچ ہو تو دل دکھا دینے کو کافی ہے۔ انسانی المیے، خواہ وہ کسی بھی قوم، نسل یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں، دل پر ایک ہی طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہودیوں نے انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ مرتبہ جلا وطنی کا تجربہ سہا ہے۔ اپنی مانوس زمینوں، موسموں اور معاشرتوں سے جدائی انسانی قلب و ذہن کو کیسی شاق گزرتی ہے اور کئی نسلوں تک ہجرت کا روگ خون میں کلبلاتا رہتا ہے۔ یہودیوں کے خون میں یہ روگ دو مختلف رنگ اختیار کر گیا ہے۔ ایک طرف تو گہرا رنج و ملال ان کے لکھنے والوں کے قلم کی نوک میں اتر آیا ہے اور دوسری طرف سرد بے رحمی اور اندھا انتقام ان کی سیاسی پالیسیوں کا محرک و رہنما بن گیا ہے۔ مجھے اس قوم کی تاریخ میں بہت دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ قرآن میں بار بار بنی اسرائیل کا ذکر ہے، ان انعامات کی یاددہانی ہے جو اس قوم پر خدائے ذوالجلال کی طرف سے کیے گئے تھے، ان مواقع کا ذکر ہے جو بار بار اس قوم کو دیے جاتے رہے۔ آخر کوئی بات تو ایسی ہوگی اس قوم میں، کہ خدا نے انھیں اس قدر توجہ دی۔ پھر انھیں کیوں دربدر کر دیا؟ اس قوم نے جلا وطنی کا جو دکھ سہا ہے اور بار بار سہا ہے، اس کی کیا کوئی گہری وجہ بھی ہے؟

عقیدے سے ہٹ کر دنیاوی اعتبار سے دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی میں کیسے کیسے سخت مقام آتے ہیں لیکن اگر عزیمت ہو تو وہ پھر سے جی اٹھتی ہیں اور مختصر سی مدت میں خود کو دنیا بھر سے منوا لیتی ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کو ابھی ایک سو سال بھی پورے نہیں ہوئے لیکن یہودیوں نے نہ صرف اپنے لیے ایک وطن حاصل کر لیا بل کہ اپنی عسکری قوت، اقتصادی پالیسیوں اور سیاسی چالوں کے ذریعے عملاً دنیا بھر کی سیاست و معیشت پر قابو پا لیا ہے۔ ایسے میں اپنے دیس پاکستان کے موجودہ اندھیروں کے عقب میں بھی روشنی کی امید سی لہراتی نظر آتی ہے۔

"ہم بھی سنبھل جائیں گے۔ ہم بھی ابھر آئیں گے۔"

جرمن قوم کی صلاحیت اور خود اعتمادی میں بھی ہمارے لیے سیکھنے کا بہت سامان ہے۔ مجھے جرمنوں کی ایک اور ادا بھی بہت پسند آئی وہ اپنی تہذیب وثقافت کو محفوظ رکھنے کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں شہروں کی قدیم عمارتوں کی ظاہری صورت کو تبدیل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے پچھلی بار جب ہم مشرقی جرمنی کے خوب صورت شہر ایفرٹ میں ٹھہرے تھے تو دیکھا تھا کہ ڈاؤن ناؤن کی تمام عمارتیں صدیوں پرانی قدیم صورت پر قائم ہیں۔ میں ایفرٹ یونی ورسٹی کے جس مہمان خانے میں ٹھہری تھی وہ بھی آٹھ سو سال پرانی عمارت میں تھا۔ یہ اس قدیم یونی ورسٹی کی عمارت تھی جسے ان دنوں پورے جرمنی کی عظیم ترین درسگاہ ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ سولھویں صدی کے آغاز میں پروٹسٹنٹ ازم کا بانی مارٹن لوتھر بھی یہاں کسب علم کے لیے آیا تھا۔ یہیں ایک طوفانی رات میں اس نے راہب بننے کا تہیہ کیا اور کئی سال تک ایک خانقاہ میں ریاضت اور نفس کشی میں مصروف رہا۔ وہ خانقاہ ابھی تک مارٹن لوتھر کے نام سے منسوب ہے۔ ایفرٹ مارٹن لوتھر کی زندگی میں بہت اہمیت کا حامل شہر تھا۔ اس قدیم یونی ورسٹی کی عمارت کو اب جدید یونی ورسٹی آف ایفرٹ کے مہمان خانے کے طور پر تبدیل کر دیا گیا ہے لیکن عمارت کی بیرونی وضع قدیم ہے۔ لکڑی کا موٹا اور بھاری بیرونی دروازہ ایک بلند آہنگ چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا تھا۔ لکڑی کے چوڑے چوڑے نیم تاریک زینے تھے جن پر چڑھتے ہوئے روشنیاں خود بخود جل اٹھتی تھیں اور ایک عجیب پر اسرار فضا بناتی تھیں۔ عمارت کے نیچے سرنگ نما تہہ خانے تھے جو کبھی غلے اور اناج کے گودام ہوا کرتے تھے۔ ان کی دیواروں میں کسی غار کی دیواروں کی طرح کے ناہموار پتھر جگہ جگہ ابھرے ہوئے تھے۔ اگرچہ ان تہہ خانوں میں جدید واشنگ مشینیں نصب تھیں اور وہ لانڈری کا کام دے رہے تھے مگر ان کی قدامت کا رنگ ڈھنگ اب بھی اسی طرح قائم تھا۔ اس پر مستزاد خاموشی تھی۔ عمیق اور راز بھری خاموشی۔ اس خاموشی میں ماضی کی گونج تھی جس کی ہیبت مجھے اکثر محسوس ہوتی تھی۔ شام کے بعد زینے سے اترتے اور چڑھتے ہوئے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی آہٹ آپ کا پیچھا کر رہی ہے۔ کئی بار میں نے بے اختیار سانس روک کر پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ لیکن اس ہیبت کے باوجود اس قدیم فضا میں ایک طلسمی کشش تھی جو مجھے مسلسل تین ہفتے تک محسوس ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ دروازہ کھول کر باہر گلی میں نکلتی تو قدم ان گول گول سلیٹی پتھروں پر ڈگمگا جاتے جو سنا ہے صدیوں پرانے تھے۔ لگتا تھا تاریخ ان گلی کوچوں میں ننگے پاؤں گھوم رہی ہے۔ مہمان خانے کے دروازے کے ساتھ ہی گلی ایک موڑ مڑتی تھی۔ موڑ پر ایک قدیم گرجا کا اونچا دروازہ تھا۔ گلی سے کچھ آگے نکل جائیں تو ایک قدیم چوک تھا جس میں شام کو لوگ بید کی کرسیوں پر بیٹھ کر گپ شپ کرتے اور پیتے پلاتے تھے۔ پچھلی طرف مارٹن لوتھر سے منسوب خانقاہ تھی جہاں میں ایک سروس میں بھی شامل ہوئی تھی۔

ایفرٹ سے نکل کر ایک دن میں کرسٹینا اور رام المنان گوئٹے کے شہر ویمر بھی گئے تھے جہاں گوئٹے کا گھر میوزیم کی صورت میں سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ اس گھر میں اس کی تصویریں ہیں، مجسمے ہیں، سکے

ہیں، اس کی محبوبہ کی یادگاریں ہیں، قیمتی اور نایاب پتھروں اور جڑی بوٹیوں کا خزانہ ہے جو اس نے دور دور سے حاصل کیے تھے۔ وہ ان پتھروں اور جڑی بوٹیوں کا اعلیٰ پارکھ تھا۔ وہ کمرہ ہے جہاں اس نے آخری سانس لیے تھے اور کہا تھا: روشنی!!! اور روشنی!!!

واپسی پر ہم نے بس کی کھڑکی سے کئی چھوٹے چھوٹے قصبے دیکھے۔ ان قصبوں میں اب صرف بوڑھے رہتے ہیں۔ جوان لوگ پڑھنے یا نوکری کرنے شہر جا چکے ہیں۔ کئی بڑی بڑی حویلیاں خالی پڑی تھیں اور ان پر برائے فروخت کے بورڈ لگے تھے۔ کئی ایک پر تو قیمت بھی لکھی تھی، ایک یورو، صفر یورو۔ میں نے حیرت سے پوچھا یہ قیمت واقعی اتنی کم ہے یا مجھے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ کرسٹینا نے بتایا کہ ان قدیم مکانوں کی ظاہری اور تاریخی وضع قطع بدلنے کی اجازت نہیں ہے اس لیے ان کی دیکھ ریکھ پر بہت خرچ آتا ہے۔ مالک مکان اس خرچ سے بچنے کے لیے انھیں مفت دینے کو تیار ہیں مگر انھیں خریدنے والا کوئی نہیں۔ مجھے یاد آیا کہ ایلفرٹ میں بھی ایسے کئی مکان ہیں جو اندر سے بالکل جدید طرز زندگی کے مطابق ہیں مگر بیرونی ڈھانچا قدیم ہے۔ یہ لوگ اپنے قدیم فن تعمیر کے شاہ کاروں کو زیادہ سے زیادہ دیر تک قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے تہذیبی ورثے سے یہ محبت ان کے قومی تشخص کو قائم رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ یوں فلسفیانہ طور پر دیکھا جائے تو یہ محض ایک خود فریبی ہے۔ انسان اس کرہ ارض میں کتنے قرنوں سے آباد ہے۔ سنا ہے اہرامِ مصر پچیس ہزار سال قبل مسیح میں تعمیر ہوئے تھے۔ کتنی ہی تہذیبیں اس سطح زمین پر پھلی پھولیں اور فنا کے گھاٹ اتر گئیں۔ ہر نام بالآخر فراموشی کے دریا میں بہہ جاتا ہے لیکن پھر بھی انسان اپنے ماضی سے رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہے اور اپنی شناخت کے لیے پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتا ہے۔

جرمنوں کے لیے اس شناخت کا ایک پہلو ہٹلر بھی ہے۔ مجھے یاد ہے ایلفرٹ یونی ورسٹی کی ایک نوجوان طالبہ کیٹرین ایک روز میرے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور کہنے لگی کہ ہم جرمن بہت شرمندہ ہیں۔ ہم شرمندہ ہیں کہ ہم ہٹلر کے ہم قوم ہیں۔ میں حیرت سے اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

مگر اس میں تمھارا کیا قصور ہے؟ میں نے پوچھا تھا۔

”میرا بھی قصور ہے۔ ہم سب کا قصور ہے۔۔۔۔“ وہ جذباتی ہو رہی تھی۔

میں سوچتی رہ گئی کہ یہ پروپیگنڈے کی طاقت ہے یا کچھ اور۔ کسی قوم کو اس کے ماضی پر اس قدر شرمسار کر دینا۔ کیا حال اور مستقبل کے سب لوگوں کو ماضی کا خراج دینا پڑتا ہے؟ ماضی جو ہمارا دوسرا پاؤں ہے جسے اٹھا کر ہم کھڑے نہیں رہ سکتے۔ ماضی جو ہماری تقدیر ہے۔ ماضی جو ہمارا جبر ہے۔ ماضی سے کوئی کیسے آزاد ہو سکتا ہے؟

☆☆☆☆

محمد عارف

ناران میں۔۔۔

صبح آنکھ کھلی تو اُجالا دروازے پر دستک دے رہا تھا، دھیرے دھیرے کمبل چھوڑا بل کہ چھوڑے شکر ہے کہ کمبلوں نے بھی چھوڑ دیا۔ سردی کسی حد تک کم ہو چکی تھی۔ اوورکوٹ اور سویٹر اتار کے باہر نکلے تو سورج کی کرنیں چیڑ کے بلند وبالا درختوں پر ننگی دیکھیں۔ باہر آ کر احساس ہوا کہ کم از کم سویٹر ضرور ہونی چاہیے، اندر آ کر سویٹر پہنی، مسواک اُٹھائی اور دریا کی راہ لی جو بہ مشکل بیس قدموں کے فاصلے پر تھا یہاں چٹانوں پر بیٹھ کر مسواک کی اور غسلِ آفتاب کیا۔ کافی دیر بعد واپسی ہوئی، اپنی مدد آپ کے تحت کچھ تصویریں یعنی سیلفیاں لیں، پھر سیکنڈ ان کمان میرِ کارواں فیصل کامران کی مدد سے چند اور مناظر کیمرے میں محفوظ کیے۔ کمرے میں واپس پہنچے تو اقبال صاحب بستر چھوڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ باتھ روم گئے، ٹوٹی کے نیچے ہاتھ رکھا تو چیخ نکل گئی۔ باہر آ کر اقبال صاحب سے مشورہ کیا ”سر! نہانا چاہیے کہ نہیں، کیا کہتے ہیں؟“ بولے ”اگر کوئی شرعی مجبوری نہیں تو ہاتھ منہ دھو لینا بھی کافی بل کہ زیادہ ہے۔ یاد آیا اپنے ایک اور یارِ غار کا قول کہ اس قسم کے غیر معمولی حالات میں بغیر کسی شرعی عذر کے نہانا پانی کا ضیاع اور اپنے ساتھ ظلم ہے۔ باتھ روم کا ایک دروازہ کمرے میں اور ایک کاٹیج کے پچھواڑے میں کھلتا تھا۔ اس دروازے سے باہر گئے اور گیزر کی حالت دیکھی، گیزر تلے آگ یوں جل رہی تھی کہ آتش کدے میں بھی کیا جلتی ہوگی، کچھ اطمینان ہوا اور اندر جا کر دوبارہ ٹوٹی کھولی اور انتظار کیا یہ انتظار طویل ثابت نہ ہوا، چند ہی لمحوں میں پانی کی گرما گرم دھار برآمد ہوئی، ہاتھ منہ دھو کر باہر نکلے تو اقبال صاحب کو مسکراتے دیکھا۔ کہا ”پریشانی کی کوئی بات نہیں پانی گرم ہے۔“ نہ بھی ہو تو سردی میں پانی کا پہلا لوٹا ہی تکلیف دیتا ہے، اور اس کا حل یہ ہے کہ بندے کے پاس دو لوٹے ہوں، لیکن سرِ دست ہمارے پاس صرف ایک لوٹا ہے اور بازار اور پارلیمنٹ دور ہے۔

لائیٹ کا کوئی معقول انتظام نہ تھا، شام چھ بجے سے صبح چھ بجے تک جنریٹر چلتا تھا۔ بیگ سے کپڑے نکالے تو بُری حالت میں تھے لیکن پریشانی نہ ہوئی کہ جینز اور سویٹر موجود تھی، سلوٹ سلوٹ شرٹ پر سویٹر پہن کے آئینے کے مقابل آئے تو اپنے آپ کو معقول سے کافی اچھا پایا۔ اتنے میں عبدالباسط حسینی نظر آئے جو ہمارے اس ٹور کے آفیشل فوٹوگرافر ہیں انھیں آواز دی اور کمرے کے اندر ہی ایک تصویر بنوالی تاکہ سند رہے۔ ناشتے کی کال آ چکی تھی سبھی بن ٹھن کے ڈائننگ ہال کی طرف نکلے کہ ناشتے کے فوراً بعد واک اور ٹورازم کی پروموشن کے حوالے سے پروگرام تھا اور ہم سبھی اسی مقصد کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے تھے۔ کھانے

کے وقت ’’کنہار ویو ہوٹل‘‘ کے احباب بھی ’’پی ٹی ڈی سی‘‘ آ جاتے تھے، آج ناشتے میں توری پراٹھے تھے جسے ہمارے کُک نے توے پر مزید خستہ کر دیا تھا۔ ساتھ میں آملیٹ اور گرما گرم چائے۔ خوب پراٹھے اُڑائے گئے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر باہر آئے تو دھوپ اس قدر جوبن پر تھی کہ آنکھوں پر بار محسوس ہوتی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ مطلع مکمل طور پر صاف تھا اور ایسے صاف آسمان کا تو اپنی طرف تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

باہر نکلے تو ہمارے گروپ کے لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر فوٹو گرافی میں مصروف ہو گئے۔ استقبالیہ کے عین سامنے ہر دو مینیجر حضرات طیب میر (اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے، اب ہم میں نہیں رہے) اور اصغر علی تنولی گپ شپ میں مگن ہیں۔ ان سے کچھ دور لان میں لگے ایک بینچ پر اقبال صاحب دھوپ کا چشمہ لگائے دھوپ میں بیٹھے چمک رہے ہیں اور اپنی عمر سے بہت کم نظر آ رہے ہیں، پتا نہیں موسم ٹھیک ہے یا کہ میری نظر خراب ہے۔ قریب ہی ’’انکل سٹک‘‘ کھڑے اپنی سٹک کو بغور دیکھ رہے ہیں یہ سٹک انھوں نے بالخصوص سیف الملوک کی ٹریکنگ کے لیے خریدی ہے اور آج صبح سے ہر ایک سے پوچھتے پھر رہے تھے کہ جھیل کب جائیں گے۔۔۔ میں ہر دو مینیجر حضرات کے پاس چلا آیا اور ’’پی ٹی ڈی سی ناران‘‘ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کیں۔ کافی دیر ادھر گزارنے کے بعد نکلے اور پُل پر آ گئے یہ وہی پل ہے جس کے نیچے سے جھیل سیف الملوک سے آنے والا پانی گزر کر دریائے کنہار سے ملتا ہے۔ پُل سے تھوڑا اوپر ایک غار ہے جہاں دیو نے شہزادی کو قید کیا اور شہزادہ سیف الملوک نے آ کر شہزادی کو دیو کی قید سے آزاد کرایا، داستان گو یہی کہتے ہیں۔ لیکن اب تو اس غار میں اس قدر بدبو ہے کہ دیو بھی یہاں ایک رات نہ بسر کر سکے۔ پُل پر ایک بار اکٹھے ہوئے لیکن پھر تتر بتر ہو گئے کہ ابھی دور دور تک کسی ’’واک شاک‘‘ کا نام و نشان تک موجود نہ تھا۔

میرے سامنے کھلتی ہوئی وادی اور بازار ہے، جو سیزن میں مری کے مال روڈ کا مقابلہ کرتا ہے، بائیں ہاتھ پہاڑ کے دامن سے بہتا نالا جس میں سیف الملوک اور گلیشیئرز کی پگھلنے والی برف کا پانی آ رہا ہے پھر چیڑ کے درختوں کے جھنڈ ہیں، پیچھے تا حدِ نظر پہاڑ اور وادیوں کا ایک وسیع سلسلہ ’’بابوسر ٹاپ‘‘ تک چلا جاتا ہے، وادیوں میں درخت اور سبزے کی بہتات ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمکتی برف ہے۔۔۔ دائیں ہاتھ میرا یار ’’کنہار‘‘ ہے جس کو بلند و بالا بلڈنگیں دن بدن چھپائے جا رہی ہیں۔ سر پر چمکتا سورج اور چار سو ٹھنڈی ٹھار ہوا کا دور دورہ ہے۔ ایسے موسم میں پتا نہیں کیوں مجھے مجید امجد یاد آتا ہے اور جب مجید امجد یاد آئے تو کسی با ذوق رفیق اور ہم دم کی صحبت بھی درکار ہوتی ہے۔ جیسے کوئی مے خوار اکیلے مے نوشی نہیں کرتا کہ اصل سرور اسی وقت ملتا ہے جب کوئی دم ساز شریکِ مے ہو۔

برس گیا بہ خراباتِ آرزو ترا غم
قدح قدح تیری یادیں، سبو سبو ترا غم

ابھی یہی شعر گنگنایا تھا کہ عبدالباسط حسینی میرے پہلو میں آ گیا اور بولا کہ:

برس گیا بہ خراباتِ آرزو ترا غم
قدح قدح تیری یادیں ، سبو سبو ترا غم
ترے خیال کے پہلو سے اُٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سو ترا غم
غبارِ راہ میں رس ڈھونڈتی کرن تیری دھن
گرفتِ سنگ میں۔۔۔۔

پلیز"ترے خیال کے پہلو سے اُٹھ کے جب دیکھا" مجھے اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

ترے خیال کے پہلو سے اُٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سو ترا غم

دوبارہ پڑھیےگا۔

ترے خیال کے پہلو سے اُٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سو ترا غم

آپ نے اچھا نہیں کیا۔۔۔یار مجھے معلوم نہیں تھا اگر پتا ہوتا تو اپنی آواز کا گلا دبا دیتا۔

میں نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا"پیاس لگی ہے۔"

"چلیں کچھ پیتے ہیں۔"

جوس کے دو ڈبے لیے جو کچھ گرم محسوس ہوئے تو انھیں ٹھنڈا کرنے کے لیے پُل کے نیچے چلے آئے اور ایک چٹان کی اوٹ میں بہتے پانیوں میں انھیں رکھ کر فطرت کے نظاروں میں کھو گئے۔ کافی دیر بعد پُل پر کچھ"ہل جُل"شروع ہوئی تو ہم نے جوس کے ڈبے پانی سے نکالے جو یخ ہو چکے تھے، انھیں نوشِ جاں کرتے پُل پر آ پہنچے۔ اب صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ امام تو موجود ہیں لیکن مقتدی غائب ہیں۔ اس کا حل میگا فون کے نکلتے ہی نکل آیا۔ نثار بھائی نے میگا فون پر باآوازِ بلند پولیس والوں کی طرح اپنے گروپ ممبران کو بلانا شروع کیا کہ ہتھیار ڈال دو میرا مطلب ہے واپس آ جاؤ تمھیں کچھ نہیں کہا جائے گا اور چند منٹوں میں تمام لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ پُل پر جمع ہو گئے۔ اس ہلے گلے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ دیگر ٹورسٹ بھی متوجہ ہوئے اور اس"رولے گولے" کی غرض و غایت پوچھنے لگے۔ کچھ بینرز دیکھ پڑھ کے، کچھ ہماری رہنمائی پر اور کچھ میڈیا کے کیمرے دیکھ کر ہماری صفوں میں شامل ہو گئے۔ صفیں سیدھی کیں گئیں اور لیجیے واک کا آغاز ہو گیا۔ یہ اس واک سے ملتی جلتی واک تھی جو ہم زمانۂ طالب علمی میں علم کی افادیت کے لیے نکالتے تھے جس کا سلوگن ہوتا تھا"علم بڑی دولت ہے۔"واک میں نثار بھائی سیاحت، اس کے فروغ اور ان علاقوں میں صفائی کے حوالے

سے تقریر فرما تھے، میگا فون کے باعث وادی میں آواز کی گونج دور تک جا رہی تھی۔ سب سے آگے میڈیا والے تھے جو الٹے قدموں چلتے تھے کہ ان کی قسمت میں یہی لکھا ہے، باقی لوگ سیدھے قدموں جانبِ منزل رواں دواں تھے۔ راستے سے مقامی لوگ اور تاجر برادری بھی ہمراہ ہو گئی کہ واک سے پیشتر نثار بھائی دُکان دُکان تبلیغ کر چکے تھے، مزید دو دن قبل چند بینرز بھی مختلف جگہوں پر لٹکا دیے گئے تھے۔ یہ واک ”وزٹ پاکستان، واہ کینٹ“ اور ”پی ٹی ڈی سی“ کے زیرِ اہتمام ہو رہی تھی، جس کی مکمل سکیورٹی ایک اکلوتے پولیس والے کے سر تھی۔ جو بے چارہ بولایا بولایا ساتھ چلتا تھا وہ بھی بغیر اسلحہ کے، پنجاب پولیس میں ہوتا تو اسے پتا چلتا کہ اس کی کیا اوقات ہے اور ہماری کیا اوقات ہے۔ اتنا شریف کہ واک کے دوران چند لاہوری من چلوں نے ہلڑ بازی کی کوشش کی تو اس نے انھیں روکنا تو درکنار منع کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ واک میں شامل عمائدین ہی نے انھیں لعن طعن کر کے واک سے واک آؤٹ پر مجبور کیا۔

دس پندرہ منٹ کی واک کے بعد منزلِ مقصود آ پہنچی، یہ ”کنہار ریو ہوٹل“ کا ہال ہے، ہال میں داخلے سے قبل باہر سیڑھیوں پر حفظِ مراتب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے گروپ فوٹو لیا گیا۔ حفظِ مراتب اس لیے بھی ضروری ہے کہ میڈیا والے چند احباب سے اس واک اور پروگرام سے متعلق ویوز لینا چاہتے ہیں۔ میں اس واک کی دوسری صف میں کالا چشمہ لگائے کھڑا ہوں، یہ چشمہ صبح ناران بازار سے سو روپے میں خریدا گیا میں تو اسی روپے پر مصر تھا لیکن خان بھائی کی استقامت کے آگے میری سودے بازی ہار گئی، لائیٹ براؤن سویٹر میں ملبوس جس میں سرخ اور کالی افقی دھاریاں ہیں، میں یوں کھڑا نظر آ رہا تھا جیسے منسٹر حضرات کے ساتھ کمانڈو کھڑے ہوتے ہیں۔ مختصری میڈیا بریفنگ کے بعد تمام شرکا ہال میں چلے آئے اور یوں چھوٹے سے ہال میں دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک چھوٹا اور سادہ سا اسٹیج تیار تھا، نثار بھائی نے صاحبانِ اسٹیج کو بلا کر کمپئرنگ معروف ٹریکر اور گائیڈ محمد اسلم کے حوالے کر دی، جنھوں نے وادیٔ ناران کے کئی چھپے گوشے اور جھیلیں دریافت کیں ہیں۔ اب اسٹیج پر صاحبِ صدارت سیٹھ مطیع اللہ، طیب میر، محمد اقبال، راجہ نثار اور ایک مولوی صاحب تھے۔ تلاوت کلام پاک اور نعت کے بعد باقاعدہ پروگرام کا آغاز ہوا۔ تمام حضرات نے سیاحت، اس کے فروغ، ضرورت اور ان علاقوں میں فطرت کو پہنچنے والے نقصان کو موضوعِ بحث بنایا، اس دوران اسٹیج پر براجمان مولوی صاحب وقفے وقفے سے مسکراتے رہے۔ ان کی مسکراہٹ مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔۔۔ کیسا مولوی ہے جو لوگوں کو ڈرانے دھمکانے والے اپنے اصل کام سے غافل ہے۔۔۔ ایسا غافل مولوی میں نے آج تک نہیں دیکھا، دیکھا کیا سنا بھی نہیں۔ مجھے اسٹیج پر بلایا گیا تو مولانا میری طرف دیکھ کر ایک بار پھر مسکرا اٹھے جی میں آیا کہ ضمیر جعفری صاحب کے ان اشعار سے آغاز کروں:

”مولوی اونٹ پہ جائے ہمیں منظور مگر
مولوی کار چلائے ہمیں منظور نہیں

وہ نمازیں تو پڑھائے ہمیں منظور مگر
پارلیمنٹ میں آئے ہمیں منظور نہیں
حلوہ خیرات کا کھائے تو ہمارا جی خوش
حلوہ خود گھر میں پکائے ہمیں منظور نہیں"

لیکن درگزر کرتے ہوئے پولوشن، صفائی ستھرائی اور خانگی معاملات سے متعلق چند قطعات سنائے، کہ مقام بھی یہی تھا۔ اس پر مولوی صاحب ہنسے بل کہ ایک دو پر تو کھل کھلا دیے، میرا خون کھول اُٹھا، جھٹ ایک غزل شروع کی اور آغاز میں حضرت سے ایسے معذرت کی جیسے ہمارے شاعر دوست گنجے پن پہ شعر پڑھنے سے قبل گنجے حضرات سے معذرت طلب کرتے ہیں:

اور ہیں جو کما کے کھاتے ہیں
مولوی تو دبا کے کھاتے ہیں
چار کھاتے ہیں ہاتھ منہ دھو کر
چھے پراٹھے نہا کے کھاتے ہیں

ان اشعار پر محفل جوبن پر آ گئی لیکن حیرت اس بات پر تھی کہ سب سے زیادہ محظوظ مولوی موصوف ہو رہے تھے اور داد بھی بڑھ چڑھ کے دے رہے تھے۔ میں اسٹیج سے نیچے اترا تو ذہنی طور پر تیار ہو گیا کہ اب آخر میں چوں کہ مولوی صاحب کی باری ہے اور مولوی حضرات باری لینا خوب جانتے ہیں۔ اتنے میں اذانِ ظہر ہوئی اور جناب نماز کے لیے چلے گئے میری جان میں جان آئی۔ اسکے بعد تقریب تقسیم اسناد منعقد ہوئی۔ واک میں شامل شرکاء کو اسناد پیش کی گئیں اور سیاحت کے فروغ کے حوالے سے اس تقریب میں شامل پورٹر، ٹریکر، گائیڈز وغیرہ میں شیلڈز تقسیم کی گئیں۔ اسی دوران مولوی صاحب بھی لوٹ آئے۔ ان کو مخصوص القاب و آداب سے دعوتِ خطاب دی گئی تو مجھ سمیت کئی لوگ ڈرنے کے لیے تیار ہو گئے۔۔۔ لیکن یہ کیا دیکھے، انتہائی میٹھے اور ملائم لہجے میں انھوں ''سیروفی الارض'' کی آیت تلاوت کی اور پھر کمال خوب صورتی سے اس آیت کی توضیح و تشریح میں سیاحت کا اسلامی نکتۂ نظر اس طرح بیان کیا کہ ہمیں لگا کہ ہم سیر و تفریح کے لیے نہیں بل کہ عبادت کے لیے آئے ہیں۔ شرکائے محفل ہمہ تن گوش تھے، مولانا عربی، اردو اور بوقتِ ضرورت اور موقع محل کے مطابق انگریزی پر بھی اُتر آتے۔ بات کرتے ہوئے کسی طور بھی مولوی نہیں لگتے تھے۔ کچھ دیر صفائی کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کا ذکر کیا اور پھر مزاح پر آ گئے۔ پہلے داد اور تحسین پیش کی پھر موجودہ دور میں مزاح کی اہمیت بیان کی اور پھر قرآن و حدیث سے حوالے دیے اور ازاں بعد مزاح کے فن پر بات کرتے ہوئے مزاح کی افادیت بتانے لگے کہ کس طرح ایک مزاح نگار سہولت سے ان معاملات پر خامہ فرسائی کر لیتا ہے جن پر بات کرنا دشوار ہوتا ہے۔ وقت کا پتا ہی نہ چلا، حالاں کہ بات بہت دیر تک چلی تھی۔ پروگرام کا

اختتام ہوا تو میں مولانا صاحب کی طرف بانہیں وا کیے لپکا۔

عثمان یاسر۔۔۔رنگ سفیدی کی جانب مائل، سیاہ ڈاڑھی، مونچھیں پتا نہیں کس رنگ کی کہ سرے سے غائب ہیں، مسکراتا چہرہ، چھلکتی اور مسکراتی آنکھیں، پورے چہرے پر شگفتگی اور مستقل مُسکان، سر پر ٹوپی، سیاہ اوورکوٹ اور سفید کُرتا شلوار میں ملبوس ایک مولانا جو مفتی بھی ہیں اور خطیب ناران بھی لیکن مولوی نہیں۔ ان سے بغل گیر ہوتے ہوئے میں نے صرف اتنا کہا "تسی گریٹ او" آپ اس شعبے میں آئے جہاں قحط الرجال ہے کہ گذشتہ کئی صدیوں سے ہم اس شعبے میں اپنے بے کار، ذہنی اور جسمانی اپاہج بھیجتے ہیں۔ انھیں کئی بڑے شہروں سے آفرز آئیں لیکن یہ ادھر سے جانے کو تیار نہیں کہ میری ضرورت اس زمین کو زیادہ ہے۔ میں انھیں مولوی نہیں کہہ پایا۔ مولانا، سر اور جناب سے مخاطب کر رہا تھا۔ آج بہت عرصے بعد کسی مذہبی رہنما سے مل کر خوشی ہوئی۔ چائے اور پکوڑے ٹھنڈے اور بسکٹ مزید ٹھنڈے لگ رہے تھے لیکن سب کچھ مزہ دے رہا تھا بقول شاعر:

"جیسا موڈ ہو ویسا منظر ہوتا ہے
موسم تو انسان کے اندر ہوتا ہے"

چائے پر ان کے ساتھ مسلم دنیا کے زوال اور اس کے اسباب پر بات ہوئی میں نے پہلے مولوی اور مذہبی ٹھیکے داروں کے خوب خوب لتے لیے۔۔۔مسکراتے رہے۔۔۔پھر میں نے اس شعبے کی زبوں حالی پر معاشرے کو بھی قصوروار ٹھہرایا، جہاں بیس پچیس لاکھ کی مسجد تو دنوں میں تعمیر ہو جاتی ہے لیکن مولوی کو دینے کے لیے کسی کے پاس کچھ نہیں ہوتا اور یہ وہ شخص ہے جو چوبیس گھنٹے کا ملازم ہے۔ بہت سی باتیں سنی سنائی گئیں۔ ہمیں پروگرام کے مطابق "موو" کرنا تھا تمام لوگ گاڑی میں بیٹھ چکے تھے اور میرے منتظر تھے۔ مولانا صاحب سے رابطہ نمبر مانگا تو انھوں نے ای میل اور فیس بک ایڈریس بھی دے دیا سخت مایوسی ہوئی کہ کیسا "مولوی" ہے خرافات میں پڑا ہوا اور اسے سمجھانے کو کوئی مولوی تیار نہیں۔

اڑھائی بجے کا وقت ہوگا "کنہارویو" سے نکلے تو "انکل سٹک" سیخ پا تھے کہ ہمیں جھیل کا کہا گیا تھا لیکن اس کی کوئی بات ہی نہیں کرتا ہمیں بتایا جائے کہ جھیل پر جانا بھی ہے یا نہیں۔ ایک آواز آئی "ورنہ میں سٹک تو سنبھال دوں" جس پر ایک قہقہہ پڑا اور انکل خون کے گھونٹ پی کے رہ گئے۔ بتایا گیا کہ ابھی جھیل جانا مناسب نہیں کہ آدھے سے زیادہ راستہ ابھی بند اور برف سے اٹا پڑا ہے لہٰذا مناسب یہی ہے کہ جھیل کا پروگرام کل پر رکھا جائے اور آج ابھی "بٹہ کنڈی" اور "بڑوائی" کی طرف نکلتے ہیں۔ دوپہر کے کھانے کو اتفاقِ رائے سے رات کے کھانے پر اکٹھا کر لیا گیا کہ ابھی احباب پکوڑوں کی ڈشوں سے دو دو ہاتھ کر آئے تھے۔

پی ٹی ڈی سی، ناران سے تھوڑا آگے ہیلی پیڈ آتا ہے، یہاں سے دو تین کلومیٹر آگے نکلے تو گلیشیر سے سڑک مکمل اور تا حدِ نگاہ بلاک نظر آئی۔ نیچے اُترتے تو پتا چلا کہ ابھی چار دن پہلے تو ناران تک سڑک کھلی ہے

اس سڑک کو کھلنے میں ہفتہ دس دن مزید لگ جائیں گے۔ خیر یہاں پہ ہم نے بھی اور لوگوں کی طرح پڑاؤ کر لیا۔ گاڑی ایک طرف پارک کی، اُترنے سے پہلے نثار بھائی نے تمام ٹورسٹ حضرات کو واپسی کی ٹائمنگ اور چند دیگر ہدایات دیں۔ انکل سٹک ان ہدایات کو سنتے نثار بھائی کو گھورتے نیچے اُتر گئے۔

لوگ ٹکڑیوں میں بکھر گئے، میں، عبدالباسط اور علی حمزہ ایک ساتھ مٹر گشت کرنے لگے۔ یہاں فیصل آباد سے آئے دو نوجوانوں کا انٹرویو کیا گیا جو موٹر بائیک پہ براستہ اسلام آباد، مری، نتھیا گلی اور ایبٹ آباد سے ہوتے ہوئے دو دنوں میں، کل شام ناران پہنچے تھے اور آج بھی موٹر بائیک پہ مزے کر رہے تھے۔ ان سے ”ہاؤ ناؤ“ کے بعد ہم برف پہ سے سکیٹنگ کرتے خواتین و حضرات کو دیکھنے لگ گئے، پھر ایک بلڈوزر سے علیک سلیک کی جو کئی سو گز آگے پھنسے ہوئے اپنے بلڈوزر بھائی کی مدد کو جا رہا تھا۔ دوربین لگا کر دیکھا تو انکل سٹک، سٹک ٹیکتے لالہ زار کی جانب رواں دواں نظر آئے۔ میں حمزہ اور باسط پہاڑ کے دامن تک پہنچ کر لنگر انداز ہو گئے۔۔۔ حمزہ ہم سے کافی چھوٹا اور بارہویں کا طالب علم ہے لیکن اس گروپ میں باقی لوگوں کی نسبت ہم کافی چھوٹے تھے شاید اسی لیے وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ یہاں پہنچ کر جب میں نے موبائل پہ جگجیت کی غزل لگائی ”غم کا خزانہ تیرا بھی ہے میرا بھی، دل دیوانہ تیرا بھی ہے میرا بھی‘ اس کی داد جب باسط نے بھی دی تو بے چارے حمزہ کو احساس ہوا کہ میں غلط لوگوں میں پھنس چکا ہوں اور ان میں بھی دیگر لوگوں کی طرح پرانی روحیں ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان کے جسم تھوڑے جوان ہیں۔ یہاں سے ہم سب پہ نظر رکھے وادی کی خوب صورتی آنکھوں میں سموتے غزل سرائی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ نیچے ابھی ابھی ایک پجارو آ کر رکی ہے جن سے چند خان بھائی اُترے ہیں اور اب ڈیک پہ لگے پشتو گانے پہ ڈانس بھی کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کو داد بھی دے رہے ہیں، ہمارے گروپ کے کچھ لڑکے بھی ان میں شامل ہو چکے ہیں لیکن خٹک ڈانس میں لڈی مکس نہیں ہو پا رہی۔ لوگ اور گاڑیاں چھوٹی چھوٹی نظر آ رہی تھیں، یہاں دریا کا پاٹ کافی چوڑا ہو گیا ہے اور یہیں ایک جگہ پہ جھولا پُل بھی نصب تھا جو تھا تو مقامی لوگوں کی سہولت کے لیے کہ جن کے گھر دریا کے پار تھے لیکن سیزن میں ٹورسٹ حضرات کے آنے پہ یہ کمائی کا ذریعہ بھی بن جاتا۔ ابھی چوں کہ سیزن شروع نہیں ہوا تھا اس لیے ”ہٹ“ میں بنا کاؤنٹر خالی پڑا تھا اور من چلے اپنی مدد آپ کے تحت آ جا رہے تھے۔ ایک گروپ میں کچھ پریاں بھی تھیں جن کی حفاظت پہ دیو مامور تھے۔ ہمارے گروپ کے کچھ ”برچھوں“ نے جھولا کھینچنے کے عوض کچھ پریوں سے شناسائی پیدا کر لی تھی جس پہ دیو حضرات کو بھی کچھ اعتراض نہ تھا ”مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے۔“

نیچے اُترے روڈ کراس کیا اور ڈھلوان میں اُتر کر دریا کے کنارے تک پہنچنے کی سعی شروع کر دی۔ دریا کا کچھ پانی چھوٹی نالیوں کی صورت میں سڑک تک آ گیا تھا، اسے عبور کیا تو آگے پتھر اور ریت کے چھوٹے موٹے ٹیلے تھے۔ جہاں مجھ جیسی بوڑھی روحیں اور دیگر معمر حضرات جمع تھے۔ کچھ گپ شپ کی سورج ڈھل رہا تھا، شوز اتارے، وضو کیا اور فرشِ خاک پہ ”منہ ول کعبہ شریف“ ہو گئے، حالاں کہ اس میں اشتباہ تھا کہ

قبلہ کس طرف ہے لیکن ہم احباب کی مختلف آرا ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے حساب سے قبلہ رو ہوئے، کہ وہ تو ہر جگہ موجود ہے۔ کیا نماز تھی، لیکن کیا کیا جائے کہ ایسی نمازیں کم کم نصیب ہوتی ہیں۔

آہستہ آہستہ واپس گاڑی کی جانب آئے، گاڑی میں بیٹھے تو پتا چلا کہ ایک چوتھائی نفری یعنی تقریباً آٹھ دس آدمی غائب ہیں۔ ارد گرد دیکھا تو ملبوسات کے رنگوں سے اندازہ ہوا کہ ان میں سے چار پانچ لوگ دریا کے اُس پار ہیں اور اتنے ہی دریا کی اس طرف چرخی گھما کر پریوں کو پرستان بھیج رہے ہیں۔ میگا فون نکال کر انھیں آواز لگائی گئی۔ ہاتھ ہلے لیکن دونوں اطراف کے لوگ دوبارہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اب کے میگا فون پر اعلان کے ساتھ وارننگ بھی دی گئی اور ''ڈیمو'' کے طور پر گاڑی نے بھی حرکت کی تو ایک ہل چل مچی ادھر والوں نے اُدھر والوں کو کھینچا اور اس کھینچا تانی کے بعد ایک قطار میں دوڑتے گاڑی کی طرف لپکے۔ ہم بھی عجیب لوگ ہیں جہاں قطار کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں بنا لیتے ہیں۔

واپسی کا سفر شروع ہوا ''پی ٹی ڈی سی'' پر ہم لوگ اُترے اور باقی اپنے بیس کیمپ ''کنہار ویو'' روانہ ہو گئے۔ میں ''پی ٹی ڈی سی'' کی مسجد چلا گیا، وضو قائم تھا سو اس سردی میں اس کو غنیمت جانا اور عصر کی نماز کی نیت باندھ لی، سلام پھیرا تو دائیں ہاتھ عثمان یاسر صاحب کو مصروفِ نماز پایا۔ نماز سے فارغ ہوئے تو اُسی گرم جوشی سے ملے جس گرم جوشی سے جُدا ہوئے تھے۔ ساتھ کوئی دوست تھا بولے کسی کے ہاں گئے تھے، واپس نکلے تو سوچا آپ سے ملاقات کرتا چلوں۔ پروگرام تھا کہ نماز کے بعد اصغر تنولی صاحب سے آپ کا پتا کروں گا لیکن اچھا ہوا کہ آپ ادھر ہی مل گئے۔ مسجد سے باہر نکلے تو جو بھی ملتا انتہائی ادب اور عقیدت سے اور مولانا بھی اس کے ساتھ خلوص کا اظہار فرماتے۔ میں نے کالج چلنے کو کہا، بولے ادھر ہی تنولی صاحب کے آفس میں بیٹھتے ہیں۔ آفس میں تنولی صاحب موجود تھے بہت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا، نثار بھائی بھی مولانا صاحب کو دیکھ کر چلے آئے۔ تھوڑی دیر میں چائے کے ساتھ گرما گرم فرنچ ٹورسٹ آ گئے اور باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اب کے گفتگو کا محیط پھیل گیا۔ ادب، آرٹ، سیاست اور معاشرہ موضوعِ بحث رہے۔ اس دوران تنولی صاحب، نثار بھائی اور مولانا کے دوست کی حیثیت ایک سامع کی سی تھی لیکن ''میں اور مولانا'' بحث و مباحثے میں مشغول رہے۔ مغرب کا وقت ہوا تو مولانا صاحب مسجد کو نکلے، میں نے تنولی صاحب سے گزارش کی حضرت مسجد میں دریا کے تازہ ترین پانی سے وضو کی صورت میں ایمان کے ساتھ ساتھ جان جانے کا بھی خدشہ موجود ہے۔ مسکرائے اور ایک لڑکے کو میرے ساتھ کر دیا، ''صاحب کو میرے روم میں لے جاؤ اور وضو کرا لاؤ۔'' واپسی پر تنولی صاحب کے گوش گزار کیا ''حضور! آج چاند کی چودھویں ہے، اگر الاؤ کا بندوبست ہو جائے؟'' ہو جائے گا آپ نماز پڑھیں کھانے کے بعد جب آپ واپس کالج جائیں گے تو لکڑی بھی پہنچ جائے گی اور بندہ الاؤ بھی روشن کر دے گا۔ نماز ختم کی تو مسجد کے باہر ہی کھڑے کھڑے عثمان صاحب سے کچھ دیر گپ شپ ہوئی، جانے لگے تو میں نے رات کا پروگرام بتایا بولے ''اگر فرصت ہوئی تو میں آپ لوگوں کو ضرور جائن کر لوں گا، اللہ

حافظ۔۔۔ فی امان اللہ۔۔۔ اور اپنے دوست کے ساتھ جیپ میں بیٹھے اور چلے مسجد کی طرف کہ ”ملا مسجد کی طرف ہی دوڑتے ہیں لیکن یہ تو ملا نہیں ہیں۔۔۔

میں اور عبدالباسط واپس استقبالیہ پہنچے، تنولی صاحب کے آفس میں میرا موبائل چارجنگ پہ تھا، وہ اُٹھایا اور ڈائننگ پہنچے، کھانا تیار ہو چکا تھا، چکن اور چکن کے ساتھ نان۔ دن بھر کے بھوکے تھے سب احباب نے خوب ڈٹ کر کھایا، کھانے کے بعد باہر نکل کر چہل قدمی شروع کر دی، تھوڑی دیر بعد ایک بندہ لکڑیوں سے لدی ریڑھی لیے آن پہنچا ”صاب آپ کا رہائش کدھر ہے؟“ ٹھہرو چلتے ہیں کنہار ویو والے کچھ احباب واپس جا کر آرام کرنا چاہتے تھے اور کچھ ہمارے ساتھ تھے، ہم چلے تو ہمارے ساتھ ایک ریڑھی بان بھی تھا۔ چاندنی رات میں بغیر کسی روشنی کے بھی ہر منظر کے خدوخال عیاں تھے، ہم تھکے ماندے چپ چاپ چلتے تھے جیسے نیند میں چل رہے ہوں اور ہمارے ساتھ ایک ریڑھی بان تھا، چادر کی بُکل مارے، ہم سے بھی زیادہ خاموش۔ ہاں اکلوتے پہیے والی ہتھ ریڑھی کا پہیہ جب کسی گڑھے میں جاتا تو آواز پیدا ہوتی، ہم نے "River Cottage" کا دروازہ کھول کر سامان اندر رکھا، باہر آئے تو ریڑھی بان بھائی لکڑیاں خاص انداز میں ”اہرامِ مصر“ کی شکل میں ترتیب دے کر ان کو آگ دکھا رہے تھے۔ لکڑیوں نے کچھ کچھ آگ پکڑی تو موصوف نے پیٹرول کی بوتل جس کے ڈھکن میں ایک باریک سوراخ تھا اسے دبا کر آگ پر ایک دھار ماری، اور پھر وقفے وقفے سے الاؤ پر دھار ماری ہونے لگی، بوتل سے دھار نکلنا بند ہوئی تو انھوں نے بوتل بھی الاؤ میں جھونک دی اور خود ارد گرد سے سوکھی لکڑیاں اور چیڑ کے درختوں کے پھل جو ہمارے ہاں درباروں پر رکھے جاتے ہیں جن کو معتقد اپنے جسموں پر پھیرتے ہیں، اکٹھے کر کے آگ میں ڈالنے شروع کیے، آگ میں جان سی آ گئی۔ وہ پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا، پھر آگ کے بھڑکتے شعلوں سے مطمئن ہو کر پیچھے ہٹا، ہتھ ریڑھی لی اور آہستہ آہستہ چاندنی میں معدوم ہو گیا۔

کچھ الاؤ کے گرد کھڑے ہو گئے اور کچھ پھسکڑا مار کے بیٹھے لگے آگ تاپنے، پھسکڑا مارنے والوں میں زیادہ تر نوجوان تھے کہ آج کل کے بناسپتی نوجوان یہی کچھ ہیں، آگ ”مچھر“ چکی تھی، شعلے اوپر کو اُٹھتے تو چٹاخے پھوٹتے اور چنگاریاں اُڑتیں، اس صورتِ حال سے ذرا دیر بعد ہی گھیرا کھلا کرنا پڑا۔ سردی کی شدت کم ہوئی تو گھسر پھسر سٹارٹ ہو گئی۔ کسی نے ایک مصرع پھینکا، جواب میں ہم نے پوری غزل پھینکی تو الاؤ کے باہر حلقے میں بھی آگ لگ گئی، ادھر ادھر سے دھڑا دھڑ شعر ماری ہونے لگی۔ شعروں کی یلغار رکی تو کسی نے لطیفہ داغ دیا اور اب لطیفہ بازی چل پڑی۔ بات سرداروں کے لطیفوں سے ہوتی ہوئی، خان بھائیوں کے لطیفوں پر پہنچی تو میں نے روک دیا، میرے نزدیک یہ بھی نسلی اور لسانی عصبیت کی ایک مثال ہے۔ اب ہر لطیفے میں سردار آنے لگے۔ ایک لطیفے کے آغاز میں ایک صاحب ابھی ”ایک سردار۔۔۔ پر ہی پہنچے تھے کہ کسی نے کہا یہ ایک نہیں آج کا پچاسواں سردار ہے، ایک قہقہہ پڑا، بتایا کہ جس طرح مسلمانوں میں سرداروں کے لطیفے مشہور رہیں

اسی طرح سرداروں میں بھی ''مسلوں'' کے لطیفے مشہور ہیں۔۔۔ لطیفہ سیشن کی تان مقوی لطیفوں پر ٹوٹی۔

کچھ دیر بعد اونگھتے ہوئے ''کنہارویو'' والے احباب اُٹھنے لگے، میں عبدالباسط اور اقبال صاحب بھی ان کے ہمراہ اُٹھ آئے، کافی کا موڈ ہو رہا تھا۔ ہم لوگ ناران بازار کے درمیان گاڑی سے اُتر گئے،، چند ہوٹل، کچھ دکانیں اور چائے کے کچھ کھوکھے آباد نظر آئے، ایک کھوکھے پر رش دیکھ کر ہم بھی ادھر چلے آئے، کافی کا آرڈر کیا، کافی دیر بعد کافی ملی اور ہم کافی کے کپ اُٹھائے چسکیاں لیتے واپس ہو لیے، ناران پُل جہاں سے سیف الملوک کے لیے ٹریک نکلتا ہے اس سے تھوڑا پیچھے ایک بہت خوب صورت منظر دیکھنے کو ملتا ہے، ایک کار پارک ہے جس کے دروازے کھلے ہیں اور میوزک کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی ہے، کار کی پچھلی طرف ایک صاحب گیس سٹوو پہ سالن بنا رہے ہیں اور ایک صاحب آلو چھیل رہے ہیں۔ ان سے تھوڑا دور ایک صاحب نماز ادا کر رہے ہیں۔ چٹائی پر دستر خوان لگ چکا ہے، جس پر سلاد رائتہ اور روٹی پڑی ہے ساتھ دو حصوں میں تقسیم ایک تربوز بھی آسمان کی جانب دیکھ رہا ہے۔ شاید سالن اور اُن صاحب کا انتظار ہو رہا ہے جو نماز پڑھ رہے ہیں، ویسے میرا خیال ہے سالن تیار نہیں، اگر تیار ہوتا تو یہ لوگ اس طرح کھانے پینے کا سامان سامنے رکھے اس کی توہین نہ کر رہے ہوتے اور دوسرا وہ صاحب بھی اتنی تسلی سے نماز بھی نہ پڑھ رہے ہوتے، اللہ اعلم بالصواب۔ کافی ناکافی ثابت ہوئی، بالکل ایسے جیسے جُوس کا ڈبہ جب مزا آنا شروع ہوتا ہے ختم ہو جاتا ہے، کافی کے ڈسپوزیبل کپ باسط نے اکٹھے کر لیے، ارد گرد کوئی ڈسٹ بن نظر نہیں آ رہا تھا، ان کو کافی دور آ کر ڈسٹ بن برد کیا۔

''پی ٹی ڈی سی'' کا مین گیٹ عبور کیا تو اندر منظر ہی الگ تھا، چاندنی چیڑ کے درختوں سے چھن چھن کے زمین تک پہنچ رہی تھی، ٹہنی ٹہنی چاندنی میں نہائی ہوئی تھی، درختوں کے سائے زمین پر ''دھوپ چھاؤں'' کا منظر اور چھن کر آنے والی چاندنی ہمارے چہروں پر ''رات دن'' کا منظر بناتی تھی۔ ہوٹل میں موجود مسجد کے پاس سے گزر کر الٹے ہاتھ مڑے تو دائیں ہاتھ ایک کاٹیج کے سامنے الاؤ روشن تھا اور اس الاؤ کے پاس ایک جوڑا روشن تر۔ نوجوان الاؤ کے پاس رکھی کُرسی پر بیٹھا ہاتھ تاپ رہا ہے اور سرخ سویٹر میں ملبوس لڑکی جس کی ناک بھی سویٹر کے رنگ جیسی ہو رہی لڑکے کے پہلو میں کھڑی اس کے چہرے پر جھکی دونوں ہتھیلیاں مسلتی کوئی بات کر رہی ہے پھر دونوں کے چہروں پر مسکان ابھری تو چاندنی پھیکی پڑ گئی۔۔۔ یہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے، لیکن دنیا و مافیہا ان سے بے خبر نہ تھی۔ ہمارے قدموں کی چاپ نے یہ طلسم توڑا تو چاندنی پھر سے روشن ہوگئی۔

کاٹیج کے پاس پہنچے تو بجھے ہوئے الاؤ کے پاس حمزہ اور فیصل بیٹھے تھے باقی لوگ بستر کی آغوش میں جا چکے تھے، اقبال صاحب سیدھے اپنے بستر پر چلے گئے۔ میں اور باسط پروگرام کے مطابق باہر الاؤ کے پاس کُرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ ندیم سونے کے لیے اندر چلا گیا، کرسی پر نیم دراز حمزہ چادر لپیٹے، آگ جلانے اور دھوئیں سے بچنے کی کوشش کرتا تھا، الاؤ میں کچھ اور لکڑیاں جھونک دیں گئیں میں رات کا سحر سر کی اور باسط

کیمرے کی آنکھ سے دیکھنا چاہتا تھا۔ چاند متحرک لیکن ابھی پچھم میں چیڑ کے درختوں پر ٹنگا تھا، دریا کی روانی میں گرچہ ٹھہراؤ آ چکا تھا لیکن پانی کے بہاؤ کی ہلکی ہلکی آواز سماعتوں میں رس گھولتی تھی۔ ہم منتظر تھے کہ چاند چیڑ کے درختوں سے اُتر کر سامنے کے پہاڑ پر اُترے۔ میں اس وقت وہی سننا چاہتا تھا جو خاص اسی وقت کے لیے ہے۔۔۔ راگ درباری۔۔۔ راگوں کی دنیا میں بارعب اور باوقار۔۔۔ میاں تان سین کی عطا۔۔۔ برصغیر کی کلاسیکی موسیقی کا مقبول ترین راگ، جس میں سیکڑوں ہزاروں بندشیں، غزلیں اور گیت ہیں۔ زیادہ تر نچلے سُروں میں گایا جانے والا رات کا راگ۔۔۔ فضا میں سارنگی کی آواز ابھرتی ہے۔۔۔ جس کے تار اُستاد ناظم علی خاں چھیڑتے ہیں، پھر سارنگی کی آواز میں اُٹھان اور تیزی آ جاتی ہے، طبلے پر میاں شوکت حسین خاں ہیں، وہی میاں شوکت جو اُستاد میاں قادر بخش پنجاب گھرانے والے کے شاگرد ہیں، پاکستان میں میاں شوکت اور بھارت میں اُستاد اللہ رکھا نے اپنے اُستاد اور گھرانے کا نام روشن کیا، اس وقت بلا شبہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں پنجاب گھرانے کا طبلہ بج رہا ہے کہ اُستاد عبدالستار تاری جیسے طبلہ نواز بھی اسی گھرانے کے سپوت ہیں، تان پورہ پر عبدالغنی قادری کی انگلیاں متحرک ہوئیں تو سارنگی کے ساتھ ساتھ تان پورے کی لے اُبھرتی ہے، ساتھ ہی اُستاد فتح علی خان کی مدھر آواز میں راگ درباری میں خیال ترانے کے بول فضا میں گونجنے لگتے ہیں۔۔۔ خیال کی ایجاد کا سہرہ حضرت امیر خسرو کے سر ہے جس میں بے معنی الفاظ گائے جاتے ہیں تاہم یہ الفاظ سہل اور غیر ثقیل ہوتے ہیں، یہ موسیقی کی خالص قسم ہے اور سننے والے کی پوری توجہ صرف موسیقی پر مرکوز ہوتی ہے کہ شاعری اس کا حصہ نہیں۔۔۔ تانا، تا نوم اور تانی، تا نوم کی تکرار بتدریج بلند ہوتی جاتی ہے، استاد فتح علی خان کا پہلا سرگم ختم ہوا تو اسد امانت علی خان نے گہری آواز میں رے تا نا، رے تا نا کو پھیلا کر اُٹھایا، پھر استاد کی ”تانا، تا نوم اور تانی، تا نوم۔۔۔“ اسد امانت علی کی آواز پر حاوی ہو گئی۔ اب استاد اور میاں شوکت میں جُگل بندی ہو رہی ہے، استاد کے بولوں پر میاں صاحب طبلہ بجا رہے ہیں، دھا کی آواز پر جیسے ہی ”سم“ ہوا، نیا فیز شروع ہو گیا اب طبلے کے ساتھ ساتھ سارنگی اور تان پورہ بھی میدان میں آ گئے ہیں، ”دھا“، ”ترکٹ“، ”تک“ کی آوازیں ماحول میں ایک سماں باندھ رہی ہیں، وقت جیسے تھم گیا ہو، دریا کی روانی رک گئی ہو، چاند اٹک کر رہ گیا ہو۔۔۔ میں بھی کہیں چلا گیا، شاید میرا جسم وہیں تھا، ہاں میں وہاں نہیں تھا۔۔۔ ترانے کے آخری بول اُبھرے، ”سم“ پر استاد کے خوب صورت سرگم کے ساتھ اسد کی رے تا نا کی آواز بھی ڈوب گئی، آواز کے ساتھ ساز بھی خاموش ہوئے تو وقت متحرک ہو گیا، دریا رواں دواں اور چاند اپنی منزل کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ خیال ترانہ ختم ہوا تو خیالات کا تانا بانا ٹوٹا۔ اب جو دیکھا تو حمزہ موجود نہیں، باسط اپنے کام پر نکل چکا ہے، الاؤ میری طرح بجھا بجھا اور سرد سرد، میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی لیکن کچھ حاصل حصول نہ ہوا تو لیپ ٹاپ سنبھالے اندر اُٹھ آیا۔۔۔

☆☆☆☆

غلام محی الدین

وصی حیدر: جمالیاتی شعور کا مصوّر

جنگیں دوملکوں کے درمیان ہوں یا عالمی، جنگوں کے بعد کچھ نئی تحریکیں جنم لیتی ہیں تو نئے نظریات بھی سامنے آتے ہیں اور جنگوں ہی کے نتیجے میں لیڈر بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مصوری کی دنیا میں ڈاڈاازم تحریک اسی صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہے۔ ڈاڈاازم جسے ماہرینِ مصوری تجرید کی تجدید کا نام دیتے ہیں زیادہ مقبول نہیں ہوسکی اور یہ تحریک اب قریب قریب دم توڑ چکی ہے۔ 1971 کی پاک بھارت جنگ نے ایک ایسے مصور کو جنم دیا جو آج فنِ مصوری میں نہ صرف ایک نمایاں مقام رکھتا ہے بلکہ اس کی شہرت اب ملک سے نکل کر دنیا بھر میں پھیلنے والی ہے۔ آخر اس نے ایسا کون سا کام کیا ہے جو ہم اس قسم کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ تو اس کا تذکرہ ہم اگلی سطور میں کریں گے پہلے اس کے فن اور اس کی شخصیت پر کچھ بات کرلی جائے۔

1971 میں وصی کی عمر بچپنے کی حدوں میں تھی۔ پاک بھارت جنگ ہوئی تو اور بچوں کی طرح وہ بھی جذبۂ جہاد سے سرشار تھا۔ اپنے اسی جذبے کی تسکین اُس نے پاکستانی افواج کے بہادری کے کارناموں پر مشتمل تصویریں بنا کر کی کہ ایک پیدائشی مصور اس کے اندر پہلے سے موجود تھا۔ تصویریں بنائیں تو خود اس پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ مصوری کرسکتا ہے۔ غرض اس کے بعد ہی سے اُس نے اپنے جذبے کو شوق کی شکل دے دی اور آج ہمارے سامنے یہی جذبے اور یہی شوق وصی حیدر مصور کی شکل میں موجود ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا اور آج اس کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ البتہ آج اس کے خزانے میں پاک بھارت جنگ سے متاثر ہوکر بنائی جانے والی تمام تصویریں محفوظ ہیں جن کو دیکھ کر اس کے فن کے ارتقا اور عروج کا بخوبی اندازہ لگایا جاتا ہے۔ آج وصی حیدر کی سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں پینٹنگز نہ صرف ملک کے اہم اداروں اور مصوری کے قدر دانوں کے کلیکشنز میں موجود ہیں بلکہ بیرونِ ملک بھی شائقینِ مصوری کی تسکین کا سامان پیدا کررہی ہیں۔ قومی اسمبلی، ملک کے مختلف ائرپورٹس، جامعہ کراچی، مختلف فائیو اسٹارز ہوٹلز اور بینکوں وغیرہ میں ان کے فن پارے شائقینِ فن کو تسکین کا بہم پہنچا رہے ہیں۔ ان کی 20 ویں سولو ایگزیبشنز

اور 250 سے زائد گروپ ایگزیبشنز کراچی، اسلام آباد، لاہور، نیویارک، لندن، دبئی، کینیڈا، ممبئی، نیپال، جے پور، سنگاپور وغیرہ میں ہو چکی ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف اس کا کام روز بروز بلندیوں کی جانب مائل بہ سفر رہا بلکہ وقتاً فوقتاً اس کے کام میں نمایاں تبدیلیاں نظر آتی ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ اس کے اندر تخلیق کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ وہ مستقلاً ایک ڈگر پر قائم نہیں رہتا بلکہ اپنے انداز اور طرز تبدیل کرتا رہتا ہے۔ ایک زمانہ تھا اس نے کولاج پر بہت کام کیا اور بے شمار پورٹریٹس بنائے، پھر وہ ٹائم اینڈ سپیس کے دائروں میں گم نظر آیا۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ مصوری کی تاریخ دیکھی جائے تو پتا چلتا ہے کہ قریباً ہر اہم اور معروف مصور نے کسی نہ کسی وقت میں دائروں کو اپنا موضوع بنایا ہے اور دائرہ مصوری کی بنیادی فارمز میں شامل ہے۔ ٹائم اینڈ سپیس سیریز میں وصی حیدر نے بھی دائرے کو اپنی پینٹنگز کی بنیاد بنایا لیکن اس کے کام کی ایک خوبی یہ ہے کہ اُس نے کبھی بھی خود کو ان دائروں میں محدود یا مقید نہیں ہونے دیا بلکہ ان دائروں کا استعمال اس خوبی سے کیا کہ کائنات کی وسعتیں دائروں کے اندر نہیں بلکہ باہر کی جانب اس طرح نظر آتی ہیں کہ ناظر انھی وسعتوں میں گم ہو جاتا ہے۔ دائروں کے حوالے سے وہ خود یہ کہتا ہے کہ دائرہ سورج کی علامت بھی ہے، چاند کی علامت بھی اور ہماری زمین کی علامت بھی ہے مگر وہ اپنے ٹیکسچر اس طرح تخلیق کرتا ہے کہ کائنات کی وسعتیں اس میں نمایاں ہوتی ہیں۔

وصی حیدر کے فن پاروں کی سب سے منفرد خوبی یہ ہے کہ ان میں کسی قسم کا ابہام نہیں پایا جاتا۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام فن پارے منطقی انداز سے تخلیق کرتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کا کام اپنی تفہیم خود ہی بیان کرتا نظر آتا ہے۔ شاید قارئین یہ سوال اٹھائیں کہ فن پارے تو تخلیقی بنیادوں پر اپنا مقام بناتے ہیں تو ہم یہاں یہ بات بھی قارئین کے علم میں لانا چاہتے ہیں کہ وصی حیدر محض ایک مصور نہیں ہے۔ اس کے اندر ایک باوقار اور باصلاحیت ادیب اور شاعر بھی چھپا ہوا ہے اور وہ نہ جانے کن وجوہ پر اپنا یہ ہنر لوگوں کے سامنے اُجاگر نہیں کرتا مگر اس کا یہ ہنر اس کی تصویروں میں اس طرح نمایاں ہوتا ہے کہ اس کی تحریریں تخیل اور ہنر کے پھولوں سے سجی، منطق کی شال اوڑھے نظر آتی ہیں۔ اسے بلاشبہ جمالیاتی شعور کا مصور کہا جا سکتا ہے۔

مصوری میں رنگ بھی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ رنگوں کی اپنی زبان ہوتی ہے۔

ان کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ رنگ کچے بھی ہوتے ہیں اور پکے بھی۔ ان کے جذبے اور احساس بھی مختلف ہوتے ہیں۔ وصی حیدر رنگوں کی نفسیات سے اچھی طرح آگاہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے فن پاروں میں ہر طرح کا رنگ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کرتا نظر آتا ہے۔ وصی حیدر تصویریں بناتے وقت ہوسکتا ہے کہ خود کو ایک آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہو مگر وہ جس انداز سے رنگوں کا استعمال کرتا ہے اور ٹیکسچر سے جس قسم کا پس منظر پیش کرتا ہے، دیکھنے والا مسحور ہو جاتا ہے۔

وصی حیدر کو اگر ہم ماڈرن پینٹرز کی صف میں کھڑا کریں تو اس کو ٹریڈیشنل یعنی روایتی مصوروں کی صف میں بھی نمایاں دیکھتے ہیں۔ اس نے مختلف ادوار میں مختلف انداز کے کام کیے۔ ٹائم اینڈ سپیس کے ساتھ ساتھ اس نے عورت کے چہروں پر بھی بے پناہ کام کیا ہے۔ وہ جس انداز کے چہرے بناتا ہے کم از کم ہمارے مشاہدے میں تو یہ انداز ہمیں کہیں نظر نہیں آیا اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان چہروں سے مختلف تاثرات اس طرح اُبھارتا ہے کہ یہ اپنی کہانی خود کہتے نظر آتے ہیں گویا انھیں زبان مل جاتی ہے۔

اُس نے کلاسیکی موسیقی اور رقص پر بھی بے شمار تصویریں بنائیں۔ مصورانہ خطاطی بھی کی۔ اجنتا اور ایورا کے غاروں میں پائے جانے والے مجسموں کو مصور کیا۔ نیوڈازم پر بھی کام کیا مگر التزام یہ رکھا کہ یہ کام ہماری معاشرتی اقدار سے متصادم نظر نہیں آتا۔ ہماری نظر میں اُس کے دو کام ایسے ہیں جن میں سے ایک قومی سطح پر اور دوسرا عالمی سطح پر یادگار ہے۔ پہلا کام اُس کی انتہائی منفرد طرز کی سیریز لیجنڈز آف پاکستانی آرٹ ہے۔ اس سیریز میں اس نے ملک کے 25 ماسٹرز پینٹرز کو اس طرح بنایا ہے کہ خود ماسٹر کا پورٹریٹ، اس کی تصویر اور اپنا مخصوص دائرہ پینٹ کیا ہے۔ اس طرح کے کام کے بارے میں اس سے قبل کسی مصور نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وصی حیدر اس بارے میں کہتا ہے کہ یہ سیریز بنانے کے میرے دو مقاصد تھے، ایک تو ان استادوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا اور دوسرے یہ کہ لوگ ان میں سے بہت سے استادوں کے کام سے تو آشنا ہوتے ہیں مگر اُن کے چہروں سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ اس سیریز سے لوگ انھیں پہچاننے لگیں گے۔ سیریز میں شامل مصوروں میں سے کچھ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وصی حیدر اب اس سیریز کی دوسری قسط بنانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

وصی حیدر کا دوسرا بڑا کام معروف ادیب، ناول نگار اور شاعر اختر رضا سلیمی کے ناول کے لیے ایک

ہزار ایک (1001) ٹائٹل پینٹ کرتا ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق دنیا بھر میں اس طرح کا کام کسی نے اب تک نہیں کیا۔ یعنی ایک ہزار ایک کتابوں پہ ہر کتاب کا گرد پوش دراصل ایک اوریجنل پینٹنگ ہے اور ہر ایک، ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہے۔ یہ کام ایسا ہے کہ اس کے کرنے کے لیے سوچنا بھی محال نظر آتا ہے مگر وصی حیدر نے یہ کر دکھایا۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ فنِ مصوری سے اس کا لگاؤ اور یہ بلند ہمتی ایسی ہے کہ اس کا شمار بھی آنے والے دنوں میں اُستاد مصوروں میں ہوگا۔ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو اس کا یہ کارنامہ گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کا حصہ بن جائے گا جسے آئندہ آنے والے طویل عرصے تک بھی کوئی توڑنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔

☆☆☆☆

کم سی آنگ۔ اوک
انگریزی سے ترجمہ: اطہر قیوم

موجین کا سفر

(۲)

جن لوگوں سے میں رات کو ملا

رات کے کھانے سے کچھ دیر پہلے میں اس گلی میں گیا جہاں تمام اخبارات کے علاقائی دفاتر واقع تھے۔ میری چچی کوئی اخبار نہیں خریدتی تھی مگر شہر میں رہنے والے ہر آدمی کی طرح میرے لیے، اخبارات زندگی کا ایک لازمی جزو تھے، جن کی زندگی کے ہر دن کی ابتدا اور انتہا پر حکومت قائم تھی۔ اخبار کے دفتر میں اپنی چچی کے گھر کا پتہ اور وہاں پہنچنے کے لیے ایک وضاحتی نقشہ مہیا کرنے کے بعد میں وہاں سے نکل آیا۔ جب میں وہاں سے نکل رہا تھا تو میں نے اپنے عقب میں کُھسر پُھسر کی آوازیں سنیں، دفتر میں کچھ لوگوں نے یقیناً مجھے پہچان لیا تھا۔

واقعی؟ یہ بڑا مغرور نظر آتا ہے……"
"……اس نے بڑی کامیابی حاصل کی ہے……"
"……بہت عرصہ پہلے……اخراجات………"

اس طرح کی سرگوشیوں کے درمیان، میں اندر ہی اندرُ دن بجیزُ کے الفاظ سننے کی خواہش کر رہا تھا مگر یہ الفاظ کسی نے نہ کہے۔ سیول اور موجین میں یہی فرق تھا۔ یہ جانے بغیر، اس دفتر میں موجود لوگ اپنی ہی سرگوشیوں کے طوفان میں گم ہو جائیں گے، اس حقیقت کا احساس کیے بغیر کہ جب وہ اس کُھسر پُھسر سے باہر آئیں گے تو انہیں کتنے خالی پن کا احساس ہو گا۔ وہ سرگوشیاں، اور سرگوشیاں، اور سرگوشیاں کرتے ہی چلے جائیں گے۔

سمندر کی جانب سے تیز ہوا چل رہی تھی۔ گلی میں ہجوم اس سے زیادہ ہو چکا تھا جتنا کہ چند گھنٹے پہلے تھا۔ جب میں بس سے اترا، بچے اسکولوں سے واپس آ رہے تھے۔ جیسے انہیں اپنے بستے بھاری لگ رہے ہوں، بچے انہیں اپنے گرد گھما رہے تھے یا انہیں اپنے کندھوں سے لٹکائے ہوئے تھے اور کچھ نے انھیں اپنے بازوؤں میں سختی سے جکڑا ہوا تھا اور اسی دوران میں اپنی زبانوں کے سروں پر ببل پھلا رہے تھے۔ اسکول ماسٹر اور دوسرے اہلکار بھی دن کے کھانے کے خالی تھیلوں کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ سر جھکائے جا رہے تھے۔ تب

اچانک یہ خیال میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا کہ یہ سارا کھیل ہے۔ اسکول جانا، بچوں کو پڑھانا، کام پر جانا، پھر گھر واپس آنا، یہ سب کچھ مجھے صرف ایک فضول کھیل لگا اور مجھے یہ مضحکہ خیز احساس ہوا کہ لوگ بغیر کسی مقصد کے نہ ختم ہونے والی کوششوں میں مصروف اور ایسی چیزوں سے چپکے ہوئے ہیں۔

جب میں اپنی چچی کے گھر رات کا کھانا کھا رہا تھا تو ایک شخص مجھے ملنے آیا۔ مجھ سے ملنے کے لیے آنے والا کوئی پارک نامی شخص تھا، جو موجین مڈل سکول میں، مجھ سے کافی سال پیچھے تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان دنوں اس سے سخت متاثر تھا کیوں کہ وہ صحیح معنوں میں ایک کتابی کیڑا ہوا کرتا تھا۔ اپنی نوجوانی میں پارک کو بھی ادب کا جنون رہا تھا اور اگرچہ اس نے بتایا کہ اس کا پسندیدہ مصنف، امریکی مصنف ایف سکاٹ فٹز جیرالڈ تھا مگر فٹز جیرالڈ کے ناولوں کے ہیرو کے برعکس وہ نشست و برخاست کے اچھے انداز رکھنے والا، سنجیدہ اور غریب آدمی تھا۔ “مجھے اخبار کے دفتر کے ایک دوست نے آپ کی یہاں موجودگی کے بارے میں مطلع کیا ہے۔ آپ یہاں کیسے تشریف لائے؟” وہ مجھ سے مل کر واقعی بہت خوش ہوا تھا۔

“کیا کوئی ایسی وجہ ہے کہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا؟ میں نے جواب دیا لیکن میرے الفاظ نے خود مجھے پریشان کر دیا۔

“نہیں نہیں۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ ایک طویل عرصے سے آپ یہاں نہیں آئے۔ میں نے جب سے فوج کو خیرباد کہا ہے اس کے بعد آپ کا یہ پہلا دورہ ہے۔ چنانچہ یہ……

“پہلے ہی چار سال ہو چکے۔”

چار سال پہلے ایک ادویات بنانے والی کمپنی جو اس وقت ایک بڑی کمپنی میں ضم ہو رہی تھی۔ اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت ختم ہو جانے پر، میں موجین آیا تھا۔ نہیں میرے موجین واپس آنے کی صرف یہی واحد وجہ نہیں تھی۔ اگر صرف “حی” جو اس وقت میرے ساتھ رہتی تھی، میرے ساتھ ہی رہتی تو موجین کا سفر کبھی نہ ہوتا۔

“آپ کی اب شادی ہو چکی ہے، میں نے سنا ہے؟”

“ہاں! اور تمہاری۔۔۔۔؟”

“ابھی نہیں، میں نے سنا ہے کہ آپ نے بہت اچھی جگہ شادی کی ہے۔”

“کیا واقعی؟ تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ تمہاری اب کیا عمر ہو گئی ہے؟”

“اُنتیس سال۔”

“اُنتیس، ہوں……خیال کیا جاتا ہے کہ نواں ایک بدقسمت سال ہوتا ہے……لیکن پھر بھی اس سال تمہیں شادی کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔”

“ہاں! ہاں! دیکھتے ہیں” پارک نے اپنا سر کسی لڑکے کی طرح کھجایا۔

چار سال پہلے جب میں انتیس سال کا تھا تقریباً انھی دنوں جی نے مجھے چھوڑ دیا اور انھی دنوں میری بیوی کا پہلا خاوند فوت ہوا تھا۔

“امید ہے کہ کچھ خرابی نہیں ہے۔ سب ٹھیک تو ہے؟” پارک نے، جسے میرے موجین کے گزشتہ دوروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم تھا، مجھ سے پوچھا۔

“نہیں، مجھے شاید ترقی دی جا رہی ہے چناں چہ میں نے چند یوم کی چھٹی لی ہے۔”

“واہ۔ یہ اچھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آزادی سے لے کر اب تک آپ موجین کے سب سے کامیاب شخص ہیں۔” میں اس پر مسکرا دیا۔

“ہاں! آپ اور آپ کے ہم جماعت 'چو' ۔۔۔۔”

“تمہاری مراد اس لڑکے سے ہے، جو ہر وقت میرے ساتھ چپکا رہتا تھا۔”

“جی ہاں! اس نے پچھلے سال سول سروس کا امتحان پاس کیا اور اب مقامی ٹیکس آفس کا سربراہ ہے۔”

“واقعی؟”

“آپ کو معلوم نہیں؟”

“میرا اس سے رابطہ نہیں رہا۔ کیا وہ یہاں کچھ عرصہ پہلے ٹیکس آفیسر کے طور پر کام نہیں کر رہا تھا؟”

“جی ہاں!”

'یہ بہت اچھی خبر ہے۔ شاید میں آج شام اس سے ملنے جاؤں۔”

میرے دوست چو کا قد چھوٹا اور رنگت کالی تھی۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتا تھا کہ جب وہ میرے دراز قد اور زرد رنگت کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا تو اسے ایک طرح کے احساس کمتری کا احساس ہوتا تھا۔

“ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک لڑکا ہوتا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ اس کے ہاتھ پر کوئی اچھی قسمت کی لکیر نہیں تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر ناخنوں سے قسمت کی اچھی لکیریں کھرچ کر بنا دیں اور خوب محنت کی۔ بعد ازاں وہ کامیاب ہو گیا اور خوشی خوشی اپنی زندگی بسر کی۔” چو اسی قسم کا ایک لڑکا تھا جو ایسی کہانیوں سے آسانی سے بہت متاثر ہوتا تھا۔

“آج کل تم کیا کر رہے ہو۔” میں نے پارک سے پوچھا۔

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ یوں ہچکچایا جیسے اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے بتایا کہ وہ پرانے سکول میں پڑھا رہا ہے۔

“یہ بہت اچھا ہوتا ہو گا۔ تمہارے پاس پڑھنے کو بہت وقت ہے۔ ان دنوں مجھے تو کوئی رسالہ تک پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔ تم کیا پڑھاتے ہو؟”

پارک کی جیسے میرے الفاظ سے حوصلہ افزائی ہوئی تھی اس نے شگفتہ آواز میں کہا:

”میں کورین پڑھاتا ہوں۔“

”یہ بہت اچھا ہے۔ اسکول کے نکتۂ نظر سے انہیں آسانی سے تم جیسا استاد میسر نہیں ہو سکتا تھا۔“

”واقعی نہیں۔ اساتذہ کی تربیت کے کالجوں میں موجود تمام لوگوں میں یہ مشکل ہے کہ کسی کے پاس بھی صرف پڑھانے کی سند موجود ہو۔“

”کیا ایسا ہی ہے؟“ بغیر کوئی لفظ کہے پارک نے صرف تلخی سے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ڈنر کے بعد ہم نے ایک دو جام پیے اور چو کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ گلی تاریک تھی جب ہم پل پر سے گزرے تو میں نے پانی میں ندی کے کناروں پر موجود درختوں کا مدہم عکس دیکھا۔ گزرے دنوں میں جب میں اس پل پر سے گزر رہا تھا تو میں نے ان تاریک دیکھے ہوئے درختوں کو کوسا تھا جو وہاں یوں ایستادہ تھے جیسے اگر میں نے چیخ بلند کی تو وہ فوراً میری طرف دوڑ پڑیں گے۔ میں نے اس لمحے یہاں تک سوچا تھا کہ کتنا اچھا ہوتا اگر دنیا میں کوئی درخت نہ ہوتا۔

”یہاں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔“ میں نے رائے ظاہر کی۔

”شاید۔“ پارک مدہم آواز میں بڑبڑایا۔

چو کے دیوان خانے میں چار دوسرے مہمان بھی موجود تھے۔ میں نے دیکھا کہ چو، جو مجھ سے گرم جوشی مل کر تقریباً دکھاوے والے انداز میں ہاتھ ملا رہا تھا، اس کا سانولا چہرہ ملائم ہو گیا تھا۔

”آؤ...... بیٹھ جاؤ۔ مجھے افسوس ہے کہ یہاں اتنا بوجھل پن ہے۔ مجھے ضرور ایک بیوی حاصل کرنی چاہیے......“ لیکن کمرہ بوجھل ہرگز نہیں تھا۔

”کیوں! کیا تم نے ابھی شادی نہیں کی۔“ میں نے پوچھا۔

”ہوں۔ بس یہ کچھ ایسے ہی ہوا۔ میں جب قانون کی کتابوں میں سر کھپا رہا تھا تم جانتے ہو...... بیٹھ جاؤ۔

میرا پہلے سے موجود لوگوں کے ساتھ تعارف کرایا گیا۔ ان میں سے تین آدمیوں کا تعلق ٹیکس کے دفتر سے تھا۔ آخری ایک عورت تھی، جو پارک کے ساتھ چند الفاظ کا تبادلہ کر رہی تھی۔

”آیئے مس حاہ، یہاں کوئی راز نہیں ہیں۔ آیئے میں آپ کا تعارف اپنے پرانے ہم جماعت، مین ہی جنگ سے کراؤں۔ یہ سیول میں ایک بہت بڑی دوا ساز کمپنی کے مینیجر ہیں اور یہ حاہ ان سک ہیں۔ پرانے اسکول میں موسیقی کی استاد۔ انھوں نے گزشتہ سال سیول کے ایک موسیقی اسکول سے گریجویشن کی ہے۔

”گویا آپ اور پارک ایک ہی سکول میں پڑھاتے ہیں؟“ میں نے باری باری پارک اور مس حاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں!“اس نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور پارک نے اپنا سر جھکا دیا۔

”کیا بنیادی طور پر آپ کا تعلق موجین سے ہے۔“

”نہیں! مجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔ لہٰذا میں یہاں اپنے ہی بندوبست پر رہتی ہوں۔“

اس کا چہرہ بغیر کسی شناخت وساخت کے نہیں تھا۔ یہ بیضوی چہرہ تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں اور رنگت زردی مائل تھی۔ مجموعی طور پر وہ نرم و نازک ہونے کا تاثر دے رہی تھی مگر اس کی اوپر اٹھی ناک اور بھرپور لب کہہ رہے تھے کہ اس طرح کا کوئی تاثر قائم نہ کیا جائے۔ مزید برآں اس کی تیز اونچی مضبوط آواز، اس کی ناک اور لبوں سے پیدا ہونے والے تاثر کو مزید گہرا کر رہی تھی۔

”آپ کا بنیادی مضمون کیا تھا۔“

”گلوکاری۔“

”مگر یہ پیانو بھی بہت خوبصورتی سے بجاتی ہیں۔“ پاس کھڑے پارک نے محتاط آواز میں اضافہ کیا۔ چو بھی گفتگو میں شامل ہو گیا۔

”یہ کمال کی گلوکارہ ہیں۔ ان کی سپرینو بھی خاصے کی چیز ہے۔“

”اوہ! آپ سپرینو ہیں۔“

”ہاں! گریجویشن کی تقریب میں، میں نے ”مادام تتلی“ سے لیا گیا ”ایک کھلے کھلے دن میں“ گایا تھا۔ اس نے ایسی آواز میں کہا، جس میں ان گئے دنوں کی خواہش اور یادیں محسوس کی جا سکتی تھیں۔ ریشم کے گدے فرش پر بچھے تھے اور ان کے اوپر تاش کے پتے بکھرے پڑے تھے۔ یہ ان دنوں کے وہی پتے تھے جب تقریباً دوپہر کے وقت میں جاگ کر بیٹھ جاتا اور سگریٹ کا آخری سرا جو تقریباً میرے لبوں کو جلانے لگتا، بھینچی بھینچی سگریٹ کے دھوئیں سے اشک آلود آنکھوں کے ساتھ میں اپنے بدقسمت دن کی کمائی کا حساب کرتا۔ یہ اسی جوئے کی میز پر پڑے وہی پتے تھے، جس پر میں گر پڑا تھا۔ پتے جنہوں نے میرے سارے جسم کو سن کر دیا تھا۔ سوائے میرے جلتے ہوئے سر اور کانپتی انگلیوں کے!“

”آپ کے پاس یہاں کچھ پتے ہیں، پتے؟“

میں نے ایک پتہ اٹھا کر اسے نیچے پھینکتے ہوئے بڑبڑاہٹ کے انداز میں پوچھا۔

”کیا ہم رقم لگا کر کھیلیں گے۔“ ٹیکس دفتر کے ایک آدمی نے پوچھا لیکن مجھے تاش کھیلنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔

”پھر کسی وقت سہی۔“

ٹیکس دفتر کے لوگوں کے چہروں پر بیزاری پھیل گئی۔

چو باہر گیا اور واپس آ گیا، کچھ ہی دیر بعد مشروبات لائے گئے۔

”آپ کا یہاں قیام کتنا ہے۔“

”تقریباً ایک ہفتہ۔“

”اس بات کا کیا مطلب ہے کہ آپ مجھے مدعو کیے بغیر شادی کرنے جا رہے ہیں؟“ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا کیوں کہ میں پورا دن ٹیکس دفتر میں اعداد گننے میں پھنسا ہوا تھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ میں غریب تھا مگر پھر بھی آپ کو مجھے دعوتی کارڈ ضرور بھیجنا چاہیے۔“

”فکر نہ کرو۔ آپ کو اس سال کے اندر اندر شادی کا (دعوتی کارڈ) مل جائے گا۔“ ہم دونوں تھوڑی بیئر پی رہے تھے جس پر زیادہ جھاگ نہیں تھی۔

کیا یہ ایک دواساز کمپنی نہیں ہے جہاں آپ دوائیں تیار کرتے ہیں۔“

”یقیناً۔“

”اچھا۔ آپ کو یہاں بیمار پڑ جانے کی پریشانی بھی نہیں ہوگی۔“

ان سب نے زوردار قہقہے بلند کیے اور ایک دوسرے کی رانوں پر ہاتھ مارے جیسے کسی نے کوئی بہت ہی مزاحیہ لطیفہ سنایا ہو۔

پارک تم واقعی بہت ہر دلعزیز استاد ہو۔ تم کبھی میرے ہاں نہیں آئے اگرچہ میں پانچ منٹ کی مسافت پر رہتا ہوں۔“

”میرا یہ ارادہ رہا ہے کہ تمہارے ہاں آؤں مگر...... مس حاہ مجھے اس بارے میں مطلع کرتی رہتی ہیں۔“ ”اگرچہ، مس حاہ۔ بیئر کا گلاس لیں۔ اس سے بہتر کوئی حقیقی شراب نہیں ہوتی۔ آیئے، آیئے۔ آپ آج کی شام اتنی شرما کیوں رہی ہیں، اس طرح نہیں کرتے۔“

”شکریہ۔ براہ مہربانی اسے وہیں رہنے دیں میں خود اٹھا لوں گی۔“

”کیا آپ پہلے بھی بیئر پیتی رہتی ہیں؟“

”جب میں کالج میں تھی تو میں کچھ دوستوں کے ساتھ ”سوجو“ (ایک ہر دلعزیز سخت کورین شراب) بھی مقفل دروازوں کے پیچھے چھپ کر پیتی رہی ہوں۔“

”مس حاہ، مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ایک خفیہ شرابی ہیں۔“

”او نہیں۔ میں اس لیے نہیں پیتی تھی کہ مجھے اس کی خواہش تھی۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کا ذائقہ کیا ہے۔“

”آپ کو کیسا لگا؟“

”خیر، مجھے واقعی نہیں معلوم۔ میں جونہی خالی گلاس نیچے رکھتی تو سو جاتی“

وہ سب ہنسے۔ پارک ایسے نظر آتا تھا کہ ان کے ساتھ ہنسنے پر خود کو مجبور کر رہا ہے۔

’’جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے۔ مس حاہ کی یہ سب سے اچھی بات ہے کہ وہ ہمیشہ کہانی انتہائی دلچسپ انداز میں سناتی ہیں۔‘‘

’’یہ شعوری طور پر نہیں ہے۔ میں (کہانی) دلچسپ بنانے کی کوشش نہیں کرتی۔ میں جب کالج میں نہیں تھی۔ تب بھی ہمیشہ ایسے ہی بات کرتی تھی۔‘‘

’’اوہ! ٹھیک یہی بات ان کی اتنی اچھی نہیں ہے۔ کیا آپ .... ’’میں کالج میں تھی‘‘ والے حصے کو چھوڑ نہیں سکتیں۔‘‘

’’آپ میرے جیسے لوگوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیں گی جو کبھی کالج نہیں گئے۔‘‘

’’مجھے افسوس ہے۔‘‘

’’پھر معذرت کے طور پر آپ ہمارے لیے ایک گیت گائیں گی۔‘‘

’’ہاں ایک گیت ...... ایک گیت۔۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘

’’تو پھر ہو جائے۔ ایک گیت ۔۔۔۔‘‘

سب نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ وہ ہچکچائی۔

’’ہمارے ہاں آج سیول سے آئے ہوئے ایک خصوصی مہمان موجود ہیں۔ وہی گائیں جو آپ نے اس رات گایا تھا وہ بہت خوبصورت (گیت) تھا۔‘‘ چو نے اسے اکسایا۔

’’ٹھیک ہے، میں گاؤں گی۔‘‘

اس نے گانا شروع کر دیا۔ اس کے چہرے پر تقریباً کوئی تاثر نہیں تھا اور صرف اس کے ہونٹوں میں خفیف سی حرکت تھی۔ ٹیکس دفتر کے لوگ، اس گیت کی طرز کے مطابق اپنی میزیں بجا کر اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ’’ماکپو کے آنسو‘‘ گا رہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ ’’ماکپو کے آنسو‘‘ اور ’’ایک کھلے دن‘‘ میں کتنی زیادہ مطابقت تھی اور وہ کیا چیز تھی جو اس گلے کی رگوں میں سے ایک ہر دلعزیز گیت پیدا کر رہی تھی، جس گلے کی تربیت صرف ’اریاس‘ گانے کے لیے ہوئی تھی۔ ’’ماکپو کے آنسو‘‘ میں، جو وہ گا رہی تھی، کسی بار کی ملازمہ کے گیت جیسی اونچی اور سخت آواز نہیں تھی نہ اس میں آواز کا وہ بھاری پن تھا جو مقبول عام گیتوں میں ایک خاص احساس پیدا کر دیتا ہے۔ نہ ہی وہ قابل رحم جذباتیت تھی، جو عموماً ایسے گیتوں کا خاصہ ہے۔

’’ماکپو کے آنسو‘‘ اس وقت کوئی مقبول گیت نہیں تھا۔ جب مس حاہ نے اسے گایا۔

پھر بھی اس میں ’’مادام تتلی‘‘ سے کم (اریاس) تھا۔

یہ گیت کی بالکل نئی قسم تھی۔ اس میں کچھ اس طرح کا ترنّم تھا جو عام طور پر گیتوں میں پائے جانے والے ترنّم سے مختلف تھا، ایک حد درجہ جارحانہ ترنّم اور ’’کھلے دن‘‘ کے سُر کی بلندی سے لحہ بہ لحہ

بلند ہوتا اور چیختا ہوا سُر۔

اس نئے سُر میں ایک بکھرے بالوں والی پاگل عورت کی ٹھنڈی مسکراہٹ داخل ہو چکی تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ اس میں موجین کی باس بھی موجود تھی۔ وہ باس جو گلی سڑی لاش کی باس سے مماثل تھی۔

جب اس نے گیت ختم کیا تو میں لاشعوری طور پر مسکرا دیا اور احمقانہ انداز میں تالیاں پیٹنا شروع کر دیں۔ اچانک مجھے اس بے وقوفانہ حرکت کا احساس ہوا اور میں سنبھل گیا۔

شاید یہ کوئی کشف تھا، کہ پارک کو اب یہاں سے جانے کی شدید خواہش ہو رہی تھی۔ جب میری آنکھیں پارک کی جانب اٹھیں تو جیسے وہ اسی انتظار میں تھا کہ میں اس کی جانب دیکھوں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نے اسے دوبارہ بیٹھ جانے کی درخواست کی لیکن پارک نے ایک کمزور مسکراہٹ کے ساتھ سر انکار میں ہلایا۔

”مجھے جلدی جانے پر افسوس ہے۔ میں کل دوبارہ آپ سے ملوں گا۔“ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

چو، دروازے تک اور میں باہر گلی تک اسے چھوڑنے گیا تو رات ابھی جوان تھی، مگر گلی بالکل سنسان تھی۔ کہیں سے ایک کتا بھونکا اور گلی سے کچھ چوہے ہمارے سایوں سے گھبرا کر، کچھ کھاتے ہوئے، تیزی سے غائب ہو گئے۔

”دیکھو دھند چھا رہی ہے۔“ پارک نے کہا اور جیسے ہی یہ کہا۔ گلی کی نکڑ پر موجود مکانوں کے سائے، جن میں کہیں کہیں روشنیاں بھی چمک رہی تھیں، غائب ہونا شروع ہو گئے تھے۔

”تمہیں مس حاہ سے محبت ہے؟ کیوں کیا ایسا نہیں ہے؟“ پارک سے میں نے ایک بار پھر کمزور مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

”کیا چو اور اس کے درمیان کوئی چکر وکر چل رہا ہے۔“

”مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ چو اس کے ساتھ ممکنہ شادی کے بارے میں سوچ رہا ہے۔“

”اگر تم اسے چاہتے ہو تو تمہیں اس بارے میں زیادہ مثبت اقدامات اٹھانے چاہئیں۔ قسمت بخیر۔“

”مجھے یقین نہیں ہے.....“ کسی لڑکے کی طرح پارک ہکلایا۔ ”اسے ان مادیت پرست لوگوں کے سامنے ایک پاپ گیت گاتے ہوئے دیکھنا قابلِ افسوس تھا۔ بس اتنی سی بات تھی، اسی لیے میں وہاں سے چلا گیا۔“ پارک نے دھیمی آواز میں کہا۔ جیسے اپنے غصے کو دبا رہا ہو۔

”ہوں، ٹھیک ہے، ہر چیز کے لیے ایک مناسب جگہ ہوتی ہے۔ خواہ وہ کلاسیکی گیت ہوں یا پاپ۔ میرا نہیں خیال کہ تمہیں اسے قابلِ افسوس سمجھنا چاہیے.... میں نے اسے جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کی اور وہ چلا گیا جب کہ میں دوبارہ ان مادیت پرستوں کی محفل میں آن بیٹھا۔

موجین میں ہر شخص دوسروں کو مادیت پرست سمجھنے کی عادت میں مبتلا ہے۔ خود میں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ سوچنا کہ جو کچھ بھی اور لوگ کر رہے ہیں، وہ محض ایک کھیل تماشا ہے جو خالص بے عملی یا نکمے پن

سے کسی طرح مختلف نہیں۔ جب رات خاصی بیت چکی تو ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ چو نے مجھے رات وہیں بسر کرنے پر زور دیا لیکن میں چوں کہ صبح گھر پر دیر تک سونے کا ارادہ لیے ہوئے تھا، اس لیے میں نے اسی وقت جانے پر اصرار کیا۔ ٹیکس دفتر کے لوگوں نے اپنی اپنی راہ لی چنانچہ سکول کی استانی اور میں نے ہی اکٹھے سفر کیا۔ ہم پل عبور کر رہے تھے۔ سایوں بھرے اس منظر میں چاندی جیسی ندی پھیلی ہوئی تھی اور اس کا آخری سرا، دور دھند میں گم ہو رہا تھا۔

"رات کے وقت یہ واقعی بہت خوبصورت جگہ ہے۔" مس حاہ کہنے لگی۔

"واقعی؟ یہ کوئی جگہ ہے۔"

"مجھے اندازہ ہے کہ آپ نے "یہ کوئی جگہ ہے" کیوں کہا ہے۔" اس نے کہا۔

"آپ نے کیسا اندازہ لگایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں کہ یہ واقعتاً ایک بھدی جگہ ہے کیا ایسا نہیں ہے؟ کیا میں صحیح نہیں کہہ رہی؟"

"شاید۔"

ہم پل کے آخری سرے تک آ گئے۔ وہاں ہمیں علیحدہ ہونا تھا۔ اسے ندی کے ساتھ والی سڑک پر رکنا اور مجھے اسی سڑک پر آگے جانا تھا۔

"تو تمھیں اسی راستے پر جانا ہے؟ پھر......" میں نے کہا۔

"کیا تم کچھ آگے تک میرا ساتھ دو گے۔ گلی اتنی خاموش ہے کہ مجھے کچھ خوف محسوس ہو رہا ہے۔" اس نے ہلکی سی کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے پھر اس کے ساتھ چلنا شروع کر دیا، مجھے محسوس ہوا جیسے ہم اچانک ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہیں۔ پل کے سرے سے اگلے کنارے تک جب اس نے مجھے، ایک ایسی آواز میں جو واقعتاً خوف سے کانپتی محسوس ہو رہی تھی، ساتھ چلنے کو کہا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ ایک لیکچے سے میری زندگی میں داخل ہو گئی ہے۔ میرے سارے دوستوں کی طرح، ان دوستوں کی طرح جنھیں میں اب اپنے سے علاحدہ نہیں کر سکتا۔ جنھیں میں نے اور انھوں نے مجھے، بارہا تکلیف پہنچائی۔

"جب میں پہلی بار تم سے ملی۔ مجھے کیا کہنا چاہیے؟ کیا یہ کہ تمہارے گرد سیول کے انداز و اطوار کا ہالہ پھیلا ہوا ہے، تمھارے انداز و اطوار سیول والوں سے ملتے جلتے تھے؟ لیکن مجھے لگا کہ میں تمھیں پہلے بھی مل چکی ہوں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟" اس نے اچانک کہا۔

"ایک پاپ گیت۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔"

"تم پاپ گیت کیوں گاتی ہو۔ کیا موسیقی کے طالب علم، جہاں تک ہو سکے ان سے اجتناب نہیں

کرتے؟’’

‘‘اس لیے کہ یہ ہمیشہ پاپ گیتوں کی فرمائش کرتے ہیں۔’’ اس نے جواب دیا اور پھر ہلکی آواز میں ہنسی جیسے کہ اسے پریشانی ہوئی ہو۔

‘‘اگر میں یہ کہوں کہ اگر آپ کو واقعی پاپ گیت گانا پسند نہیں تھا تو آپ اس جگہ جانے سے بچ سکتی تھیں تو کیا یہ آپ کے معاملات میں مداخلت ہوگی؟’’ میں نے کہا۔

‘‘مجھے معلوم ہے میں وہاں نہیں جاؤں گی وہ سارے فضول قسم کے لوگ ہیں۔’’

‘‘تو پھر پہلے آپ وہاں کیوں گئیں؟’’

‘‘کیوں کہ میں بہت بور ہو چکی تھی۔’’ اس نے پریشان ہو کر جواب دیا۔

‘‘بوریت۔’’ بالکل صحیح یہ بالکل صحیح۔’’ پارک کہتا تھا کہ وہ وہاں سے اس لیے چلا آیا کہ اس کے لیے آپ کو اپنے گیت گاتے ہوئے دیکھنا بہت قابلِ افسوس تھا۔’’

اندھیرے میں، میں نے اس کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی۔

‘‘پارک واقعی بہت جھگڑالو ہے۔’’ وہ اونچی آواز میں ہنسی، جیسے وہ خوش ہوئی ہو۔

‘‘وہ ایک اچھا آدمی ہے۔’’ میں نے کہا۔

‘‘ہاں کچھ ضرورت سے زیادہ۔’’

‘‘مس حاہ کیا آپ کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی محبت میں گرفتار ہو۔’’

‘‘اوہ براہ مہربانی مجھے مس حاہ مت کہیں۔ اگر آپ میرے بھائی بھی ہوتے تو بڑے بھائی ہوتے۔’’

‘‘پھر میں آپ کو کیسے پکاروں؟’’

‘‘مجھے صرف میرے پہلے نام، ان سُک، سے پکاریں۔’’

‘‘ان سُک۔ ان سُک۔’’ میں مدہم آواز میں بڑبڑایا۔ ‘‘ہاں یہ بہتر ہے۔’’ میں نے کہا۔

‘‘آپ میرا سوال کیوں گول کر گئیں؟’’

‘‘کونسا سوال؟’’ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم چاول کے کھیت کے پاس سے گزر رہے تھے۔ موسم گرما کی ایک رات جب میں نزدیک و دور کے چاول کے کھیتوں سے آنے والی مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں سن رہا تھا، ایسی آوازیں جیسے ہزاروں سخت خولوں کو آپس میں رگڑا جا رہا ہو، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری حسیات میں یہ آوازیں، ان گنت ستاروں کے ٹمٹمانے میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ میری حسیات میں ایک سمعی آواز کے ایک بصری شبیہہ میں تبدیل ہونے کا عجیب عمل وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ پھر اس وقت میرے احساسات گڈمڈ کیوں ہو رہے تھے جب میں نے مینڈکوں

کےٹرانے کی آواز کو ستاروں کی ٹمٹماہٹ میں تبدیل ہوتا محسوس کیا تھا۔ لیکن اُس وقت ایسا نہیں تھا کہ جب میں نے مینڈکوں کےٹرانے کی آواز سنی تو اسی وقت میں نے دمکتے ستاروں کو بھی آسمان سے تقریباً پھوار کی طرح نیچے آتے دیکھا ہو۔ جب میں نے ستاروں پر نظر ڈالی تو میں نے واضح طور پر اپنے اور ایک ستارے، اور اُس ستارے اور ایک دوسرے ستارے کے درمیان ڈرا دینے والے فاصلے کو دیکھا۔ ایسے جیسے میری آنکھوں کی نظر زیادہ سے زیادہ بڑھتی جارہی ہو۔ اس نا قابل گذرراستے پر نظر ڈالنے سے سحر زدہ ہو کر میں بالکل مبہوت کھڑا یہ محسوس کررہا تھا کہ اندر ہی اندر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا ہے۔ اس وقت برداشت کرنا اتنا مشکل کیوں تھا؟

گزرتے وقتوں میں اندھیرے آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں پر نظر جمانا مجھے اتنا مشکل اور نا قابل برداشت کیوں لگتا تھا؟

”آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“ خاتون نے مجھ سے پوچھا۔

”مینڈکوں کاٹرانا“ یہ کہتے ہوئے میں نے اوپر آسمان پر نظر ڈالی، جو دھند چھا جانے کی وجہ سے چھپ گیا تھااور ستارے مدہم ہوتے جارہے تھے۔

”ہاں، ہاں۔ مینڈکوں کاٹرانا۔ میں نے یہ پہلے نہیں سنا۔ میرا خیال تھا کہ موجین میں مینڈک آدھی رارت کے بعدٹراتے ہیں۔“

”آدھی رات کے بعد؟“

”ہاں۔ آدھی رات کے بعد مالک مکان اپنا ریڈیو بند کرتا ہے، تب مجھے مینڈکوں کےٹرانے کی آواز آتی ہے۔“

”آپ اتنی دیر تک کیوں جاگتی رہتی ہیں؟“

”بعض اوقات بس نیند بالکل آتی ہی نہیں۔“

نیند بالکل نہیں آتی، یہ بات شاید صحیح ہے۔

”کیا آپ کی بیوی خوبصورت ہے؟“ اس نے اچانک پوچھا۔

”ہاں وہ خوبصورت ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ خوش ہیں، کیوں یہ صحیح نہیں؟ آپ امیر ہیں، آپ کی بیوی خوبصورت ہےاور آپ کے بچے پوجنے کے قابل ہیں......“

”ابھی میرے بچے نہیں ہیں، سو میں سوچتا ہوں کہ میں ذرا سا، کسی حد تک، کم خوش ہوں۔“

”واقعی؟ آپ کے کوئی بچے نہیں ہیں۔ آپ کی شادی ہوئے، کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟“

”بس تین سال سے کچھ زیادہ۔“

”آپ تنہا سفر کیوں کررہے ہیں جب کہ آپ کسی خاص کام سے بھی نہیں آئے؟“

یہ مجھ سے ایسے سوال کیوں پوچھ رہی ہے؟

میں نے سوچا اور خاموش ہنسی ہنسا۔ اس نے اب پہلے سے زیادہ چہکتی آواز میں پوچھا۔

”آج کے بعد میں آپ کو اپنا بڑا بھائی سمجھوں گی۔ کیا آپ مجھے سیول لے چلیں گے؟“

”اوہ کیا آپ سیول جانا چاہتی ہیں؟“

”ہاں!“

”آپ کو موجین پسند نہیں ہے؟“

”میرا خیال ہے اسی لمحے میں یہاں پاگل ہو جاؤں گی۔ سیول میں میرے بہت دوست ہیں ....اوہ خدایا! میں سیول جانے کے لیے مر رہی ہوں۔“ اس نے میرا بازو سختی سے جکڑ لیا۔ مگر پھر فوراً ہی چھوڑ دیا۔

میں نے اچانک خود کو بہت پر جوش محسوس کیا۔

میں غصے میں آیا، غصے میں آیا اور پھر غصے میں آیا اور میرا وہ جوش وجذبہ غائب ہو گیا۔

”لیکن اب تم جہاں بھی جاؤ۔ وہ تمہارے کالج کے دنوں سے مختلف ہو گا اور چوں کہ تم ایک خاتون ہو۔ اس لیے تم جہاں بھی جاؤ تمہیں یہی محسوس ہو گا کہ تم پاگل ہو رہی ہو جب تک تم ایک خاندان میں گم نہ ہو جاؤ۔“

”میں نے اس کے بارے میں بھی سوچا لیکن اس وقت میں محسوس کرتی ہوں کہ اگر میرا خاندان ہوتا تب بھی میں پاگل ہو جاتی اور اگر یہاں کوئی ایسا شخص بھی ہوتا جس سے مجھے محبت ہوتی تب بھی میں یہاں رہنا نہیں چاہتی اور میں اس شخص سے یہ جگہ چھوڑ دینے کی استدعا دیتی۔“

”لیکن میرے تجربے کے مطابق، سیول میں رہنا ہمیشہ بہترین ثابت نہیں ہوتا۔ وہاں ذمہ داریاں ہیں، صرف ذمہ داریاں۔“

”لیکن یہاں نہ تو ذمہ داریاں ہیں، نہ غیر ذمہ داریاں۔ بہر حال میں سیول جانا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے ساتھ لے جاؤ گے؟“

”چلو اس کے بارے میں سوچتے ہیں۔“

”تم مجھ سے وعدہ کرو گے، کیا نہیں کرو گے؟“

میں صرف مسکرایا۔ ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔

”تم کل کیا کر رہے ہو۔“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں غالباً صبح کے وقت اپنی ماں کی قبر پر جاؤں گا۔ اس کے بعد میرا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے میں سمندر پر چلا جاؤں۔ وہاں ایک گھر ہے جس میں، میں ٹھہرا کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے میں اسے دیکھنے چلا جاؤں۔“

''تم وہاں دوپہر کے وقت کیوں نہیں جاتے؟''

''لیکن کیوں؟''

''میں بھی جانا چاہتی ہوں۔'' کل ہفتہ ہے اور آدھی چھٹی ہے صرف آدھا دن ہے۔''

''چلو پھر ایسا ہی کرتے ہیں۔''

ہم نے ملنے کی جگہ اور وقت کا تعین کیا اور جدا ہو گئے۔

عجیب طرح کی مایوسی محسوس کرتے ہوئے، میں آہستہ آہستہ رات کی گلیاں گزرتے واپس اپنی چچی کے گھر پہنچ گیا۔ جب میں بستر میں گھسا تو سائرن بجا کر کرفیو کا اعلان ہوا۔ یہ ایک اچانک اور شوریلی آواز تھی جو بہت طویل تھی۔ تمام مسائل اور خیالات سائرن کی آواز تلے دب گئے اور پھر دنیا میں اس آواز کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

یہاں تک کہ اس آواز کے بارے میں بھی محسوس ہوتا تھا کہ اتنی طویل مدت تک ہی جاری رہے گی کہ اس کے ہونے کا احساس ہی ختم ہو جائے گا۔ عین اس وقت وہ آواز اچانک اپنی قوت کے خاتمے کے ساتھ رک گئی اور ایک لمبی آہ کے ساتھ مدہم ہوتے ہوتے گم ہو گئی۔ صرف میرے اندر موجود سوچیں ایک بار پھر زندہ ہو گئیں۔ میں نے اس گفتگو کے بارے میں سوچا جو میں نے اس خاتون کے ساتھ صرف کچھ دیر پہلے ہی کی تھی۔ اگرچہ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ ہم نے بہت سے موضوعات پر گفتگو کی تھی۔ میرے کانوں میں صرف چند الفاظ ہی باقی رہ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد جب یہ الفاظ میرے کانوں سے میرے دماغ اور میرے دماغ سے میرے دل تک پہنچیں گے تو ان میں سے کتنے غائب ہو چکے ہوں گے؟ نہیں، آخر کار یہ سارے کے سارے سرے سے غائب ہو سکتے ہیں۔ چلو آہستہ آہستہ سوچتے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ سیول جانا چاہتی ہے۔ اس نے مایوس آواز میں کہا تھا۔ میں نے اچانک اسے اپنی باہوں میں جکڑ لینے کی خواہش محسوس کی اور پھر...... نہیں ..... صرف یہی بات میرے دل میں رہ جائے گی۔ لیکن جب میں موجین سے چلا جاؤں گا تو یہ بات بھی دل سے بالکل مٹ جائے گی۔ میں سو نہ سکا۔ یہ دوپہر کے قیلولے کی وجہ سے بھی تھا۔ تاریکی میں میں نے دیوار سے لٹکے ہوئے سفید لباسوں کو جو ناخوش و ناراض بھوتوں کی طرح مجھ پر حقارت کی نظر ڈال رہے تھے، تختی سے گھورتے ہوئے ایک سگریٹ سلگایا۔ میں نے سگریٹ کی راکھ سر سے اوپر کی طرف کسی ایسی جگہ جھاڑی جہاں سے صبح اسے آسانی سے صاف کیا جا سکتا تھا۔ ان مینڈکوں کی آواز جو صرف آدھی رات کے بعد ٹراتے تھے، کہیں سے بہت مدہم مدہم آ رہی تھی۔ کہیں سے کسی گھڑیال کے ایک بجانے کی آواز آئی۔ کہیں سے کسی گھڑیال نے ۲ بج جانے کا اعلان کیا۔ کہیں سے کسی گھڑیال نے تین بجا دیے، کہیں سے ایک گھڑیال نے چار بجا دیے۔ کچھ دیر بعد کرفیو ختم ہونے کا سائرن بجا۔ گھڑیال اور سائرن، ان میں سے کوئی ایک صحیح وقت پر نہیں تھا۔ سائرن کی آواز اچانک شوریلی اور دیر تک جاری رہنے والی تھی۔ تمام الجھنیں اور خیالات سائرن کی آواز

میں جذب ہو گئے۔ آخر میں دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اس دنیا میں صرف سائرن ہی باقی رہ گیا تھا۔ وہ آواز بھی لگتا تھا کہ صرف اتنی دیر تک ہی جاری رہے گی کہ اس کے ہونے کا احساس جاتا رہے۔ عین اسی وقت آواز اپنی قوت ختم ہو جانے پر رک گئی اور ایک لمبی آہ کے ساتھ مدہم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ کہیں خاوند اور بیویاں شاید ہم بستری کر رہے ہوں گے۔ نہیں خاوند اور بیویاں نہیں بلکہ طوائفیں اور ان کے گاہک۔ مجھے معلوم نہیں کہ مجھے یکدم ایسا مضحکہ خیز خیال کیوں آیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں گہری نیند میں کھو چکا تھا۔

(۳)

دریا کے سمندر تک پھیلے ہوئے طویل کنارے

صبح ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ناشتے سے پہلے میں نے ایک چھتری لی اور گاؤں کے پاس اپنی والدہ کی قبر پر گیا۔ اپنی پتلون کے پائنچوں کو اپنے گھٹنوں تک تہہ کرتے ہوئے میں نے بارش میں گھٹنوں کے بل بار بار بہت جھک کر قبر کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ بارش نے مجھے ایک انتہائی مثالی طور پر عقیدت مند بیٹا بنا دیا تھا۔ ایک ہاتھ سے میں نے قبر پر اگے لمبی گھاس کو اکھاڑا۔ گھاس کو اکھاڑتے ہوئے میں نے اپنے سسر کے بارے میں سوچا جو اس وقت میری ترقی کے سلسلے میں مختلف اہم شخصیات سے۔ منیجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنی جاندار رفلسی کے ساتھ مل رہا ہو گا۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے میں رینگ کر قبر میں داخل ہو رہا ہوں۔

واپسی پر میں نے گھاس والے کنارے کے ساتھ والی سڑک پر جانے کا فیصلہ کیا گو وہ راستہ گھوم کر جاتا تھا۔

تیز ہوا نے بارش کو پھوار میں تبدیل کر دیا تھا اور سارا منظر بارش میں رقص کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے چھتری بند کر دی۔ کنارے کے ساتھ چلتے ہوئے، میں نے دریا کے ساتھ کنارے کی ڈھلوان کے نیچے گھاس پر دور دراز کے کھیتوں سے گاؤں کے اسکول کی طرف جاتے ہوئے بچوں کا ہجوم دیکھا۔ اس ہجوم میں کچھ بڑی عمر کے لوگ بھی تھے اور برساتی پہنے ایک پولیس والا ڈھلوان پر لیٹا سگریٹ پیتے ہوئے کہیں دور دیکھ رہا تھا۔ ایک بڑھیا اپنی زبان چلاتے ہوئے کسی نہ کسی طرح اس ہجوم میں سے اپنا راستہ بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ میں ڈھلوان کے نیچے پہنچا، پولیس والے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کیا ہوا۔"

"کسی نے خودکشی کر لی۔" اس نے مکمل طور پر دلچسپی سے خالی آواز میں جواب دیا۔

"کون تھا۔"

"گاؤں کی کوئی بار میں کام کرنے والی تھی، ہر موسم گرما میں ان میں سے دو ایک خودکشی کر لیتی ہیں۔"

"یہ بڑی سخت جان تھی، سو میرا خیال تھا کہ شاید بچ جائے، لیکن وہ بھی تو آخر انسان ہے۔"

میں نیچے دریا تک گیا اور ہجوم میں شامل ہو گیا۔ لاش کا رخ دریا کی طرف تھا، سو میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ لیکن اس کے بال مستقل طور پر گھنگریالے تھے اور اس کے اعضا سفید اور پھولے ہوئے تھے۔ اس نے ایک تنگ سرخ جرسی اور سفید اسکرٹ پہن رکھی تھی۔ صبح سویرے سردی ہوئی ہوگی۔ یا شاید اسے وہ لباس پسند ہوا ہو۔

اس کا سر ربڑ کے جوتوں پر رکھا تھا جن پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور ایک سفید رومال، جو کسی چیز کے گرد لپٹا ہوا لگتا تھا کیوں کہ وہ ہوا سے اڑ نہیں رہا تھا، اس کے بے جان لٹکے ہوئے ہاتھ سے چند فٹ دور، بارش میں زمین پر پڑا تھا۔ اس عورت کا چہرہ دیکھنے کے لیے بہت سے بچوں کے پیر ندی میں تھے اور ان کا رخ راستے کی جانب تھا۔ ان کے سکول کے نیلے لباسوں کا عکس پانی میں الٹا نظر آ رہا تھا، جیسے لاش کے اردگرد سبز پرچم۔ عجیب طور پر میں نے اپنے اندر اس مردہ عورت کے لیے شدید جسمانی خواہش کو زور پکڑتے محسوس کیا۔ میں نے فوراً وہ جگہ چھوڑ دی۔ مجھے معلوم نہیں اس عورت نے کیا کھایا لیکن ہو سکتا ہے کوئی ایسی چیز جسے......”

میں نے پولیس والے سے کہا۔

اس طرح کی عورتیں عام طور پر سائنائڈ لیتی ہیں۔ وہ مٹھی بھر خواب آور گولیاں کھا کر کوئی تماشا پیدا نہیں کرنا چاہتیں۔ اس کے لیے بہر طور ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ مجھے موجین آتے ہوئے بس میں خواب آور گولی بنانے کا خواب یاد آیا۔ دھوپ کا معصوم چمکیلا پن، ہوا کی ٹھنڈک جو جلد کو لچک عطا کرتی ہے اور سمندر کی جانب سے آنے والی نمکین ہوا۔ اگر کوئی ان تین عناصر سے کوئی خواب آور دوا بنائے ......لیکن شاید وہ دوا پہلے سے موجود ہے۔ مجھے اچانک معلوم ہوا کہ گزشتہ رات اپنے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے نیند نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ میں اس کے آخری اوقات پر نظر رکھ سکوں۔ مجھے محسوس ہوا کہ کرفیو اٹھتے ہی سائرن کی آواز پہلے آئی ہوگی پھر اس عورت نے زہر کھایا ہوگا اور اس کے بعد ہی میں سو گیا ہوں گا۔ یک دم مجھے احساس ہوا کہ وہ عورت میرے جسم کا حصہ تھی۔ ایک حصہ جو تکلیف دہ تھا، جس کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ میں نے چھتری سے بارش جھاڑی اور اپنی چچی کے گھر واپس آ گیا۔

وہاں میرے انتظار میں مقامی ٹیکس آفس کے سربراہ چو کا ایک خط پڑا تھا۔

”اگر تمہارے کرنے کو کچھ نہیں ہے تو میرے پاس آ جاؤ۔“

میں ناشتے کے بعد ٹیکس آفس چلا گیا۔ اب بارش تو نہیں ہو رہی تھی مگر آسمان پر ابھی تک بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں چو کے ارادے کو بھانپ سکتا ہوں۔

وہ مجھے اپنے آفس میں براجمان ہونے کے منظر کا نظارہ کرانا چاہتا تھا۔ نہیں، شاید میں چیزوں کو توڑ مروڑ رہا تھا۔ میں نے اور طرح سے سوچنے کا فیصلہ کیا۔ کیا وہ اپنے کام سے مطمئن تھا؟ وہ شاید اس سے مطمئن تھا؟ چو ایک ایسا آدمی تھا جو پوری طرح موجین میں اپنی جگہ موجود تھا جو مکمل طور پر موجین میں براجمان تھا۔

پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے بارے میں مختلف زاویوں سے سوچوں گا۔ کسی کو اچھی طرح نہ

جانتے ہوئے، کسی کو اچھی طرح جاننے کی اداکاری کرنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔

ہم میں کسی پر نکتہ چینی کرنے یا کم از کم اس کے بارے میں فیصلے دینے کی خواہش کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اتفاق سے ہم اسے جانتے ہیں، جو بغیر بازو کی قمیص پہنے اپنی پتلون گھٹنوں تک تہہ کیے بیٹھا خود کو پنکھا جھل رہا تھا۔ وہ بھدا سا لگ رہا تھا اور جب اس نے ایسے اشارے اور انداز و اطوار اختیار کیے، جن سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ گھومنے والی کرسی میں ایستادہ ہونے پر بہت مغرور ہے تو مجھے اس پر بہت افسوس ہوا۔

”کیا آپ مصروف نہیں ہیں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”میرے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ جب آپ کسی ذمہ دار حیثیت میں ہوتے ہیں تو آپ کو کسی کام کی ساری ذمہ داری سنبھالنے کے بارے میں کچھ بڑبڑانا پڑتا ہے ......“

لیکن حقیقت میں چو اتنا بھی فارغ نہیں تھا جتنا ظاہر کر رہا تھا۔ بہت سے لوگ مختلف کاغذات پر اس کے دستخط لینے آئے اور ان سے کہیں زیادہ کاغذات کا ڈھیر اس بکس میں تھا، جنہیں دیکھنا بھی باقی تھا۔

”ہم آج کچھ مصروف ہیں کیوں کہ یہ مہینے کا اختتام ہے اور آج ہفتہ بھی ہے۔“ اس نے کہا۔ لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اتنا مصروف ہونے پر وہ فخر محسوس کر رہا ہے۔ اتنا مصروف کہ اس پر فخر کرنے کا وقت بھی نہ ہو۔ سیول میں میرے ساتھ ایسے ہی تھا۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کے لوگ واقعی زندگی گزارنے کے بارے میں مقابلتاً بہت کم ترقی یافتہ ہیں؟ یہاں تک کہ وہ مصروف نظر آنے میں بھی زیادہ بد صورتی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ کسی کے کسی بھی عمل میں کسی بھی طرح کی بدصورتی خواہ وہ ڈاکہ زنی ہی کیوں نہ ہو قابل افسوس ہوتی ہیں۔ ایک ایسی چیز جو لوگوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ چیزوں کو ترتیب اور ہمواری کے ساتھ مستعدی سے سرانجام دینے کی اہلیت سب سے بڑھ کر اعتماد اور بھروسے میں اضافہ کرتی ہے۔

”تم مس حاہ کو جانتے ہو۔ کل رات والی۔ کیا وہ مستقبل میں ممکنہ بیوی ہو سکتی ہے۔“ میں نے اس سے دریافت کیا۔

”تمہارے خیال میں اب میں اسی قابل رہ گیا ہوں؟“ اس نے کہا۔

”کیوں، اس میں کیا برائی ہے؟“

”دیکھو، میرے لڑکے، چوں کہ تم ایک امیر کبیر اور بااثر بیوہ سے شادی کی وجہ سے کھاتے پیتے بن گئے ہو۔ تمہارا مطلب ہے کہ میں خود کو ایک سوکھی سڑی موسیقی کی استاد سے، جس کا کچھ اتا پتا معلوم نہیں ہے شادی کر کے، مطمئن ہو جاؤں۔ اس نے زوردار قہقہہ لگایا، جیسے وہ بہت مطمئن ہو۔

”جب تم جتنی کمائی ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے خواہ عورت کوئی بھیک منگی ہی کیوں نہ ہوا۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ چوں کہ میرے اپنے رشتہ دار وغیرہ (اہم جگہوں پر) نہیں ہیں اس لیے میری بیوی کے جاننے والوں میں کچھ اہم اور بااثر شخصیات ضرور ہونی چاہئیں۔“ اس نے جواب دیا۔

جس انداز سے اس نے گفتگو کی، اس سے، ہم دونوں دوسازشی لگ رہے تھے۔

”ہم بڑی مضحکہ خیز دنیا میں رہتے ہیں۔ جب میں نے سول سروس کا امتحان پاس کیا تو شادیاں کرانے والوں کا ایک سیلاب آ گیا۔ تاہم وہ صرف ناگفتہ بہ قسم کی پیشکشیں ہی لاتے رہے۔ یہ سوچنا واقعی عورتوں کے لیے بڑا ہی غیر دانشمندانہ اور غیر مناسب ہوتا ہے کہ شوہر حاصل کرنے کے لیے ان کا صرف عورتیں ہونا ہی کافی ہے۔“

”کیا مس حاہ انہی عورتوں میں سے ایک ہے؟“ ”وہ ایک نمائندہ مثال ہے۔ جس طرح وہ میرا تعاقب کرتی ہے وہ ایک حقیقی مصیبت ہے۔“ ”مجھے تو وہ ایک ذہین عورت لگی تھی۔“

”وہ ٹھیک ہے، ذہین ہے لیکن میں نے اس کا خاندانی پس منظر دیکھا اور واقعی اس کا خاندان اتنا گیا گزرا ہے کہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ یہاں فوت ہو جائے تو کوئی ایک بھی ایسا مناسب آدمی، اس کے خاندان میں نہیں ہے جو یہاں آ کر اس کے معاملات دیکھ سکے۔“ مجھے اسے جلد دوبارہ دیکھنے کی خواہش محسوس ہوئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ اسی کسی جگہ پر مر رہی تھی۔ میں اسے جلد دوبارہ ملنا چاہتا تھا۔

”پارک جو ایسی باتیں نہیں جانتا۔ اس کی محبت میں گرفتار ہے۔“ چو نے غصے سے کہا۔

”پارک؟“ میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

”وہ اسے ملتجیانہ خطوط لکھتا ہے جو وہ مجھے دکھا دیتی ہے، جیسے پارک وہ محبت نامے مجھے ہی لکھتا ہو۔“

اُسے دیکھنے اور ملنے کی میری خواہش مکمل طور پر غائب ہو گئی۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد پھر تازہ ہو گئی۔

”پچھلی بار میں اسے ایک بدھ مندر لے گیا۔ میں اس سفر سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی امید رکھتا تھا مگر وہ بے حد تیز تھی۔ اس نے مجھے کہا کہ شادی سے پہلے وہ ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھے گی۔“

”پھر؟“

”اُلٹا میری بے عزتی ہو گئی، بس یہی ہوا۔“ میں اس نے (حاہ) کا (دل ہی دل میں) شکریہ ادا کیا۔

جب ہماری ملاقات کا وقت آیا، میں گاؤں سے کچھ دور، سمندر کی طرف پھیلے دریا کے کنارے پر چلا گیا جہاں سے دور ایک زرد چھتری دیکھی جا سکتی تھی۔ یہ وہی تھی۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ بادلوں میں گھرے آسماں تلے چل رہے تھے۔

”میں نے آج تمہارے بارے میں کچھ پوچھ گچھ کی ہے۔“

”کیا واقعی تم نے ایسا کیا ہے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے میں نے کس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دی؟“

میں بالکل اندازہ نہ لگا سکا۔ وہ عورت خود ہی خود کھلکھلا کر ہنسی۔ پھر کہنے لگی ”میں نے تمہارے خون کا گروپ ڈھونڈ لیا ہے“

''ہاں، تمہارا خون گروپ، میرا خون کی قسموں پر بڑا گہرا ایمان ہے۔ اگر لوگوں کی شخصیات خون کے زیرِ اثر ہوتیں جیسا کہ حیاتیات کی کتابوں میں ہوتا ہے تو پھر صرف چند ہی قسم کی مختلف شخصیات ہوتیں۔ کیا ایسا نہیں ہے؟''

''یہ ایمان نہیں ہے۔ یہ خواہش بھری سوچ ہے۔''

''میں ہمیشہ ان چیزوں پر یقین رکھتی ہوں، جن پر میں یقین رکھنا چاہتی ہوں۔''

''یہ کس قسم کے خون کا گروپ ہے؟''

''یہ وہ قسم ہے جسے احمق کہا جاتا ہے۔''

گرم دم گھٹنے والی ہوا میں ہم تکلیف دہ ہنسی ہنسے۔ میں نے اُس کی شخصیت پر نظر ڈالی۔ اُس نے ہنسنا بند کر دیا تھا اور اپنے سختی سے بند ہونٹوں کے ساتھ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے بالکل اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی ناک کی نوک پر پسینے کا ایک قطرہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ کسی بچے کی طرح میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یوں لگا کہ وہ ایک دم پریشان سی ہو گئی ہے۔ میں نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے دوبارہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس دفعہ لگا کہ وہ حیران نہیں ہوئی۔ ہمارے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کے بیچ سے کمزور سی ہوا چھن رہی تھی۔

''جب تم سیول پہنچو گی تو وہاں کیا کرو گی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ایک ایسے اچھے بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے، وہ میرا خیال رکھے گا، کیوں کیا خیال نہیں رکھے گا؟'' اس نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''بہت سے اہل مرد موجود ہیں لیکن ...... کیا تمہارے لیے گھر جانا بہتر نہیں ہے؟''

''میں اس جگہ کو گھر پر ترجیح دیتی ہوں۔''

''پھر قیام کیوں نہیں ......؟''

''تو پھر تم مجھے لے جانا نہیں چاہتے؟'' اس کا چہرہ بگڑ گیا اور اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

حقیقت میں مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کیا سوچ رہا تھا۔ میں حقیقت میں اُس عمر سے گزر چکا تھا جب دنیا کو صرف جذبات و احساسات کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اگرچہ میں نے جان بوجھ کر ایک امیر اور با اثر بیوہ کو شعوری طور پر تلاش نہ کیا ہو، جیسا کہ کچھ گھنٹے پہلے چو نے بیان کیا تھا، مگر آخر میں، میں نے حقیقت میں اسے ایک اچھی بات ہی سمجھا تھا۔

میں نے اپنی بیوی کے لیے ایک مختلف قسم کی محبت محسوس کی تھی۔ اس محبت سے مختلف جو میں نے اس عورت کے لیے محسوس کی تھی، جو مجھے چھوڑ گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود، ان کناروں پر، جو سمندر تک پھیلے ہوئے تھے، بادلوں میں گھرے آسمان تلے چلتے ہوئے، میں نے اس کا ہاتھ ایک بار پھر تھام لیا۔ میں نے اسے

اس گھر کے بارے میں بتایا جس میں ہم جا رہے تھے۔ ایک سال اپنے پھیپھڑوں کی گندگی صاف کرنے کے لیے میں نے اس گھر میں ایک کمرہ لیا تھا۔

یہ میری والدہ کی وفات کے بعد کی بات ہے اس سال (جو میں نے یہاں سمندر کے کنارے گزارا تھا) میرے ارسال کیے جانے والے خطوط میں لفظ ''اُداس'' تلاش کرنا بڑا آسان ہے۔ اگرچہ یہ اب ایک گھٹا ٹوپ لفظ بن چکا ہے۔ ایک مردہ لفظ جو لوگوں کے سینوں میں کسی طرح کے احساسات جگانے کی اہلیت نہیں رکھتا، میرے لیے ان دنوں صرف یہی ایک لفظ تھا جس کے بارے میں مجھے محسوس ہوتا تھا، کہ میں استعمال کر سکتا ہوں۔ صبح کے وقت ساحل پر اوپر سے نیچے چلتے ہوئے، وقت کے بوجھل پن کا احساس، دوپہر کے قیلولے کے بعد اوپر کی طرف چلتے ہوئے اپنے ابروؤں سے ٹپکتے ہوئے ٹھنڈے پسینے کو صاف کرتے ہوئے خالی پن کا احساس، بے صبری و بے قراری جس سے میں سمندر کے قابل رحم بین سننے کا انتظار کرتا، اپنے ہاتھوں اپنے دل کو دباتے ہوئے جو کسی ڈراؤنے خواب سے جاگ کر زور زور سے دھڑکتا۔ ایک لفظ ''اداس'' سے میں نے اس وقت ایسی زندگی کو بیان کیا جس کے ساتھ یہ چیزیں سیپیوں کے خولوں کی طرح چپک گئی تھیں۔ جب میں اب اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو صرف ایک خالی خولی لفظ استعمال کرتا ہوں۔ ایک ایسے شہر میں رہتے ہوئے جہاں سمندر کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک آدمی کسی تاثر سے عاری ڈاکیے سے وصول کیے ہوئے خط میں لفظ ''اُداس'' پڑھ کر کیا محسوس کر سکتا ہے؟ یہاں تک کہ اگر میں بذات خود خط کو ساحل سمندر سے بھیجتا اور پھر شہر میں خود ہی وصول کرتا تو کیا میں اس ایک لفظ میں موجود تمام تر احساسات کو جواب اتنی وافر ہمدردی کے ساتھ دے سکتا؟ بالکل سچی اور صحیح بات یہ ہے، میرا خیال ہے کہ غیر واضح طور پر میرے قیاسات اور سوالات تب بھی ہوتے، جب میں اپنے میز کی جانب ایسے خطوط لکھنے کے لیے بڑھتا اور میرا جواب میرا خیال ہے 'نہیں' ہوتا۔ اس کے باوجود میں نے ایسے خطوط لکھے، جن میں لفظ ''اُداس'' لکھا تھا اور انہیں تمام سمتوں میں نیلے سمندر کی بھدی تصویروں والے پوسٹ کارڈوں کے ذریعے بھیجتا۔

''تمہارے خیال میں وہ کس قسم کا شخص ہوگا جس نے اس دنیا کا پہلا خط لکھا ہوگا'' میں نے پوچھا۔

''اوہ خطوط! دنیا میں خط وصول کرنے سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ میں حیرت سے سوچتی ہوں وہ کون شخص ہوگا؟ وہ یقیناً تمہاری طرح کوئی تنہا شخص ہوگا۔'' اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں داخل ہو گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کے ہاتھوں نے یہ الفاظ ادا کیے ہوں۔

''اور تمہاری طرح بھی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔''

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔

ہم اس گھر میں پہنچ گئے جسے ڈھونڈ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا وقت اس گھر اور اس کے مکینوں کے پاس

سے گزر گیا ہو

،بغیر کوئی نشان چھوڑے...... مالک مکان نے میرے ساتھ پرانے وقتوں کی طرح ہی سلوک کیا اور میں پھر اپنے پرانے وقت میں چلا آیا۔ میں نے اس پرانے جوڑے کو وہ تحائف پیش کیے جو ساتھ لایا تھا اور انھوں نے مجھے میرا پرانا کمرہ دے دیا۔

اُس کمرے میں، میں نے اُس سے، اُس کی بے صبری چھین لی۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ کسی حملہ آور سے جو تیزی سے آپ کی طرف آ رہا تھا، اس کا چاقو چھین لیں، جیسے کسی شخص سے اس کا چاقو چھین لیں جو اگر اس سے نہ لیا جائے تو وہ شدید مایوس ہو کے کسی کو مار دے۔ میں نے اس سے اس کی بے صبری لے لی۔ وہ بچھرے ہوئے سمندر پر تھی۔ ہم وہاں خاموشی میں بہت دیر تک بیٹھے رہے۔

"میں سیول جانا چاہتی ہوں۔ مجھے صرف یہی خواہش ہے۔" اس نے طویل خاموشی کے بعد کہا۔ اپنی انگلیوں سے، میں اس کے رخساروں پر بے معنی نقوش بنا رہا تھا۔

"کیا تمہارا خیال ہے کہ اس دنیا میں واقعی کوئی اچھا شخص ہو سکتا ہے؟" میں نے سگریٹ کو، جو سمندر کی طرف سے چلنے والی ہوا سے بجھ چکا تھا، دوبارہ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ مجھے ملامت کر رہے ہیں؟ جب تک آپ ان کی اچھائی پر یقین نہ رکھتے ہوں میرا خیال نہیں کہ آپ کوئی اچھا آدمی پا سکیں"

میں نے سوچا ہم یقیناً بدھ مت کے ماننے والے ہیں۔

"کیا تم اچھی خاتون ہو؟"

"ان شک۔ جب تک تمہیں مجھ پر یقین ہے۔"

میں نے پھر سوچا یقیناً ہم بدھ مت کے پجاری ہیں۔ عورت میرے اور قریب ہو گئی۔

"آؤ نیچے سمندر پر چلیں۔ وہاں میں تمہارے لیے گاؤں گی۔" اُس نے کہا۔ مگر ہم وہاں سے ہلے نہیں۔

"آؤ نیچے سمندر پر چلیں۔ یہاں بہت گرمی ہے۔"

ہم اٹھ کر چل پڑے۔ ہم نے ریتلے ساحل کو عبور کیا اور ایک چٹان پر بیٹھ گئے جہاں سے کوئی گھر نظر نہیں آتا تھا۔ لہریں، اپنی باہوں میں احتیاط سے جھاگ کو چھپا کر لائیں، جسے انھوں نے ہمارے قدموں میں انڈیل دیا۔ اس نے مجھے بلایا۔ میں نے اپنا سر اس کی طرف گھمایا۔

"کیا کبھی تم نے خود سے نفرت کی؟" اس نے بڑی جاندار آواز میں پوچھا، جو لگتا تھا، زبردستی پیدا کی گئی ہے۔ میں نے اپنی یادوں کو تلاش کیا۔ اپنا سر ہلاتے ہوئے میں نے کہا۔

"ہاں۔ جب ایک دوست نے جو میرے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہتا تھا مجھے بتایا کہ میں خراٹے لیتا ہوں مجھے واقعتاً مزید زندہ رہنے کی خواہش نہ رہی۔" میں نے اسے ہنسانے کے لیے کہا۔ مگر وہ ہنسی نہیں

صرف خاموشی سے اپنا سر ہلاتی رہی۔ ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے کہا: ''میں حقیقت میں سیول نہیں جانا چاہتی۔ میں نے اسے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے کو کہا۔ اس کے ہاتھ کو سختی سے تھامتے ہوئے میں نے کہا۔

''خدا کے لیے ہم ایک دوسرے سے تو جھوٹ نہ بولیں۔''

''یہ جھوٹ نہیں ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں تمہارے لیے ''ایک کھلے دن میں'' گاؤں گی۔

''لیکن آج تو آسمان ابر آلود ہے۔''

میں نے آریا میں جدا ہونے کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ آؤ ابر آلود دنوں میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔ آؤ اپنے ہاتھ پھیلا کر رکھیں اور اگر کوئی آ کر انہیں تھام لیتا ہے تو آؤ اسے اپنے قریب کر لیں۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہے لیکن لفظ محبت کی ناموزونیت نے مجھے اس لفظ کو ادا کرنے سے روک دیا۔

جب ہم واپس گاؤں پہنچے تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے ساحل پر ایک دوسرے کو بوسہ دیا۔

''جب تک تم یہاں ہو میں نے شاندار طریقے سے تمہارے ساتھ لگے رہنا ہے۔ لہٰذا میں تمہیں خبردار کرتی ہوں۔'' جدا ہوتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔

''لیکن چوں کہ میں زیادہ مضبوط ہوں۔ سو آخر میں تم سیول تک کھنچتی چلی جاؤ گی۔'' میں نے کہا۔

جب میں گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ پارک آیا تھا اور اب جا چکا ہے۔ وہ کسی کتاب کی دو تین جلدیں چھوڑ گیا تھا کہ اگر میں موجین میں بور ہو گیا ہوں تو انہیں پڑھ لوں۔ میری چچی نے بتایا کہ وہ شام کو پھر آنے کا کہہ گیا ہے۔ تھکن کا بہانہ کرتے ہوئے میں نے اپنی چچی سے کہا کہ میں اس شام کو کسی سے نہیں مل سکتا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس سے بہانہ کریں گی کہ میں ابھی تک سمندر سے واپس ہی نہیں آیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی چیز مجھے پریشان کرے۔ کوئی بھی چیز نہیں۔

میں نے اپنی چچی سے باہر جا کر سوجو (شراب) خرید کر لانے کو کہا اور اس وقت تک پیتا رہا جب تک نشے میں دھت ہو کر سو نہ گیا۔ صبح سویرے میں اچانک جاگ گیا۔ بغیر کسی وجہ سے میرا دل خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔

''ان سک'' میں بڑبڑایا۔ پھر میں فوراً ہی دوبارہ گہری نیند میں ڈوب گیا۔

کیا تم موجین چھوڑ رہے ہو۔

میں اپنی چچی کے جھنجھوڑنے سے جاگا۔ صبح کافی گذر چکی تھی۔ چچی نے مجھے ایک تار تھما دیا۔

''۲۷ تاریخ کو تمہیں ایک کانفرنس میں شرکت کرنی ہے۔ براہِ مہربانی فوراً آ جاؤ، ینگ۔''

۲۷ تاریخ پرسوں پڑتی تھی اور ینگ میری بیوی کا نام ہے۔ میں نے اپنا دکھتا ہوا سر تکیے پر رکھ دیا۔

میں گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ میں نے اپنی سانس ہموار کرنے کی کوشش کی۔ میری بیوی کے ٹیلی گرام نے ان تمام سوچوں اور اعمال پر بالکل واضح روشنی ڈال دی جن میں میں موجین پہنچنے کے بعد مصروف رہا تھا۔ ہر چیز میری پہلے سے موجود سوچوں کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئی تھی۔ میری بیوی کے ٹیلی گرام میں یہی لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی تردید میں اپنے سر کو جھٹکے دیے۔ ہر چیز اس آزادی کی وجہ سے ہوئی تھی جو عام طور پر سیاحوں کو حاصل ہوتی ہے۔ میری بیوی کے ٹیلیگرام میں لکھا تھا۔ میں نے اس کی تردید میں اپنے سر کو جھٹکا۔

ہر چیز وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری یادداشت سے مٹ جائے گی۔ ٹیلی گرام میں لکھا تھا۔

لیکن میں نے اپنے سر کو جھٹکا، یہ کہتے ہوئے کہ اس کے زخم باقی رہ جائیں گے۔ ہم بہت دیر تک بحث مباحثہ کرتے رہے۔ آخر میں ٹیلی گرام اور میں ایک سمجھوتے پر پہنچ گئے۔ آؤ مثبت طریقے سے قبول کر لیں۔ صرف اس بار، اس بار اور ہمیشہ کے لیے، صرف اس بار کے لیے، اس موجین، اس دھند، تنہائی کے حصول کے لیے پاگل پن، پاپ گیت، ایک بار میں کام کرنے والی لڑکی کی خودکشی، بے وفائی، غیر ذمہ داری، آؤ ایک بار ساری چیزوں کو قبول کر لیں، آخری بار اور صرف ایک بار۔ اس کے بعد میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں کے محدود حصار میں زندگی بسر کروں گا۔ او ٹیلیگرام، آؤ اس معاہدے پر مہر ثبت کر دیں۔ میں اپنے وعدے پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہوں۔ ہم نے وعدہ کیا لیکن ٹیلی گرام کی طرف پیٹھ کر کے اس کی آنکھوں سے نظر بچا کر میں نے ایک خط لکھا۔

”مجھے اچانک سیول بلا لیا گیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ خود تمھیں آ کر مطلع کروں لیکن گفتگو ہمیشہ ہمیں غیر متوقع سمتوں میں لے جاتی ہے۔ چنانچہ میں تمھیں ملنے کی بجائے تمھیں خط لکھ رہا ہوں۔ میں مختصر بات کروں گا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ کیوں؟ کیوں کہ تم میری اپنی ذات ہو، کیوں کہ تم میری گزشتہ ذات کی ایک شبیہہ ہو جسے میں پیار کرتا ہوں اگر چہ یہ بڑا کمزور (پیار) ہے۔ اگر چہ میں نے اپنی گذشتہ ذات کو اپنی موجودہ ذات میں بدلنے کے لیے ہر طرح سے کوشش کی ہے، میں تمھیں روشنی اور سورج کی روشنی میں لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔ مجھ پر یقین رکھو۔ سیول میں تمام تیاریاں مکمل کر کے تم سے رابطہ کروں گا۔ برائے مہربانی اس وقت موجین چھوڑ کر مجھے سے سیول میں آ ملنا۔ میرا خیال ہے ہم خوش رہ سکتے ہیں۔“

میں نے یہ لکھا اور پھر اس سارے خط کو پڑھا۔ میں نے اسے پھر پڑھا۔ پھر اسے پھاڑ دیا۔ ایک جھٹکے کھاتی بس پر بیٹھے ہوئے، میں نے کوئی چیز سڑک کے ساتھ دیکھی یہ ایک سفید سائن بورڈ تھا۔ اس پر واضح کالے حروف میں لکھا تھا ”آپ موجین چھوڑ رہے ہیں۔ خدا حافظ“ مجھے شدید قسم کی شرمندگی کا احساس ہوا۔

☆☆☆☆

پی۔ بی شیلے

انگریزی سے ترجمہ: سید ضیاء الدین نعیم

نظم

اِمتدادِ وقت سے بجھ جائے جب کوئی چراغ
ضو بھی اس کی ہو کے رہ جاتی ہے پھر مٹی میں گم

باندھ لے رختِ سفر جب مطلعِ گردوں سے ابر
ماند پڑ جاتی ہے پھر خوش رنگیِ قوسِ قزح

ٹوٹنے کے حادثے سے جب گزر جاتا ہے ساز
اُس کے میٹھے سُر بھی پھر رہتے ہیں اس دنیا کو یاد

اَن کہے الفاظ جب ہونٹوں سے ہوجائیں ادا
پیار سے معمور لہجے بھی بھلا دیتے ہیں لوگ

☆☆☆☆

منوج کمار پانڈے

ہندی سے ترجمہ: **خالد فرہاد دھاریوال**

خزانہ

تاریخ جغرافیہ اور روایتیں

ہم پنڈت رام ابھیلاش کی اولاد تھے۔ جن کے بارے میں گاؤں کے بوڑھے نہ جانے کتنے قصے اپنے اندر چھپائے بیٹھے تھے۔ وہ ہمارے علاقے کی لگ بھگ اساطیری شخصیت تھے۔ ہم اس احساس تفاخر سے بھرے پڑے تھے کہ ہم رام ابھیلاش کی اولاد ہیں۔ لیکن کئی بار دوسروں کے ہاں ان سے متعلق قصے کچھ زیادہ ہی ملتے اور اس طرح ہمیں خود اپنے بارے میں نئی نئی باتیں معلوم ہوتی رہتیں۔

ہم یہاں کے قدیم باشندے نہیں تھے۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے ایک بچے کو اپنے ساتھ لیے رام ابھیلاش یہاں وارد ہوئے تھے۔ وہ 1857 کی جنگ میں شامل تھے۔ اور اب جب کہ باغی ہار گئے تھے اور جگہ جگہ پیڑوں پر لٹکائے جا رہے تھے وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ بھاگ نکلے تھے۔ ان کے خاندان کے بھی لوگ پیڑوں پر لٹکا دیے گئے تھے۔ اب وہاں ان کا کچھ بھی نہیں بچا تھا، واپسی کا کوئی امکان بھی۔

ابھیلاش پور، جہاں ہم آج رہتے ہیں وہاں آمد سے قبل وہ کہاں کہاں بھٹکتے پھرے اس بارے میں کسی کو کچھ بھی نہیں معلوم۔ اس بارے میں خود انہوں نے بھی کبھی کسی کو کچھ بھی نہیں بتایا۔ لیکن 1857 کے دس سال بعد جب وہ یہاں پہنچے تو ایک تیرہ چودہ سال کا بچہ اور ایک کتا ان کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا کی بجائے گرو چیلا کی طرح کا برتاؤ کر رہے تھے۔ اس بچے نے کبھی اکیلے میں بھی انہیں باپ نہیں کہا بلکہ گرو جی ہی کہتا رہا۔ یہ اتنا لمبا چلا کہ رسم ہی چل نکلی۔ تب سے ہمارے خاندان میں باپ کو گرو اور بیٹے بیٹی کو لگاتار چیلا چیلی کہا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ یہ روایت آج بھی کئی گھروں میں بچی ہوئی ہے۔

ہم رام ابھیلاش کی آٹھویں پیڑھی سے ہیں۔

جب وہ یہاں آئے تو انہوں نے یہاں کے زمیندار لوچن تیواری سے اپنے رہنے کے لیے تھوڑی سی زمین مانگی۔ انہوں نے لوچن سے کہا تھا کہ جو زمین ان کے کسی کام کی نہ ہو وہی انہیں دان میں دے دی جائے۔ اور نہ جانے کس غیبی اشارے سے لوچن کی نگاہیں آپ ہی اس ٹیلے کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ لوچن نے انہیں گاؤں کی مغربی سمت کا سینکڑوں سالوں سے خالی پڑا ہوا ٹیلا دے دیا۔ پورا کا پورا۔ یہ اونچا نیچا ٹیلا کئی بیگھے زمین پر پھیلا ہوا تھا۔ اس پر نیم اور ببول کے چند پیڑوں کے علاوہ ناگ پھنیوں اور دوب کا ایک پورا جنگل

پھیلا ہوا تھا۔

کہتے ہیں کہ یہاں کبھی کسی چھوٹے موٹے راجا کا محل ہوتا تھا جو ستاون کے لگ بھگ ایک صدی پہلے کے کسی اور ستاون کی لڑائی میں نیست و نابود کر دیا گیا تھا۔ راجا اور اس کے خاندان کے لوگ مار دیے گئے تھے۔ نوکر چاکر کارندے سب قتل کر دیے گئے تھے۔ شاید ہی کوئی بچا ہو۔ کہتے ہیں کہ کوئی ایک کنواں تھا جو لاشوں سے پاٹ دیا گیا تھا۔ اور لوٹ مار کے بعد قلعے میں آگ لگا دی گئی تھی۔ منہدم کر دیا گیا تھا اسے۔

اس کے پیچھے کوئی گہری بات نہ ہو کہ ایک معمولی سی غیرت کی لڑائی تھی جو دھیرے دھیرے ایک بھیانک اور ناقابلِ برداشت نفرت میں بدل گئی تھی۔ ان کے پاس اس کے برعکس کوئی اور چارہ نہیں بچا تھا کہ وہ انہیں مار کاٹ ڈالیں جن سے کہ وہ نفرت کرتے تھے۔

کہتے ہیں کہ یہ حملہ رات کے تیسرے پہر میں کیا گیا تھا۔ مشعلوں کی روشنی میں چمکتی ہوئی تلواروں اور خنجروں نے نہ جانے کتنے جسموں سے ان کا شعور چھین لیا تھا۔ اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گہری نیند سلا دیا تھا۔ حملہ آوروں نے اپنے چہرے پر کالے کپڑے باندھ رکھے تھے۔ لیکن آنکھیں تو سب کی کھلی تھیں جن میں ایک قاتل نفرت تیر رہی تھی۔ اس کے باوجود مرنے والوں نے مارنے والوں کو پہچان لیا تھا اور حیرت سے ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

لیکن یہ پوری طرح سچ نہیں ہے۔ زیادہ تر مرنے والوں کو تو اپنی موت کا پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ سوتے میں ہی ان کا گلا کاٹ دیا گیا تھا۔ اس لیے کیا پتہ کہ وہ آج تک خود کو سوتا ہوا ہی مان رہے ہوں اور اپنے جاگ اُٹھنے کا انتظار کر رہے ہوں۔ انہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہو کہ اچانک ان کی رات اتنی لمبی اور کالی کیسے ہو گئی ہے! اور اس بیچ انہیں اتنے خون آلودہ خواب کیوں آ رہے ہیں۔ کیا پتہ کہ بہتوں نے خواب میں ہی دم توڑ دیا ہو اور ابھی تک یہ مانے بیٹھے ہوں کہ نیند کھلتے ہی ان کا سپنا ٹوٹ جائے گا اور وہ پھر سے جی اٹھیں گے۔

لیکن یہ سب تو سینکڑوں سال پرانی باتیں ہیں۔ لگ بھگ ڈھائی سو سال پہلے کی باتیں۔ اب تک تو وہ مسلسل سوتے رہنے سے بھی انتہائی تھک گئے ہوں گے اور ان کی آنکھیں بھی دُکھنے لگی ہوں گی۔ اسی لیے دوسرا جنم بہت ضروری چیز ہے۔

کہتے ہیں کہ لاشوں کے سڑنے کی بدبو وہاں اگلے سو سالوں تک پھیلی رہی۔ لوگوں کے لیے اس کے آس پاس سے گزرنا بھی مشکل بنا رہا۔ یہ تبھی دُور ہوئی جب رام ابھیلاش وہاں آن بسے۔

رام ابھیلاش نے تنہا کنواں کھودا۔ اکیلے ہی اینٹیں پاتھیں اور خود ہی اپنا ایک چھوٹا سا گھر کھڑا کیا۔ جو دُور سے ہی دکھائی دیتا۔ لوگ حیرانی سے بھر جاتے کہ کوئی اکیلا آدمی یہ سب کیسے کر سکتا ہے۔ لیکن یہ سب سوچتے ہوئے وہ پتہ نہیں کیوں اس پندرہ سالہ لڑکے کو بھول ہی جاتے جو ان سب کاموں میں رام ابھیلاش کا برابر کا حصہ دار تھا۔ دونوں نے مل کر اگلے چار پانچ سالوں میں اس ٹیلے کو اتنا خوبصورت بنا دیا کہ یہ لوگوں کے

لیے اچنبھا پیدا کرنے والی بات رہی۔ اور یہیں سے تمام اس طرح کی کتھائیں جنمیں کہ پنڈت رام ابھیلاش نے ٹیلے پر موجود بھوتوں کو قابو کر لیا ہے اور یہ انہیں کی محنت کا پھل ہے۔

بھوتوں کی بات تو رام ابھیلاش جانیں لیکن یہ ان کی دانشمندی ہی تھی جس نے یہ کر دکھایا تھا۔ انہوں نے اسی کھنڈر میں دبی سینکڑوں سال پرانی اینٹیں کھود نکالی تھیں اور مٹی کے گارے سے ایک پر ایک جماتے گئے تھے۔ اینٹیں باہر آ کر خوش ہو گئی تھیں اور انہوں نے رام ابھیلاش کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اینٹوں نے ہی انہیں ایک کنوئیں کا بھی راستہ دکھایا تھا جس میں سے کم از کم سو سالوں سے پانی نہیں نکالا گیا تھا۔ ان سو سالوں کا بچا ہوا پانی رام ابھیلاش باپ بیٹے نے اگلے تین چار سالوں میں ہی خرچ کر ڈالا تھا۔ نتیجے میں یہ ٹیلا ایک ہرے بھرے مہکتے ہوئے باغ میں بدل گیا تھا۔

یہ سب اتنا دھیرے دھیرے اور آہستگی سے ہوا کہ اس طرف لوگوں کا دھیان ہی نہیں گیا اور جب گیا تو وہ ششدر رہ گئے۔ لوچن تیواری تک بھی یہ خبر پہنچی اور وہ ایک سہج تجسس کے ساتھ ٹیلے پر پہنچ ہی گئے۔ اوپر لڑکے، پیڑوں اور طرح طرح کے پھولوں سے آتی ہوئی خوشبو نے ان کا سواگت کیا۔

شاید اس میں ماحول کی کشش کا بھی اثر رہا ہو جب انہوں نے رام ابھیلاش کے خوش رو بیٹے کو دیکھا۔ جسے ان چار پانچ سالوں میں انہوں نے نہ جانے کتنی بار دیکھا ہوگا۔ لیکن آج کے دیکھنے میں کچھ خاص تھا۔ یہ لڑکا جس کا نام رام اقبال تھا اب لگ بھگ بیس سال کا ہو رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر داڑھی مونچھ آئے ابھی تھوڑا ہی سے بیتا تھا۔ اچانک لوچن تیواری کے من میں ایک خیال ابھرا اور کسی ارادے کی طرح اندر بیٹھ گیا۔

انہوں نے اسی دن رام ابھیلاش کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی ان کے بیٹے سے کرنا چاہتے ہیں۔ جسے رام ابھیلاش نے بنا کسی ردِعمل کے 'بھگوان کی مرضی' کہہ کر قبول کر لیا۔ اور بدلے میں بہو کے ساتھ پچاس بیگھے زمین اور ٹیلے پر رہائش کے حقدار ٹھہرے۔

یہ سب بہت پرانی باتیں ہیں۔

اب تو رام ابھیلاش کا گھر رام ابھیلاش کی نسل کے وسیلے سے ابھیلاش پور میں بدل گیا ہے۔ جس میں قریب پینتیس گھر ہمارے ہی پٹی داروں کے ہیں۔ باقی پندرہ بیس گھر ان جاتیوں کے ہیں جنھیں ہم نے اپنے کام کے لیے وقتاً فوقتاً یہاں لا بسایا۔ اس طرح سے ایک باپ بیٹا یا گرو چیلا سے شروع ہوا یہ سلسلہ آج ایک پورے گاؤں میں بدل گیا ہے۔

بیچ میں بہت سارے قصے بنے بگڑے۔ بہتیرے لوگوں کا جیسے ماننا تھا کہ رام اقبال رام ابھیلاش کے بیٹے نہیں تھے۔ رام ابھیلاش کا بیٹا تو غدر کے بعد کی دس سالا بدحالی کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ یہ تو کوئی یتیم لڑکا تھا جس کے عزیز ستاون میں مارے گئے تھے اور جو اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے چھپتے بھاگتے رام ابھیلاش سے جا ٹکرایا تھا۔ کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے تھے کہ وہ مسلمان لڑکا تھا جسے رام ابھیلاش نے ہندو بنا کر پیش کیا تھا۔

ہمارے کچھ پٹی دار جن کے پُرکھے مسلمان ہو گئے تھے اُسے وہ مسلمان ہی مانتے تھے اور اس کا نام اقبال بتاتے تھے جسے رام ابھیلاش نے بدل کر رام اکبال کر دیا تھا۔ خیر یہ سب قصے ہیں۔ یہ کتنا سچ ہیں کتنا جھوٹ، یہ جاننے کا ہمارے پاس کوئی بھی ذریعہ نہیں تھا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر بات یہ تھی کہ ان قصوں کے باوجود ہمارا جیون چل رہا تھا۔ ہم زمینداروں کے داماد اور بھانجے بھتیجے تھے۔ ہم پورے علاقے کے معززین تھے۔ اور دھیرے دھیرے پورے علاقے کی پروہتائی اور پنڈتاؤپنے پر ہمارا قبضہ تھا۔ اور کیا چاہئے تھا ہمیں۔ اب ہم ابھیلاش پور کے باشندے تھے اور ابھیلاش پور ہمارا تھا۔

ہمارا حال یعنی دو کوڑی کے نہ ہونا

جیسے جیسے ہمارے گھر تقسیم ہوتے گئے ویسے ویسے ہماری زمینیں اور دولت بھی بٹتی گئی۔ اور آج کی تاریخ میں ہم کوڑی کے تین تھے۔ گاؤں کے کچھ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ہمارے پاس ایک شاندار ماضی ضرور تھا لیکن وہ ہمارے کسی کام کا نہیں تھا۔

ہمارے پاس اب تھوڑے تھوڑے کھیت تھے بس۔ پیڑ اور باغ زیادہ تر مشترک ہی تھے۔ اب ہم میں سے کچھ لوگوں کو یہاں سے باہر نکلنے کے بارے میں سوچنا چاہئے تھا۔ لیکن باہر نکلنے کا خیال ہی ہمیں خوفزدہ کرتا تھا۔ باہر نکلتے ہی ہمیں محنت کرنا پڑتی اور محنت ہمیں کسی بُھوت کی طرح ڈراتی تھی۔

ہمارے بیچ سے کچھ لوگ باہر ضرور گئے تھے لیکن وہ گدیوں پر گئے تھے۔ انہوں نے ایسی لڑکیوں سے بیاہ رچایا تھا جن کے بھائی نہیں تھے۔ اور وہ سسرال جا کر بس گئے تھے۔ اسی طرح سے کچھ دوسرے لوگ ابھیلا پور آئے بھی تھے۔

منفرد محض ایک تھے۔ قریباً پانچ چھ پُشت پہلے ہمارے ایک پٹی دار باہر نکلے تھے۔ اور نہ جانے کن حالات میں وہ کسی مسلم زمیندار کے یہاں کھانا پکانے کی نوکری کر لی۔ جب کئی سال بعد وہ واپس لوٹے تو ان کے لوٹنے سے پہلے ہی ان کے بارے میں تمام اطلاعات ہم تک پہنچ چکی تھیں۔ سو ان کے باقی پٹی داروں نے ان کا ناطقہ بند کر دیا اور ان کے ساتھ روٹی کا ناطہ توڑ لیا۔ بدلے میں کچھ دنوں کی کشمکش کے بعد ایک دن انہوں نے مولوی کو بلوایا اور باقاعدہ مسلمان ہو گئے۔

وہ بھی ہمارا ہی حصہ تھے۔ جو خون ہماری رگوں میں دوڑتا تھا وہی ان کی رگوں میں بھی۔ لیکن مذہب بدلتے ہی وہ ہمارے لیے بیگانے بل کہ اچھوت ہو گئے تھے۔ ہم ان سے دشمنوں کی طرح سے برتاؤ کرنے لگے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب پاکستان بنا تو وہ اس میں شامل ہونے والے جتھے میں تُرنت ہی شامل ہو گئے۔ دو بیٹے بھی ان کے ساتھ ہی گئے۔ باقی دو بیٹوں اور ان کی بیوی نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اور وہ یہیں رہ گئے ہمارے ساتھ۔ اپنی پوری تمکنت کے ساتھ۔ ایک مسجد بھی کھڑی کر لی ہے۔ اور اب کل ملا کر نو گھر ہیں۔

جو یہاں سے گئے وہ پاکستان پہنچے کہ نہیں، اگر پہنچ گئے تو ان کی اولاد وہاں کس حال میں ہے؟ اس بارے میں ہمیں کچھ بھی پتہ نہیں ہے۔

لیکن ہم جو یہاں رہ گئے تھے اب چھیج رہے تھے دھیرے دھیرے۔ ہمارے کچھ گنے چنے پٹی داروں کو چھوڑ دیں جنہوں نے سرکاری نوکریاں حاصل کیں اور آس پاس کے شہروں میں بس گئے۔ وہ اب ابھیلاش پور کبھی کبھار ہی آتے ہیں۔ زیادہ تر اپنی کھیتی باڑی کا حساب کرنے۔ جو کہ ہم میں سے ہی کوئی جوت رہا ہوتا ہے۔

ایک وقت تھا کہ جب ہمارے خاندان کے لوگ کھیتی کے کاموں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔ پہلے کے زمانے میں بیگار، بعد میں مزدوری اور بٹائی پر ہوتی رہیں کھیتیاں۔ ایک گھمنڈ بھرا خود کو دیا ہوا وچن تھا کہ کھیت میں کام کرنا ہم براہموں کا کام نہیں۔ اور کرتے بھی کیوں جب اتنے سستے داموں پر مزدور اور کاشتکار دستیاب تھے۔ یہ لگ بھگ صحیح ہوگا اگر کہا جائے کہ ہم محنت کرنا بھول ہی چکے تھے۔

بعد میں یہ وقت بھی آیا کہ اگر ہم خود کاشتکاری نہ کرتے تو شاید بھوکوں ہی مر جاتے یا کہ ہمیں ابھیلاش پور چھوڑ کر کام دھندے کی تلاش میں کہیں باہر نکلنا پڑتا۔

سب سے پہلے ان لوگوں نے اپنا کام خود کرنا شروع کیا جو مسلمان ہو چکے تھے۔ بعد میں ان کی دیکھا دیکھی چھیدی پنڈت بھی ایک دن ہل اور بیل کے ساتھ کھیت میں دکھائی دیے۔ یہ ایک ناقابل دید منظر تھا۔ ابھیلاش پور کے زیادہ تر پنڈتوں نے ان کے اس قدم کی بھرپور مذمت کی۔ انہیں برادری سے باہر کرنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ لیکن وہ ڈٹے رہے۔ انہوں نے سیدھے ایک قول سے ساری دھمکیوں کو رد کر دیا کہ برادری کو رکھوں یا اپنے بچوں کا منہ دیکھوں۔

دھیرے دھیرے سبھی لوگوں کو چھیدی پنڈت کے راستے پر چلنا پڑا۔ شروع میں شرم کے مارے کئی لوگوں نے رات کو کام کرنا شروع کیا۔ جس سے کہ کام کرتے ہوئے وہ لوگوں کی نظروں میں آنے سے بچے رہیں۔ یہ ایک جھوٹ موٹھ کا پردہ تھا جس کے آر پار سب کچھ دِکھتا تھا لیکن اسے گرنے میں بھی کئی سال لگ گئے۔

لیکن اس سب کے باوجود حالات بگڑتے ہی چلے گئے۔ ہم خاندانی اعتبار سے صرف پروہتی کا کام جانتے تھے۔ اور اب ابھیلاش پور میں ہی پچاسوں پروہت تھے۔ آس پاس کے دیہاتوں میں بھی ان کی تعداد کم نہیں تھی۔ لوگوں کے دِل میں ہمارا احترام نہیں رہا تھا۔ وہ ہمارے سامنے ہی ہمارا مذاق اڑاتے۔ لالچی، مفت خور، طفیلیے، ڈھونگی جیسے القابات سے نوازتے۔ اور ہم سے بہتر یہ کون جانتا تھا کہ ہم یہ سب کچھ سچ مچ تھے۔ اوپر سے پاکیزہ اور روحانی دِکھنے کی کوشش لیکن اندر سے کھوکھلے محتاج، لالچی، مفت خور، طفیلیے، ڈھونگی۔

ہم اوروں کے زیر کفالت تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اب تک ہم جن پر رعب ڈالتے ہوئے پل رہے تھے انہوں نے ہم سے رعب کھانا بند کر دیا تھا۔ پہلے ہم ان پر ترس کھاتے تھے اب وہ ہم پر ترس کھا رہے

تھے۔ انہیں ہمارا ڈر نہیں رہا تھا۔

ان کے پاس زمینیں نہیں تھیں ۔ وہ پہلے بھی اپنی محنت کی کمائی کھا رہے تھے ۔ اور اب بھی ۔ ابھی ہم میں سے زیادہ تر کی زمینیں کم ہو رہی تھیں اور اسی تناسب سے اُن میں سے زیادہ تر امیر ہو رہے تھے۔

خود ہمارے وہ پٹی دار جو مسلمان ہو گئے تھے ان کی حالت بھی ہم سے بہتر تھی ۔ انہیں موٹر رکشہ چلانے سے لے کر کسی قصبے کے کنارے چائے سموسے کی دوکان چلانے تک میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اور ان میں سے ایک لڑکے نے ابھی تھوڑے دن پہلے نزدیکی بازار میں بال کاٹنے کی دوکان کھولی تھی ۔ کیا مذہب بدلنے سے اطوار اس قدر بدل جاتے ہیں؟ ہم اکثر سوچتے لیکن بھول جاتے کہ اس کے بعد ان پر سے اس تباہ کن سوچ کا دباؤ ختم ہو گیا تھا جس سے کہ ہم جوجھ رہے تھے ۔ دوسرے مذہب بدلتے ہی انہیں ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ جسمانی اور نفسیاتی جد وجہد سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ جس سے کہ ہم شاید کبھی نہیں ہوئے یا کہ اب ہو رہے ہیں ۔

کوئی نہیں جانتا کہ اس کی شروعات کیسے ہوئی تھی لیکن اس مشکل وقت میں جب ہمیں نئے سرے سے کام میں جٹ جانا تھا ہم کچھ ہوائی سپنوں میں کھو گئے ۔ ہمارے بیچ سے جو لوگ کام کی تلاش میں یا بہتری کی کھوج میں باہر نکلے ہم نے انہیں نظر انداز کر دیا۔ ہمیں آگے کی بجائے پیچھے دیکھنے میں زیادہ سکھ ملتا۔ ایسا کرتے ہوئے کئی بار ہمیں ایک بھیانک اداسی گھیر لیتی لیکن یہ اداسی بھی ہمیں بھلی لگتی۔

یہ ہمیں ماضی کے ان روشن دنوں کی طرف لے جاتی جہاں سب کچھ سنہرا تھا۔ ہم بار بار انہیں دنوں کی طرف لوٹنا چاہتے۔ ہم پھر سے رام ابھیلاش یا رام اکبال کے زمانے میں لوٹ جانا چاہتے ۔ یہ سب کرتے ہوئے ہم ایک تصوراتی دنیا میں پہنچ جاتے جہاں رام ابھیلاش یا رام اکبال سیدھا ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے جب کہ ہم میں سے کسی نے بھی انہیں نہیں دیکھا تھا۔ اور ان کی کوئی تصویر بھی ہمارے پاس موجود نہیں تھی ۔

یہ انہیں دنوں کی بات رہی ہوگی جب ہم میں سے بہتوں نے حقیقت کی بجائے قصوں میں رہنا شروع کیا ہوگا۔ روکھے عہد حاضر کے مقابلے میں قصوں کی دنیا انہیں زیادہ ہری بھری اور رنگین لگی ہوگی ۔ اور وہ دھیرے دھیرے ایک دن وہیں پر بس گئے ہوں گے ۔ انہیں حیرت ہوئی ہوگی جب انہوں نے وہاں اپنے کئی آباء کو، پٹی داروں کو پایا ہوگا۔ اور خوش ہوئے ہوں گے کہ یہاں وہ اکیلا پن محسوس نہیں کریں گے۔

حاشیے کے قصے اور ان کا حقیقت میں بدل جانا

ہم بچپن سے ہی سنتے آئے تھے کہ ہمارے چاروں طرف خزانے پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمارے نیچے زمین میں جگہ جگہ اتھاہ دھن دولت گڑا ہوا ہے۔ اس بات میں سچائی تھی لیکن رتی بھر ہی ۔ ہر گھر میں کچھ نہ کچھ مشکل وقتوں کے لیے دبا کر رکھا جاتا تھا۔ سکے مہریں اور زیور ہی نہیں برتن تک زمین میں گاڑ کر رکھے جاتے

تھے۔ راز اور حفاظت کے لحاظ سے گھر کا مالک گھر کے افراد کو بھی نہیں بتاتا تھا کہ اس نے دھن کہاں گاڑ رکھا ہے۔ کئی بار وہ یہ بات کسی کو بتائے بغیر ہی مر جاتا تھا۔ ایسے میں وہ دفینہ جہاں کا تہاں گڑا ہی رہ جاتا تھا۔ اور اس کا حصول مکمل طور پر اتفاقات پر منحصر تھا جو کبھی کبھار ہی وقوع پذیر ہوتے تھے۔

میں جب چھوٹا تھا تو ایسے قصے مجھے بہت اپنے سے لگتے تھے جن میں خزانوں کا ذکر ہوتا تھا۔ اور ہمارے علاقے میں ایسے قصوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ سبھی قصے ہمارے سامنے حقیقت کے اسلوب میں آتے تھے۔ ہمارے نزدیکی آباءواجداد یا بیچ کے لوگ اس میں ہمیشہ کرداروں کے روپ میں موجود رہتے تھے۔ ہم اپنے اجداد سے کچھ اسی طرح سے متعارف ہوئے۔

بہتیرے اجداد بُھوتوں کے رُوپ میں بھی سامنے آتے تھے۔ کچھ خزانوں کی حفاظت کے لیے سانپ بن گئے تھے۔ اسی لیے بچپن سے ہی سانپ اور بُھوت میرے لیے دوہری کشش کی چیز رہے۔ ایک تو ڈر، ان دیکھے بھیدوں کی کشش اور دوسری یہ بات کہ میں اپنے نہ جانے کس جدِ امجد سے ابھی مل رہا ہوں۔

سانپوں کو میں کھوجتا، انکا دُور تک پیچھا کرتا۔ ان کی بلوں تک، پیڑوں کی کھوکھلوں تک جہاں کہ وہ رہتے تھے، اور ان کے دشمن نیولے۔ سانپ نیولے کی لڑائیاں، سانپ کے زہر سے بچاؤ کی جڑی بوٹیوں کے قصے، ناگ منی اور اس کے معجزانہ اثر کے قصے سب کے سب ایک دم حقیقت کی شکل میں ہمارے سامنے آتے۔ ایک دوسرے سے مربوط، اور خزانوں کا ایک اعلیٰ بیانیہ مرتب کرتے ہوئے۔

جب میں نے سکول جانا شروع کیا اور اگلے تین چار سال بعد جب میں نے طرح طرح کے حملہ آوروں کے بارے میں جانا تو میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ وہ مشرق کی طرف سے آئے ہوں گے۔ میں ایسے خواب دیکھتا جن میں کبھی انگریز حملہ کر رہے ہوتے تو کبھی تُرک۔ یہ سب کے سب مشرق سے ہی آتے دکھائی دیتے اور خزانوں کو لوٹنے کے بعد اسی سمت میں واپس لوٹ جاتے۔

اس کے پیچھے ایک دم نجی وجوہات تھیں۔ مشرق کی طرف ہی ہمارا سب سے نزدیکی بازار تھا۔ لوگوں کا زیادہ تر آنا جانا مشرق کی طرف سے ہی تھا۔ بیڑیا بنجارے بھی مشرق کی سمت سے ہی آتے اور اسی تالاب کے کنارے ڈیرا ڈالتے۔ یہ بنجاروں کے بارے میں قاعدے سے کچھ بھی نہ جاننے یا ان کے بارے میں ہمارے گھروں میں پھیلے طرح طرح کے قصوں کا ہی اثر رہا ہوگا کہ میرے خواب میں جب انگریز یا مغل حملہ کرنے کے لیے آتے تو وہ بنجاروں کے ہی بھیس میں ہوتے۔ وہ گھوڑوں کی بجائے بھینسوں پر بیٹھ کر آتے۔ اور ہماری بستیاں ویران ہو جاتیں۔ لوگ پیڑوں پر ٹنگے نظر آتے۔ خواب ختم ہونے کے بعد بھی لوگ پیڑوں پر سے اُتر آتے اور اپنے اپنے کام میں لگ جاتے۔ اور بنجارے وہیں تالاب کے کنارے پہنچ جاتے۔

تالاب کا نام تھا سکھوا کا تالاب۔ یہ ایک بہت کم گہرا تالاب تھا۔ یہ طول میں کافی بڑا تھا لیکن اسے برسات میں بھی کھڑے کھڑے پار کیا جا سکتا تھا۔ ممکنہ طور پر ٹیلا یہیں کی مٹی سے بنا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی یہ گہرا

رہا ہو لیکن اب یہ ایک کم گہرے تالاب میں بدل گیا تھا۔ لگ بھگ پورے ہی تالاب میں کریموا پھیلا ہوا تھا جس کا ساگ اکثر ہمارے گھروں میں پکتا۔

’’تالاب کا نام سُکھوا کیوں ہے؟‘‘ ایک بار میں نے ہنومان مسر سے پوچھا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ پہلے اس طرح سے دوکانیں نہیں ہوتی تھی جہاں سب کچھ مل جائے۔ تو بنجارے آتے تھے کچھ سامان بیچتے کچھ خریدتے اور آگے بڑھ جاتے۔ سُکھوا ایسے ہی ایک بنجاروں کے سردار کا نام تھا جو اکثر اس تالاب کے کنارے ڈیرا ڈالتا تھا۔ اسی کے نام پر اس تالاب کا نام سُکھوا کا تالاب پڑ گیا دھیرے دھیرے۔

یہ گرمیوں میں اس قدر سوکھ جاتا کہ سوکھ کر اس کی مٹی چٹخ جاتی۔ اس میں گہری دراڑیں پڑ جاتیں۔

اسی تالاب کے ساتھ ایک کہاوت منسوب تھی جس سے ہمارے علاقے کا بچہ بچہ واقف تھا۔ کہاوت تھی، ’ایک لاکھ لگاؤ تو نو لاکھ پاؤ، پتہ نہیں سُکھوا اِس پار یا اُس پار۔ اس کہاوت میں ایک لاکھ خرچ کرنے پر نو لاکھ ملنے کی خوشخبری تھی لیکن پیسہ خرچ کرنے کا شعبہ اور اس کی جگہ متعین نہیں تھی۔ ہم سب اس میں پورا یقین رکھتے اور نو لاکھ پانے کے خواب دیکھتے۔

اس طرح کی کہاوتوں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ ہر دو چار گاؤں کے بعد کوئی نہ کوئی ایسی جگہ ملتی تھی جہاں اس طرح کی کوئی مبہم غیر واضح کہاوت پر چلت ہوتی۔ کہتے ہیں کہ اس طرح کے دھن عموماً بنجاروں کے ہوتے تھے جو چوروں ڈاکوؤں کے ڈر کے مارے وہ جگہ جگہ چھپا دیتے تھے۔ لوگ ان کے بارے میں سوچنے سے بھی ڈرتے تھے۔ لوگوں کا ماننا تھا کہ بنجارے اپنی دھن دولت کو زندہ جاوید بنا دیتے تھے۔ جو اس دھن کی آخر زمانہ تک رکھوالی کیا کرتا تھا۔

خزانے کو جیتا جاگتا بنانے کے بھی کئی ایک قصے تھے۔ سب سے زیادہ مشہور قصہ یہ تھا کہ زمین میں جہاں دھن گاڑا جاتا وہیں اندر ایک بچے کے بیٹھنے کی جگہ بنائی جاتی۔ کچھ اس طرح سے کہ جب وہ جگہ اوپر سے پاٹ دی جائے تب بھی بچے کے بیٹھنے کی جگہ بچی رہے۔ وہاں خزانے کو چھپانے سے پہلے آخری پوجا کی جاتی۔ پوجا میں کسی بچے کو بھی شامل کیا جاتا جسے افیون یا کوئی اور نشیلی چیز پہلے ہی کھلا دی گئی ہوتی۔ بچہ نشے کی قاتل فریبی دنیا میں کھویا رہتا۔ اسے کھیلنے کے لیے کھلونے اور کھانے کے لیے مٹھائیاں دی جاتیں۔ پوجا کے بعد پوجا کا دیپ جلتا چھوڑ دیا جاتا اور گڑھے کو قرینے سے ڈھک دیا جاتا۔ گڑھے کے اندر ایک ساتھ دو حادثے ہوتے۔ اِدھر دیا بجھتا اُدھر بچے کی سانس رُکتی۔ اسی بچے کی رُوح آخر زمانہ تک اس دفن شدہ خزانے کی رکھوالی کرتی۔

کئی بار خزانے کے مالک بنا رکھوالا مقرر کیے ہی مر جاتے۔ تب ان کی رُوح ہی خزانے کے آس پاس منڈلانے لگتی اور اس کی رکھوالی کرتی۔ کئی بار خزانے کی رکھوالی کر رہی رُوح کا اس سے کوئی سیدھا رشتہ نہ ہوتا لیکن وہ خزانہ دیکھتے ہی اس پر کنڈلی مار کر بیٹھ جاتی۔

کئی بار بنجارے اپنے دھن کو جہاں چھپاتے اس کے آس پاس کہیں کوئی پتھر وغیرہ گاڑ دیتے۔ اور

اس کے ساتھ کوئی پہیلی نما چیز عام کر دیتے۔ جس کے مطلب میں اس دھن کا راج چھپا ہوتا۔ ان پہیلیوں کو کہاوت کہا جاتا۔ یہ کہاوتیں ہم جیسے ہزاروں لوگوں کے طمع کے ساتھ جنم جنم تک کھیلتے لیکن ان کا اسرار نہ کھلتا۔ لاکھوں میں کوئی ایک ہی ہوتا جسے ان خزانوں کے قریب جانے کا موقع ملتا۔ یا کہ اس میں سے کچھ حاصل ہو پاتا۔

اس طرح کے قصوں میں بہت سارے سانپوں کا بھی تذکرہ تھا۔ سانپوں کو دھن دولت سے بہت پیار تھا۔ وہ اکثر خزانے میں ہی رہتے۔ یہ سانپ بڑے دھوکہ باز ہوتے تھے۔ سونا چاندی ہیرے موتی کے بیچ رہتے ہوئے خود ان کا جسم بھی ویسا ہی ہو جاتا۔ ان کے بدن پر ہیرے موتی جڑے ہوتے۔ آنکھیں ایسا چمکدار ہیرا ہوتیں کہ جو کوئی ان میں ایک بار دیکھ لیتا وہ کچھ اور دیکھنے کے قابل ہی نہ رہتا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جاتا۔ اسے بس وہی چمکدار آنکھیں اپنے چاروں طرف دکھائی دیتیں۔

ہمارے آس پاس ایسے ہزاروں قصے تیر رہے تھے۔ کئی بار لوگ ایسے ہی کسی قصے سے ٹکرا جاتے۔ قصوں سے ٹکرانے کے اس واقعے کے بعد کئی بار وہ ہمیشہ کے لیے بدل جاتے۔ کئی بار وہ خود بھی قصوں میں ہی سما جاتے اور وہاں سے ان کی واپسی کبھی بھی ممکن نہ ہو پاتی۔

تو دوسری طرف ایسے بھی بعض قصے تھے جہاں کسی کی ترقی یا آگے بڑھنے کو کسی نہ کسی قصے سے جوڑ کر دیکھا جاتا۔ خود ہم بھی اپنے جدامجد رام ابھیلاش کی ترقی کو ایسے ہی قصوں سے جوڑ کر دیکھتے تھے۔

میں خود بھی ایسے قصوں کا حصہ بننا چاہتا تھا اور اس کے لیے کوئی بھی قیمت چکانے کے لیے تیار تھا۔ میں خزانوں کا کولمبس بننا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میں نے بہت سارے قصوں میں اپنی آمدورفت بنا رکھی تھی۔ اس معاملے میں میں کافی سماجی شخصیت تھا۔ میں اکیلا نہیں تھا میرے جیسے دوسرے بھی کئی تھے۔

خزانہ پارس پتھر تھا۔ جو کہیں بھی ہو سکتا تھا۔ ایک لمحے کی لاپرواہی بھی ہمیں اس خزانے سے اتنی دُور پھینک سکتی تھی جہاں سے دوبارہ کئی جنموں تک شاید ہی ہم لوٹ پاتے۔ کسی کو بھی دوبارہ موقع نہیں ملنا تھا۔ اس لیے موقعوں کو پہچاننا بے حد ضروری تھا۔

ایک بار جب گھر کے لوگ کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور میں گھر میں اکیلا تھا، میں نے گھر کے مغربی کونے میں اونچی نیچی زمین کی اکیلے ہی کھدائی کی تھی۔ میرا پکا اندازہ تھا کہ وہاں سے کچھ نہ کچھ ضرور نکلنا چاہیے۔

میں بغیر رُکے لگ بھگ دوپہر تک کھودتا رہا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ شام تک گھر کے لوگ واپس آنے والے تھے۔ میری پٹائی بھی لگ بھگ طے تھی لیکن میں کسی بھی قیمت پر اپنے اندازے کی جانچ کرنا چاہتا تھا۔

تو میں جب لگ بھگ مایوس ہی ہو جانے والا تھا کہ میرا پھاوڑا کسی پتھر سے ٹکرایا۔ میں آہستہ آہستہ مٹی ہٹانے لگا۔ ساری مٹی ہٹانے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہاں چکی کے دو برابر برابر ٹکڑے موجود تھے۔ ان کو میں نے باہر نکال لیا۔ اور کھودا تو مٹی کی ایک ثابت مٹکی ملی جو اوندھی پڑی تھی۔ اسے اٹھایا تو اس کے نیچے ایک

سبز رنگ کا بچھو تھا۔ میں نے مٹکی کو جیسے کا تیسا رکھ دیا اور گڑھا پاٹنے لگا۔ اب یہاں کچھ اور ملنا مشکل تھا۔ سبز بچھو نے میری امید ختم کر دی تھی۔

شام کو گھر پر میری خاصی خبر لی گئی۔ لیکن چکی کا وہ آدھا حصہ سل کے طور پر بہت دنوں تک استعمال کیا جاتا رہا۔ چکی کا دوسرا حصہ بغل کے ہی بالگووند مسر اُٹھا لے گئے۔ لیکن اس واقعے نے مجھے اس بات کا بھروسہ دلا دیا کہ دھرتی کے اندر بہت کچھ چھپا ہوا ہے۔ میں اگر اس کا تھوڑا سا حصہ بھی کھوج نکالوں تو مجھے جیون بھر کچھ اور کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

میں اکیلا نہیں تھا۔ بہت سارے 'میں' تھے جو جیون بھر کچھ بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔

خزانے کی کھوج عرف ابھیلاش پوری اُمیدیں

ہماری چمڑی کے سب سے اندرونی تہ خانوں میں چھپی ہوئی کنگالی ہی وہ مہمیز رہی ہوگی جس نے ہماری آنکھوں میں اس قدر خزانے کی چمک بھر دی ہوگی۔ ہمارے گھروں کے سب سے اندرونی تہ خانوں میں چھپی کنگالی نے ہی ہم سے ایک دوسرے کے گھر کھدوائے ہوں گے۔ جو جتنا ہی زیادہ کنگال اس کی آنکھوں میں امیری کے اتنے ہی بڑے خواب۔ اس کے سپنوں کی اتنی ہی لمبی اڑان۔ اور اس اڑان کا محنت یا کام کاج سے کوئی دور کا بھی ناطہ نہیں۔

کام کاج کے بارے میں ہمارے اندر دو باتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ محنت کرنے کی ہماری کوئی عادت ہی نہیں رہی تھی۔ رام ابھیلاش اور رام اکبال کے ابتدائی دنوں کو چھوڑ دیں تو ہم محنت کرنا کب کا بھول چکے تھے۔ ان دونوں کی ترقی میں بھی ان کی محنت سے بڑا حصہ، دان کی زمین اور بعد میں بیگار کی مزدوری کا تھا۔ ہم نے اپنے ایسے کسی بھی پُرکھے کے بارے میں نہیں سنا تھا جو محنت کر کے امیر بن گیا ہو۔ ہم نے اپنے آس پاس ایسے کسی کو دیکھا بھی نہیں تھا۔

ہمارے آس پاس جو تمام کاشتکار یا مزدور جاتیاں تھیں، وہ صبح سے شام تک پسینے میں ڈوبی رہتی تھیں۔ پھر بھی اکثر وہ ننگے بدن ہی دکھائی دیتیں۔ کپڑے ان کے بدن پر کبھی کبھار ہی دِکھتے۔ اس کے باوجود وہ اکثر ہمارے باپ دادا کے پاس آتے۔ اناج کے لیے، روپئے کے لیے، قرض مانگتے، گڑگڑاتے۔ اکثر انہیں یہ قرض مل بھی جاتا۔ جسے وہ یک مشت شاید ہی کبھی واپس کر پاتے۔ ہم چاہتے بھی نہیں کہ وہ ہم سے پوری طرح آزاد ہوں کبھی۔ انہیں ان کی اس حالت کی قیمت چکانی پڑتی۔ یہ سمجھنے لائق ہم ذرا بعد میں ہی ہو پائے۔ تب ہم نے بھی قیمت وصولنا سیکھا۔

لیکن قیمت وصولنے کے دن بیت چکے تھے۔ اب قیمت چکانے کے دن تھے اور ہم بھرپور قیمت چکا رہے تھے۔ ہم شاید کسی طرف بھاگ نکلتے۔ یہاں پر فی الحال ایسا کچھ بھی نہیں تھا جس کا لالچ ہمیں روکے رکھتا۔ حالات روز بہ روز مزید بھیانک ہونے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایسے میں ہماری کاہلی کے علاوہ یہ خزانہ

ہی تھا جس کی چمک نے ہمیں روکے رکھا۔ ہم میں سے ہر ایک کو لگ رہا تھا کہ خزانہ ملتے ہی ہمارے سارے مسائل ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔

خزانہ ہماری مُردہ آنکھوں کا خواب تھا۔ جو اپنی چھوٹی سے چھوٹی شکل میں مل جاتا تو بھی شاید ہم بچ جاتے۔ کیا سچ مچ؟

خزانے کے لیے ہم نے بہتیری کوششیں کیں۔ ان کوششوں میں رُوحوں سے ٹکرانا بھی تھا۔ اس لیے ان کو خوش کرنا بہت ضروری تھا۔ وہ خزانے کی کھوج میں ہماری مدد تو کر ہی سکتی تھیں۔ دوسری رُوحوں کے خلاف سرکشی بھی کر سکتی تھیں۔ اس راستے پر تمام دشمن رُوحیں بھی مل سکتی تھیں اس لیے بجرنگ بلی کی موافقت بھی ضروری تھی۔ اور تو اور اس عمل کو خفیہ رکھنا بھی ضروری تھا نہیں تو رُوحیں قریب ہی نہ پھٹکتیں۔

اس طرح کی بہتیری کوششیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ جیسے ایک کوشش کے روپ میں پیروں کو میں دھمکاتا ہوا چلتا تھا۔ لگاتار کودتے ہوئے چلنے جیسا۔ اس سے زمین کے ٹھوس، کم ٹھوس یا کھوکھلی ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ جہاں نیچے کچھ ہوتا وہاں سے دھات جیسی کھنکناہٹ کی امید تھی۔ جہاں نیچے زمین کھوکھلی ہوتی وہاں دوسری طرح کی گونج سنائی دیتی۔ کم سے کم اتنا تو پتہ چل ہی جاتا کہ یہاں کچھ ہو یا نہ ہو لیکن زمین کبھی نہ کبھی کھودی ضرور گئی ہے۔

ہر آدمی اپنے تئیں کوشش کر رہا تھا۔ اور ہم ایک دوسرے کی نقل بھی کر رہے تھے۔ کودتے ہوئے، زمین کی ٹوہ لیتے ہوئے چلنے کی نقل بھی بہتیرے لوگوں نے کی۔ ہماری چالیں کچھ اس قدر بدل رہی تھیں کہ کسی پڑوسی گاؤں کا کوئی آدمی ہمیں دیکھتا تو ہمیں انسانوں سے الگ کوئی اور مخلوق سمجھ سکتا تھا۔ ہماری آنکھیں عموماً نیچے کی طرف ہوتیں۔ سر اور ہاتھ نیچے جھکے ہوتے۔ ہم ایک دوسرے کی بغل سے نکل جاتے اور ہمیں پتہ بھی نہ چلتا کیوں کہ دونوں ہی پیر دھمکاتے ہوئے نیچے دیکھتے، زمین میں کچھ کھوجتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہوتے۔

مشکل یہ تھی کہ جس ٹیلے پر ابھیلاش پور بسا ہوا تھا اسی ٹیلے میں دھن دولت چھپے ہونے کے سب سے زیادہ امکانات تھے۔ ہماری مشکل یہ تھی کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے تھے کہ ایک طرف سے کھدائی شروع کر دیں اور دوسری طرف تک کھودتے چلے جائیں۔ یہ ناممکن تھا۔

ہمیں دوسری حکمتوں سے کام لینا تھا۔ اور دوسروں سے چھپ کر کام کرنا تھا۔ یہ تبھی ممکن تھا جب وہ رُوحیں ہمارا ساتھ دیں جو نہ جانے کب سے خزانوں کی رکھوالی میں لگی ہوئی تھیں۔ انہیں ویسے بھی موافق کرنا تھا ہمیں۔

ہم نے تمام ٹونے ٹوٹکوں کا سہارا لیا۔ تمام کالی اور لال کتابیں خریدیں۔ ورہد اِندرجال کے صفحات پلٹے۔ رفع حاجت کے بعد گھر لوٹتے ہوئے بچا ہوا پانی بیر اور ببول کے پیڑوں پر اکیس دن تک چڑھایا اور بُھوتوں پریتوں کے ظاہر ہونے کی خواہش کی۔ اس طرح سے کام سدھ نہ ہوتے دیکھ کر کئی جادوگروں اور

کاہنوں کی پناہ میں گئے۔ بہت سے گھروں میں رشتہ دار کے رُوپ میں کاہن جادوگر آن براجے۔

ہم کن سے جھوٹ بول رہے تھے آخر! چھوٹا سا تو تھا ابھیلاش پور۔ ہم ایک دوسرے کے سارے رشتے ناطے جانتے تھے۔ ان سب کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا ہمارا۔ پھر اچانک اتنی بڑی تعداد میں اتنے سارے رشتہ دار کہاں سے وارد ہو گئے تھے۔ کون تھے وہ ہمارے جو ہم نے انہیں اپنے گھروں کے اندر پناہ دی تھی؟ وہ کیا کرنے والے تھے آخر؟

گھر گھر ہون ہو رہے تھے۔ انڈے توڑے جا رہے تھے۔ قربانیاں کی جا رہی تھیں۔ اور اس طرح وہ ان جگہوں کو کھوجنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں خزانہ چھپا ہو سکتا تھا۔ ان سب نے بتایا کہ ابھیلاش پور کے نیچے اتنی دھن دولت دبی ہوئی ہے کہ اس کے آگے سرکاری خزانے کی دولت بھی پانی بھرے۔ اسے نکالنا ہی ہوگا۔ خود وہ دولت بھی باہر آنے کے لیے بے قرار ہے۔ ان کے رکھوالے اب اپنے کام سے نجات چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نئے محافظ ان کی جگہ لیں اور انہیں آزاد کریں۔

اور حیرت کی بات ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر رکھوالے بننے کے لیے راضی تھے۔ پورے علاقے کی ہوا ہی جیسے بدل گئی تھی۔ ہم اس لہر میں سر سے پیر تک ڈوبے ہوئے تھے۔ کئی بار اس ہوا کے اثر سے بچے ہوئے لوگ ہمیں باہر نکالنا چاہتے۔ وہ ہمارا مذاق اڑاتے۔ ہم پر لعنت بھیجتے۔ ہمیں گالیاں بکتے لیکن ہم ان کی زبان بھول گئے تھے۔ کئی بار ہم ایسا منہ بناتے جیسے ہمیں ان کی باتیں سمجھ میں ہی نہ آ رہی ہوں۔ اور یہ پوری طرح سے جھوٹھ بھی نہیں تھا۔ ہمیں خزانے کے علاوہ کوئی اور بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی ان دنوں۔

ہم نے ویسے لوگوں سے بچنے کا سیدھا راستہ نکالا کہ کٹنے لگے ان سے۔ پہچاننا ہی بند کر دیا انہیں۔ ایسے راستوں پر چلنا بند کر دیا جہاں کہ وہ مل سکتے تھے۔ ہم اپنے قصوں میں کھو گئے۔ وہ ملتے بھی تو ہم اپنے اپنے قصوں سے بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔

ہم میں سے ہر کوئی اکیلا تھا۔ ہم الگ الگ کام کر رہے تھے۔ اس کے باوجود ہم سب کے بھیتر ایک ہی طرح کے سپنے گھر کر رہے تھے۔ ہم میں سے ہر کسی کو بھروسہ تھا کہ اس کے ہاتھ ایک بڑی دولت لگنے والی ہے۔ ہم لگاتار یہ منصوبے بناتے کہ ہم اپنے حصے کی دولت کیسے خرچ کریں گے اور دولت تھی کہ ان سارے منصوبوں کے بعد بھی بچی رہ جاتی تھی۔

سب کچھ بدل رہا تھا۔ ارواح تک اپنی دولت واپس مانگنے لگی تھیں۔ جیسے ساس کے مرنے کے بعد اس کی کردھن، ہنسلی یا ہار کسی بہو نے پہن رکھا ہوتا تو اکثر ساس کی رُوح اس پر سوار ہو کر چلاتی، ''اتار میری کردھن.... اتار میری ہنسلی!'' اور بے بس بہو کردھن یا ہنسلی اتار پھینکتی۔ تھوڑے دن سکون رہتا اور اس کے بعد بہو کا بھی ان زیوروں سے لگاؤ اتنا گہرا ہو چکا ہوتا کہ وہ دوبارہ انہیں پہنے نظر آتی اور وہی حادثہ پھر سے دوہرایا جاتا۔ کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ ہوتا۔

کوئی نیند میں ہی کسی سے نہ جانے کیا بات کرتے ہوئے چلاتا دکھائی دیتا تو کوئی سوتے ہوئے اچانک ہڑبڑا کر جاگ اٹھتا۔ جیسے کوئی آگ سی دہکتی رہتی ہمیشہ۔ بے چین لوگ ہمیشہ کچھ کھوجتے تلاش کرتے نظر آتے۔ آنکھیں ہمیشہ کٹوروں میں گھومتی رہتیں۔ لوگوں کی نیند غائب ہو گئی تھی۔ لگاتار جاگتے رہنے سے سب کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔ اور وحشت سے بھری لال لال آنکھیں کچھ اس طرح لگتی تھیں جیسے ان میں سے خون ٹپک رہا ہو۔ ان میں ایک بھیانک ریگستانی چمک تھی۔

اڑھائی سو سال پرانے خواب کا اختتام

ایک دن افواہ اُڑی کہ جیون ڈُبے کو ایک گاگر بھر سونے کی مہریں ملی ہیں۔ اگلے ہی دن جیون ڈُبے کے یہاں ڈکیتی ہوئی۔ ڈکیتوں نے جیون ڈُبے کو بہت تڑپایا لیکن چاندی کے دو چار سکوں سے زیادہ کچھ نہیں پا سکے۔ ہوا میں یہ بات سرِ عام تیر رہی تھی کہ سارے کے سارے ڈکیت ابھیلاش پور کے ہی تھے اور تو اور ان میں ایک باپ بیٹے کی جوڑی بھی شامل تھی۔

اگلے دن رادھے شیام کے گھر کی پچھلی دیوار کھودی ہوئی پائی گئی۔ صبح دیکھا تو وہاں مٹی کے پرانے برتنوں کے ٹکڑے ملے اور دو چار چاندی کے سکے بھی۔ اگلے دن رام جس کا پچھواڑا کھدا ہوا تھا۔ وہاں صبح سونے کا ایک سکہ گرا ہوا ملا۔ حالت یہ ہوئی کہ روز کسی نہ کسی طرف سے چلاہٹ مچتی کہ کوئی اس کا گھر کھود رہا ہے۔ اور جب تک لوگ وہاں پہنچتے تب تک کسی دوسرے کا اگواڑا پچھواڑا کھد جاتا۔ پھاوڑے اور کدالوں کا استعمال بدل گیا تھا۔ اب وہ کھیتوں میں نہیں گھروں میں چل رہے تھے۔

ادھر کاہنوں کی اپنی دنیا تھی جو ہمارے پیچھے پیچھے کام کر رہی تھی۔ مل کہ اب اس نے ہمارے آگے آگے چلنا شروع کر دیا تھا۔ کئی کاہنوں نے بتایا کہ پورے قلعے کی ہی کھدائی کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر رکھوالوں کی حمایت حاصل ہو جائے تو کم کھدائی سے بھی کام چل سکتا ہے۔ لیکن یہاں رکھوالے بہت زیادہ ہیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں۔ ان میں سے ہر کسی کا ایک الگ مطالبہ ہے جسے پورا کرنا ہی پڑے گا۔

یہ شرطیں بے حد عجیب و غریب تھیں۔ کہیں بیٹے کی قربانی مانگی جا رہی تھی کہیں بیٹی کی۔ کہیں بیٹی کی پہلی ماہواری کا خون مانگا جا رہا تھا تو کہیں پہلی ہم بستری کا۔ اسے ہندوؤں سے گائے کی قربانی چاہیے تھی، مسلمانوں سے سور کی۔ کہیں وہ پڑوسی کے بچے کی بلی مانگ رہا تھا تو کہیں کوئی اپنے ہی کسی اپاہج بچے کی قربانی دے کر دولت مند ہونے کا خواب دیکھ رہا تھا جن کی کہ ابھیلاش پور میں کوئی کمی نہیں تھی۔

بہت دھن تھا لیکن بغیر کچھ نقصان اٹھائے، بنا کسی شرمناک فعل میں ملوث ہوئے اس کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی مل پانا معجزہ تھا۔ اور ہم کسی بھی قیمت پر یہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھے۔ ہمیں وہ ساری دولت چاہیے تھی، بھلے ہی وہ کسی بھی قیمت پر کیوں نہ ملے۔

رکھوالوں کی رُوحیں ڈھائی سو سال سے سو رہی تھیں۔ ڈھائی سو سال پرانی نیند نے ان کے اندر حرص

کا ساگر بھر دیا تھا۔ ان کی ہوس انتہا تک پہنچی ہوئی تھی۔ وہ رُوحیں اپنی ان ساری خواہشوں کی آبیاری چاہتی تھیں۔ لیکن ان کے پاس بدن نہیں تھا۔ انہیں ہمارا جسم چاہئے تھا۔ اس کے بعد ان کی ساری شرطیں معاف تھیں کیوں کہ بدن ملتے ہی وہ خود اتنی مضبوط ہو جانے والی تھیں کہ وہ اپنا من چاہا کچھ بھی حاصل کر لیتیں۔

ہم نے اپنی سمجھ بوجھ پہلے سے ہی ان کے نام کر رکھی تھی۔ بدن دینے میں ہمیں بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ اس کے بعد چاروں طرف وہ ہاہا کار مچی کہ آس پاس کے دیہاتوں کے لوگ بھی اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ کچھ بھی انہونا کسی بھی لمحے وقوع پذیر ہو جاتا۔ رات کے وقت ایک دن نعرہ گونجا، ''آج رات جو سوئے گا پتھر کا ہو جائے گا۔'' نیند ویسے بھی آج کل کسے آ رہی تھی! ہم ایک بوکھلائی ہوئی جلد بازی کے ساتھ باہر آ گئے۔ چاروں طرف بے حد دھیمے لہجے میں عجیب و غریب آوازیں تیر رہی تھیں۔ جیسے کراہٹ، چیخ، سسکی اور بین ملا دیے گئے ہوں آپس میں۔

جب یہ آوازیں تھوڑی مدھم ہوئیں تو ہم اپنے گھروں میں لوٹے۔ ہمارے گھر بدل چکے تھے ہمیشہ کے لیے۔ گھروں میں سُرنگیں کھودی ہوئی تھیں۔ ان راستوں سے آیا بہت سارا دھن ہمارے گھروں میں تھا۔ اس کی چمک ہمیں اندھا کر رہی تھی۔ اسی چمک پر ہم نے اپنا جیون وار دیا تھا۔ پوری رات ہم اس دولت کا حساب لگانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن یہ ہماری استعداد سے باہر کی بات تھی۔

صبح ہوئی۔ کئی صبحیں ہوئیں۔ کئی راتیں بیت گئیں۔ ہم نے رات اور دن کا فرق کھو دیا۔ ہمیں یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ ہمارے پڑوسیوں کے گھروں میں کیا چل رہا ہے۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ خود ہمارے ہی گھروں میں ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ہم نہیں جان پائے کہ ان سُرنگوں میں ہمارے ہی گھروں سے کوئی سسک رہا ہے۔

کئی دنوں بعد ہمیں یہ سوجھی کہ ہم ان سُرنگوں میں بھی جھانکیں جن کے راستے یہ دولت مندی ہمارے گھروں میں آئی ہے۔ ان سُرنگوں میں کسی کی بیٹی تڑپ رہی تھی تو کسی کی بہن۔ بہت سے سر اور دھڑ کٹے ہوئے پڑے تھے۔ وہ ابھی بھی زندہ تھے۔ ایسے بھی تھے جو جلدی ہی پیدا ہونے والے تھے، لیکن اس سے پہلے ہی انہیں کھینچ باہر کیا گیا تھا۔ ان کی کراہٹوں سے پوری سُرنگ بھری ہوئی تھی۔ ابھی تھوڑا عرصہ پہلے تک وہ مجسم ہمارے ساتھ تھے۔ لیکن ہم انہیں پہچان ہی نہیں پائے۔ ان کی کراہیں ہمیں ایک مدہوش کرنے والے سنگیت کی طرح سنائی دیں۔ ہم سُرنگ میں آگے بڑھ گئے۔ اندر ایک غضب کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

خزانے کے نئے رکھوالوں کی تقرری ہو چکی تھی۔

سُرنگ کے اندر اور باہر

خزانے کے ساتھ بہت سارے قصے بھی باہر نکل آئے تھے۔ اور وہ ہمارے جیون میں اس طرح سے گھل مل گئے تھے کہ قصے اور حقیقت کے بیچ کا فرق ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ وہ دیوار جو دونوں کے بیچ ایک

متوازن دُوری بنا کر چلتی تھی وہ ہم نے کب کی منہدم کر دی تھی ۔ ہمارا خود پر کوئی زور نہیں بچا تھا ۔ اب یہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا کہ کب ہم قصوں کی دنیا میں رہیں گے اور کب حقیقت کی دنیا میں ۔ قصے بھی کئی تھے ۔ ہر آدمی ایک الگ قصے کی گرفت میں تھا ۔

یہ گرفت بہت بھیانک تھی ۔ ہم اس گرفت کے علاوہ باقی سب کچھ بھول گئے تھے ۔ ہم بغل سے گزر رہے اپنے پڑوسی تک کو نہیں پہچان پا رہے تھے ۔ ہم اپنے دوستوں کو بھول گئے تھے ۔ ہم اپنے ماں باپ بھائی بہن اولاد سب کو فراموش کرتے جا رہے تھے ۔ کبھی کبھار بھولے بھٹکے ہم انہیں پہچانتے بھی تو فوراً ہی کچھ اس طرح سے پھر بھول جاتے جیسے آدھی رات کو دیکھا گیا کوئی دُھندلا خواب ۔

لوگ ہوا میں ہی کسی قصے سے بات کرتے دکھائی دیتے ۔ خلاء میں تاکتے اور ٹھہاکا لگاتے ۔ ہوا میں نہ جانے کس سے ہاتھاپائی کرتے ۔ کئی بار دُکھی اور اداس ہوتے ، روتے ۔ تب بھی انہیں سچ مچ کے کسی دوست کی ضرورت نہ محسوس ہوتی ۔

میرے والد خود کو ہی اپنا باپ مان بیٹھے تھے ۔ ان کا میرے ساتھ رویہ بدل گیا تھا ۔ وہ مجھ سے ایسے مخاطب ہوتے تھے کہ میں ان کا بیٹا نہ ہو کر جیسے پوتا ہوں ۔ میرے والد درمیان میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے ۔ وہ کون سا قصہ تھا جو ان کو نگل گیا تھا ۔ کہ ان کے بدن میں باپ کے والد آ بیٹھے تھے ۔ ایسا کر کے شاید وہ اپنے باپ اور دادا سے مکالمہ کر رہے تھے، اس امید میں کہ وہ وہاں سے کچھ سراغ لے کر لوٹیں خزانوں کے بارے میں! یا پھر کیا پتہ ۔ انہیں کچھ معلوم بھی ہو جاتا تو کیا پتہ وہ کھدائی کہاں پر کرتے ، عہد حاضر میں یا پھر انہیں قصوں کی دنیا میں ۔

بلدیو مسر نے خزانے سے ملے ہوئے دھن سے ایک چمچماتی کار خریدی ۔ جب وہ کار لے کر سُرنگ سے باہر نکلے تو اپنے گھر کا راستہ ہی بھول گئے ۔ پورے ابھیلاش پور میں ہارن بجاتے ہوئے انہوں نے بیسیوں چکر کاٹے ۔ کئی جگہوں پر اتر کر ہوا میں نہ جانے کن لوگوں سے راستہ پوچھا لیکن انہیں اپنے گھر کا راستہ نہیں ملا تو نہیں ملا ۔ وہ ابھی بھی ہارن بجاتے ہوئے چکر پر چکر کاٹ رہے ہیں اور نہ جانے کس کس سے اپنے گھر کا راستہ پوچھ رہے ہیں ۔

ان کا گھر ان کے انتظار میں کئی سالوں سے بند پڑا ہے ۔ دہلیز اور آنگن میں جھاڑ جھنکاڑ اُگ آئے ہیں ۔ آنگن میں ایک نہ جانے کون سا پیڑ اُگ آیا ہے جس کی ڈالیوں پر پھلوں کی طرح چمگادڑ لٹکتے رہتے ہیں ۔ اس گھر کی طرف کوئی نہیں جاتا ۔ لوگوں نے اسے آسیب زدہ گھر مان لیا ہے ۔

وہی کیا پورا کا پورا ٹیلا ہی آسیب زدہ مان لیا گیا ہے ۔ اب ٹیلے پر صرف وہی لوگ آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے خزانوں والے قصوں کی دنیا میں ابھی بھی زبردست آمد و رفت بنا رکھی ہے ۔ وہ کسی کو بھی نہیں پہچانتے ۔ ہمارے پاس سے نہ جانے کیا بڑبڑاتے ہوئے نکل جاتے ہیں اور ہماری طرف دیکھتے

بھی نہیں۔ ہمارے 'رام رام' اور 'سلام' کا جواب نہیں دیتے۔ ان کے لیے ہم اور ہماری دنیا غائب ہو چکے ہیں۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔

میرے جیسے جو لوگ قصوں کی دنیا سے نکلنے میں کامیاب رہے یا کسی دوسرے قصے کے ذریعہ ہی باہر کھینچ لیے گئے، ان سب نے ٹیلا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ کچھ نے اپنے گھروں کو گرا دیا۔ کچھ نے انہیں جیسے کا تیسا رہنے دیا۔ زیادہ تر تو پہلے ہی کھودے پاٹے جا چکے تھے۔

ٹیلا اس زمانے کے مقابلے میں بہت زیادہ ویران دکھائی دیتا ہے جب کہ رام ابھیلاش نے اس پر اپنا گھر بنایا تھا۔ ٹیلے پر نئے بنے کھنڈروں کے بیچ تمام جھاڑ جھنکاڑ اُگ آئے ہیں۔ اس طرف دیکھنا ہی ایک ڈراؤنے احساس سے بھر دیتا ہے۔ راتوں کو ابھی بھی وہاں سے عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں جو ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ ان آوازوں میں ایک پاگل کشش ہے۔

سُرنگ میں جانے سے بچے ہوئے لوگ آس پاس کے دیہاتوں اور شہروں میں پھیل گئے ہیں۔ کئی نئے ابھیلاش پور بسنے کی راہ پر ہیں۔ آس پاس کے تمام لوگ جنہوں نے خود کو خزانوں کی جان لیوا کشش سے بچا رکھا تھا ہم پر ہنستے ہیں۔ تھوڑی دیر کی ایک شرمندگی بھری خاموشی کے بعد ہم بھی ان کے ساتھ ہنسنے لگتے ہیں۔

☆☆☆☆

مارگریٹ ایٹوڈ

انگریزی سے ترجمہ: اعظم ملک

خوشگوار اختتام

جان اور میری کی ملاقات ہوتی ہے۔
بعد میں کیا ہوتا ہے؟
اگر آپ خوشگوار اختتام چاہتے ہیں تو حصہ الف پڑھیے۔

(الف)

جان اور میری کو ایک دوسرے سے پیار ہو جاتا ہے اور وہ شادی کر لیتے ہیں؛ وہ دونوں اچھی اور سود مند ملازمتیں کر رہے ہیں، جو ان کے لیے سرخوشی اور مسابقت کا باعث ہیں۔ وہ ایک خوبصورت مکان خرید لیتے ہیں۔ زمین کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔

ایک ساتھ رہتے ہوئے جب وہ خود کو بچوں کی پرورش کے قابل سمجھتے ہیں تو ان کے دو بچے ہوتے ہیں، جن پر وہ دونوں دل جان سے فدا ہیں۔ بچوں کا مستقبل روشن ہے۔ جان اور میری کی جنسی زندگی بھی نشاط انگیز اور مسابقت بھری ہے۔ ان کے بہت سے اچھے دوست ہوتے ہیں۔ وہ سب موج مستی بھری چھٹیاں گزارنے ایک ساتھ باہر گھومنے جاتے ہیں۔ آخری عمر میں وہ اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی بہت سی خواہشات ہیں جو انھیں جینے کی ترغیب اور تحریک دیتی رہتی ہیں۔ بالآخر ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ کہانی یہیں ختم ہوتی ہے۔

(ب)

میری کو جان سے عشق ہو جاتا ہے لیکن جان میری سے محبت نہیں کرتا۔ وہ میری کے جسم کا استعمال صرف خود غرضی، کامل لطف اندوزی اور خواہشِ نفس کو مطمئن کرنے کے لیے کرتا ہے۔ وہ ہفتے میں دو بار، اس سے ملاقات کے لیے، اس کے مکان پر آتا ہے۔ مریم اس کے لیے رات کا کھانا بناتی ہے لیکن آپ کو لگے گا کہ جان اسے رات کا کھانا کھلانے کے لیے کہیں باہر لے جانے کے قابل بھی نہیں سمجھتا ہے۔ جب وہ شکم سیر ہو لیتا ہے، تو میری کے بدن کو بھنبھوڑتا ہے اور سو جاتا ہے۔ ادھر میری سارے برتن دھوتی ہے تا کہ جان، گندے

برتنوں کو دیکھ کر یہ نہ سوچے کہ وہ گھر کو صاف ستھرا نہیں رکھتی۔ اس کے بعد وہ اپنے ہونٹوں پر سُرخی لگاتی ہے تا کہ جان جب بیدار ہو تو وہ اسے خوبصورت لگے۔

لیکن جب جان جاگتا ہے تو وہ میری کی طرف دیکھتا تک نہیں بل کہ وہ اپنے موزے، جانگیہ، پتلون، قمیص، ٹائی اور اپنے جوتے پہننے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس نے ان چیزوں کو جس ترتیب سے اتارا تھا، اس کی اُلٹی ترتیب سے، انھیں پہن رہا ہے۔ وہ کبھی میری کے کپڑے نہیں اتارتا، وہ خود انھیں اتار لیتی ہے۔ وہ ایسی اداکاری کرتی ہے، جیسے وہ یہ سب کرنے کے لیے بیتاب ہو۔ وہ یہ سب اس لیے نہیں کرتی کہ اسے یہ جنسی کھیل اچھا لگتا ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اصل میں میری چاہتی ہے کہ جان کو ایسا لگے کہ اسے یہ سب کرنے میں مزہ آتا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ اگر وہ دونوں اکثر ایسا کریں گے تو جان کو وہ اچھی لگنے لگے گی۔ پھر جان کا، اس کام کے لیے، اس پر انحصار ہو جائے گا اور پھر وہ دونوں شادی کر لیں گے۔ لیکن جان بغیر شب بخیر کہے گھر سے باہر چلا جاتا ہے۔ تین دن بعد وہ شام چھ بجے دوبارہ میری کے مکان پر آتا ہے اور پھر وہ دونوں سابقہ کارروائی کو ویسے ہی دہراتے ہیں۔

میری ردِعمل میں ٹوٹ جاتی ہے۔ رونے سے اس کے چہرے کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ تمام لوگ یہ بات جانتے ہیں۔ میری خود بھی یہ جانتی ہے لیکن وہ روتی رہتی ہے، ضبط نہیں کر پاتی۔ جب اس کے دفتر میں لوگوں کو اس بات کا پتا چلتا ہے تو میری کی خواتین دوست اسے کہتی ہیں کہ جان انسان نہیں؛ چوہا ہے، سور ہے، کتا ہے۔ وہ میری کے قابل نہیں ہے۔ لیکن میری ان کی باتوں پر یقین نہیں کرتی۔ وہ سوچتی ہے کہ جان کے اندر ایک دوسرا جان موجود ہے جو بہت اچھا ہے۔ اگر پہلے والے جان پر زور دیا جائے تو وہ دوسرا جان آشکار ہو جائے گا، اس طرح جیسے لاروے میں سے تتلی باہر آ جاتی ہے، جیسے تماشے والے صندوق سے جمورا باہر نکل آتا ہے، جیسے چھلکے میں سے آلو بخارا باہر آ جاتا ہے۔

ایک شام جان کھانے کے بدذائقہ ہونے کی شکایت کرتا ہے۔ اس سے پہلے اس نے کبھی کھانے پر تنقید نہیں کی ہوتی۔ میری اس سے دلبرداشتہ ہو جاتی ہے۔

میری کی دوست اسے بتاتی ہیں کہ انھوں نے جان کو ریستوران میں میج نام کی کسی اور لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے۔ میج بھی میری کو چوٹ نہیں پہنچا پاتی؛ جو بات واقعی اس کا دل توڑ دیتی ہے وہ ہے ریستوران۔ جان میری کو کھانا کھلانے کے لیے کبھی کسی ریستوران میں نہیں لے گیا۔ میری بہت سی نیند کی گولیاں اور اسپرین جمع کرتی ہے اور پھر وہ ساری گولیاں آدھی بوتل سفید شراب کے ساتھ نگل جاتی ہے۔ وہ وہسکی کا سہارا نہیں لیتی۔ آپ اسی حقیقت سے اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس طرح کی عورت تھی۔ وہ جان کے لیے ایک رُقعہ چھوڑ جاتی ہے۔ وہ امید کرتی ہے کہ جان اسے اس حالت میں دیکھ لے گا اور بروقت ہسپتال لے جائے گا۔ اسے لگتا ہے کہ جان بعد میں اپنے کیے پر پچھتائے گا اور پھر وہ دونوں شادی کر لیں گے، لیکن ایسا

نہیں ہوتا اور میری کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

جان میج سے بیاہ کر لیتا ہے اور پھر ہر چیز ویسے ہی چلتی ہے جیسی 'الف' میں دکھائی گئی ہے۔

(ج)

ادھیڑ عمر کے جان کو میری سے پیار ہو جاتا ہے۔ میری صرف بائیس سال کی ہے۔

میری کو جان سے ہمدردی ہوتی ہے کیوں کہ وہ اپنے بالوں کے جھڑنے سے فکر مند رہتا ہے۔ حالاں کہ میری اس سے محبت نہیں کرتی پھر بھی وہ جان کے ساتھ اپنی راتیں بسر کرتی ہے۔ وہ اپنے دفتر میں جان سے ملی تھی۔ میری خود جیمس نام کے شخص سے محبت کرتی ہے۔ جیمس کی عمر بھی بائیس سال ہے لیکن وہ ابھی گرہستی میں پڑ کر نہیں بسنا چاہتا۔

اس کے برعکس جان بہت پہلے ہی بس چکا تھا، یہی بات اسے ستاتی رہتی ہے۔ جان کے پاس ایک مستقل اور قابل قدر کام ہے اور وہ اپنے شعبے میں ترقی کر رہا ہے۔ لیکن میری اس سے متاثر نہیں ہے۔ وہ جیمس سے متاثر ہے جس کے پاس ایک موٹر سائیکل اور موسیقی کے کیسٹوں کا شاندار بھنڈار ہے۔ لیکن جیمس اکثر اپنی موٹر سائیکل پر شہر سے باہر گھومنے نکل جاتا ہے کیوں کہ وہ بندھن سے آزاد ہے۔ لڑکیوں کے لیے آزادی کا وہی مطلب نہیں ہوتا۔ اس لیے میری جمعرات کی شام جان کے ساتھ بسر کرتی ہے۔ جان کو صرف جمعرات کی شام کو ہی فرصت ملتی ہے۔

جان پہلے ہی میج نام کی خاتون سے شادی کر چکا ہے اور ان کے دو بچے ہیں۔ ان کے پاس ایک خوبصورت مکان ہے جسے انھوں نے مکانوں کی قیمت بڑھ جانے سے ٹھیک پہلے خریدا تھا۔ ان کے بہت سے مشاغل ہیں جو پُر ترغیب اور مبارزت طلب ہوتے ہیں، جب ان کے پاس وقت ہوتا ہے۔ جان اکثر میری کو بتاتا ہے کہ وہ جان کے لیے کتنی اہم ہے لیکن وہ اپنی بیوی کو نہیں چھوڑ سکتا کیوں کہ کسی رشتے کے ساتھ وابستگی آخر وابستگی ہے۔ وہ اس کے بارے میں ضرورت سے زیادہ زور دیتا ہے اور میری کو اوب ہونے لگتی ہے۔ لیکن زیادہ عمر کے مرد اپنے تجربے کی وجہ سے آپ کو زیادہ مطمئن کر سکتے ہیں۔ لہٰذا مجموعی طور پر میری کا وقت اچھا ہی گزرتا ہے۔

ایک دن جیمس اپنی موٹر سائیکل پر فراٹے سے آتا ہے۔ اس کے پاس کیلی فورنیا میں بنی بہت نشیلی دیسی شراب ہوتی ہے۔ وہ شراب جیمس اور میری کو اتنی چڑھ جاتی ہے جتنا آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ نشے کی حالت میں دونوں ہم بستر ہو جاتے ہیں۔ سب کچھ مدہوش سا لگنے لگتا ہے، لیکن تبھی وہاں جان آ پہنچتا ہے جس کے پاس ہمیشہ میری کے مکان کی ایک چابی ہوتی ہے۔ وہ ان دونوں کو مباشرت کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ اس کے حسد کرنے کی کوئی صورت بمشکل ہی بنتی ہے کیوں کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے، میج اس کی بیوی ہے

۔لیکن اس کے باوجود، ان دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر وہ پریشانی میں ڈوب جاتا ہے۔ اب وہ ادھیڑ عمر ہے، اور آئندہ دو سالوں میں، وہ انڈے کی طرح گنجا ہو جائے گا۔ اس سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ وہ نشانہ بازی کی مشق کے بہانے ایک چھوٹی سی بندوق خریدتا ہے۔ یہ اس پلاٹ کا کمزور حصہ ہے لیکن اس سے، ہم بعد میں نپٹ سکتے ہیں۔ پھر وہ جیمس اور میری کو مار ڈالتا ہے اور خودکشی کر لیتا ہے۔

عدت گزارنے کے بعد میج فریڈ نامی ایک سمجھدار آدمی سے شادی کر لیتی ہے۔ اس کے بعد سب کچھ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ’الف‘ میں دکھایا گیا ہے، صرف نام تبدیل ہو جاتے ہیں۔

(د)

فریڈ اور میج کے درمیان کوئی امر دشوار نہیں ہے۔ وہ انتہائی اچھی طرح ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارتے ہیں اور اگر چھوٹی موٹی مشکلات آ بھی جاتی ہیں تو وہ آسانی سے حل کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کا دلکش مکان ساحل سمندر پر ہے اور ایک دن ایک بڑی سمندری لہر اس مکان تک پہنچ جاتی ہے۔ اس سے غیر منقولہ جائیدادوں کی قدر میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ بقیہ کہانی اس بارے میں ہے کہ یہ خطرناک لہر کس وجہ سے آئی اور وہ لوگ اس سے کیسے محفوظ رہے۔ وہ لوگ تو بچ جاتے ہیں لیکن ہزاروں دوسرے لوگ ڈوب جاتے ہیں۔ فریڈ اور میج نیک ہیں اور خوش قسمت بھی۔ آخر میں اونچی جگہ پہنچ کر وہ ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں، بھیگے اور ٹپکتے ہوئے لیکن شکر گزار بھی۔ اس کے بعد سب کچھ ’الف‘ جیسا ہی ہوتا ہے۔

(ج)

جی ہاں، لیکن فریڈ کو دل کا مرض لاحق ہوتا ہے۔ بقیہ کہانی اس بارے میں ہے کہ وہ دونوں اس وقت تک کتنے مشفق اور سمجھدار رہتے ہیں جب تک فریڈ کی موت نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد ’الف‘ کے آخر تک میج خود کو خیراتی کاموں کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو آپ اسے ’میج‘، ’کینسر‘، ’قصوروار اور پریشان‘ وغیرہ کہہ سکتے ہیں۔

(چ)

اگر آپ کو یہ سب زیادہ ہی عامیانہ لگتا ہے تو آپ جان کو ایک انقلابی اور میری کو ایک جوابی مخبر بنا دیں اور دیکھیں کہ ایسا کر کے آپ کس حد تک جا پائیں گے۔ یاد رکھیے، یہ کینیڈا ہے۔ اس سب کے باوجود، آپ کی تسلی ’الف‘ پر ہی جا کر ہوگی، حالانکہ اس کے درمیان میں آپ کو شاید پُر جوش شہوانی تعلقات، غل غپاڑے والی رزمیہ داستان مل جائے، جو کسی حد تک ہمارے عہد کا روزنامچہ ہو گی۔

آپ کو اس حقیقت کا سامنا کرنا ہی ہوگا کہ اختتام کو آپ کسی بھی طرح سے تراش کر دیکھیں، وہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کسی بھی دوسری قسم کے اختتام کو دیکھ کر جھانسے میں نہ آیئے، وہ سب کے سب بناوٹی ہوتے ہیں۔ یا تو وہ دھوکہ دینے کے لیے ارادتاً بد خواہی کی نیت سے جھوٹے بنائے گئے ہوتے ہیں یا اگر واضح جذباتیت کے تحت نہیں تو وہ انتہائی رجائیت پسندی سے مغلوب ہو کر تراشے گئے ہوتے ہیں۔

واحد مستند اختتام وہ ہے جو یہاں دیا جا رہا ہے:

جان اور میری مر جاتے ہیں۔

جان اور میری مر جاتے ہیں۔

جان اور میری مر جاتے ہیں۔

اختتام تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آغاز ہمیشہ زیادہ مزہ دیتا ہے۔ سچے نقاد، تاہم، درمیانی حصے کے قدردان جانے جاتے ہیں کیوں کہ اس حصے کے بارے میں کچھ بھی کرپانا انتہائی مشکل ہے۔

پلاٹ کے بارے میں جو بھی باتیں کہی جا سکتی ہیں وہ یہی ہیں، بہر حال یہ محض ایک چیز کے بعد دوسری چیز ہے۔ ایسے، ایسے اور ایسے۔

اب کیسے اور کیوں کا استعمال کر کے دیکھیے۔

☆☆☆☆

داراعبداللہ

انگریزی سے ترجمہ: ادریس بابر

کوڑا کرکٹ کی یاد

عام سی بات ہے
چیزوں کی ری سائیکلنگ
ہمارے یہاں جرمنی میں

جیسے یہی، تمہارے کھانے پینے کا چمچ
ممکن ہے اس سے پہلے کہیں رہ چکا ہو
کسی شامی جنگجو کی بندوق کی نالی
یا کسی بانکے کے کانوں کی بالی
یا کسی گھوڑے کے سموں کی جالی
وہ بھی ڈنمارک میں
سوچو تمہارے بعد کیا کچھ بنے گا تمہارا

لفظوں کا دھواں

شیشے کا ایک بڑا جار
کاغذ کی کترنوں سے لبالب

ایک مٹھی بھر پرچیاں نکالو
ترتیب دو، ان پہ لکھے لفظ
سنائیں گے تمہیں کہانی تمہاری

یاد کرو، یہ وہی تو لفظ ہیں
جو تم عام طور سے دہراتے پھرتے ہو

جار کو آگ لگانے کی غلطی نہ کرنا
دم گھٹ کے مر جائیں گے
لوگ، اپنے لفظوں کے ہاتھوں

☆☆☆☆

مونا کریم

انگریزی سے ترجمہ: ادریس بابر

ایک مجسمے کی موت

تیئیس برس کی ہو تم
اپنے درماندہ خاندان کے ساتھ
ہوائی اڈوں کے چکر لگا کر ہلکان ہو رہی ہو
جہاز میں تمھیں سیٹ ملتی ہے سیاہ فام فوجیوں کے درمیان
جنھیں سوتے جاگتے ان عراقیوں کے خواب آتے ہیں
جن کو انھیں موت کے گھاٹ اتارنا پڑا
سولہ گھنٹے کے اندر دو بار گنوا دیتی ہو تم اپنا وطن
ایک ایسا ملک جسے کوئی نہیں چاہنے والا

یونیورسٹی رکھ لیتی ہے تمھیں کمترین اجرت سے کمتر معاوضے پہ
تم بتاتی ہو طلبہ کو عورتوں کے بارے جن کی جبری شادیاں کر دی گئیں
مردوں کے بارے میں جو دریافت کرنے سے قاصر رہے اپنی ہم جنس پرستی
ہر کلاس یوں لیتی ہو تم جیسے ویزا کے لیے انٹرویو دے رہی ہو

وہاں پیچھے چھوڑ تم آئی ہو ایک زندگی جو مر رہی ہے ایک مجسمے کی موت
بیچ میں رہ گئی ایک اور زندگی جو سکائیپ سے ہٹنے کا نام نہیں لیتی
یہاں یہ دڑبے جو موزوں ہیں چوہوں کے لیے، ڈبوں کے لیے، اور تمہارے لیے

اچھی طرح جانتی ہو تم
کہ اکیلا ہی دھڑکتا ہے دل تمہارا
کہ غصہ نہیں رہ سکتیں تم زیادہ دیر
کہ بہت سارے کام کر رہی ہو تم بہ یک وقت
کہ بدل سکتی ہے کوئی بھی چیزیں انتظار سے
کہ وعدے غرقابی سے نہیں بچ سکتے، سمندر عبور کرتے ہوئے

☆☆☆☆

مونا کریم

انگریزی سے ترجمہ: ادریس بابر

میں اور وہ

وہ
ایک تناور درخت ہے
میری روح کی گہرائیوں تک اترا ہوا

میں
ایک نازک پھول ہوں
اس کی ہتھیلی پر کھلا ہوا

میں طوفان کی آہٹ پر کان لگائے ہوئے ہوں
جو اسے جڑوں سے اکھاڑ پھینکے

وہ خزاں کی خاطر دن گن رہا ہے
تا کہ مجھے مرجھایا ہوا دیکھ سکے

☆☆☆☆

دارین طاطور

انگریزی سے ترجمہ: ادریس بابر

مزاحمت

مزاحمت کرو، میرے لوگو، ان کے خلاف مزاحمت کرو
یروشلم میں سیے میں نے اپنے زخم
اور روئے اپنے دکھ
اور اپنی روح ہتھیلی پر لیے پھری
ایک عرب فلسطین کے لیے
میں نہیں آنے والی "پرامن" سمجھوتے کے دام میں
میں نہیں جھکانے چلی اپنے علم
جب تک میں انہیں نکال باہر نہ کروں اپنی دھرتی سے
یوم-معلوم تک کے لیے

اٹھو میرے لوگو اٹھو ان کے مخالف
روکو آبادکاروں کی ستم گری
پیروی کرو شہیدوں کے قافلے کی
پرزے بکھیر دو بے وقار دستور کے
جس نے طاری کی ہم پر پسماندگی اور لاچاری
جس نے محروم رکھا ہمیں انصاف سے
انہوں نے زندہ جلایا معصوم بچوں کو
اور عورتوں کو بھرے مجمع میں ذلیل کیا

جوانوں کو سب کے سامنے گولی سے بھون دیا

لڑو میرے لوگو لڑ جاو ان سے
کھڑے ہو کے نو آبادیاتی غلامی کے نفاذ کو ٹھکرا دو
کوئی پروا نہ کرو ان کے ایجنٹوں کی
جو تمہیں سبز باغ دکھاتے رہے 'پر امن تصفیے' کے
مت ڈرو شک کی ماری زبانوں سے
پختہ تر ہے وہ یقین جو تمہارے دلوں میں ہے
جب تک جاری رہے تمہاری مزاحمت
اس سرزمین کے لیے
بہت چکھا ہے جس نے فتح و شکست کا ذائقہ
سنو علی کی پکار مقبرے سے
اٹھ کھڑے ہو میرے باغی لوگو
میری لکھتیں پھیلائیں تمہاری اگربتیاں
بدلے کی آنچ میں سلگیں میری ہڈیاں
مزاحمت کرو، میرے لوگو، مزاحمت کرو ان کے خلاف

☆☆☆☆

دارین طاطور

انگریزی سے ترجمہ: ادریس بابر

قفس اداس ہے۔۔۔

جیل میں ہوئی میری ملاقات
طرح طرح کے لوگوں سے
خونی قاتل اور پیشہ ور ڈکیت
جیب کترے اور نوسرباز
کھسکے ہوئے اور گھومے ہوئے
بھک مرے اور بھکاری
بے گناہ اور ان پر اعتبار نہ کرنے والے

انھی میں بعض ملے مجھے
وطن کے سچے عاشق
وہ جنھوں نے انکار کیا
ظلم کے ساتھ چلنے سے
عمر کے ساتھ بڑھتی گئی ان کی اداسی
دباو سے اور نمو پاتی ہوئی
جیسے نمکین محلول میں گلاب

ایک ذرا خوف کھائے بغیر
گلے لگایا انھوں نے محبت کو
واشگاف انداز میں اعلان کر ڈالا

دیس سے ہمارا پریم کوئی ختم ہونے والا نہیں!
اسی پر سزا سنائی گئی انہیں
جس نے کر دیا انہیں مکمل آزاد

قید خانہ تو بنا ہی عاشقوں کے لیے ہے، نا
یوں کریدتی رہی میں اپنی روح کو
مایوسی اور بے یقینی کی گھڑیوں میں

ہاں تو کیا ہے تمہارا جرم
اس سوال کی کوئی تک مجھے سمجھ نہ آئی
میں نے لکھا تھا موجودہ ظلم کے بارے میں
ایڑی سے چوٹی تک پہنا دیا گیا مجھے الزام

ایک شاعر ہوں میں، قید و بند
علوم و فنون کی سرزمین میں
لفظوں کو میرا جرم گردانا گیا
قلم آلۂ واردات قرار دیا گیا
روشنائی ----میرے دل کا لہو ----
اس کی چھینٹیں کافی رہیں ثبوت کے طور پہ
سنو، میری جان، جو منصف نے کہا
نظم پر الزام عائد کیا جاتا ہے
جرم میں ڈھل رہی ہے میری نظم
آزادی کے دیس میں
قید خانہ ٹھہرا فنکار کا ٹھکانہ

☆☆☆☆

اشرف فیاض

انگریزی سے ترجمہ: ادریس بابر

نظمیں

۱

گھومنے پھرنے کا تو اسے بہر طور حق حاصل نہیں
نہ جھومنے کا نہ لہرانے
رونے کا نہ گانے کا
کوئی حق نہیں اسے
کھڑکیاں کھولنے کا، ہوا لگوانے کا
تجدید کروانے کا
اپنے آنسوؤں کی
اپنی رائگانی کی

کتنی جلدی بھول جاتے ہو کہ تم ہو کیا
محض روٹی کا ایک ٹکڑا، اور بس!

۲

بے ضرر مائع ہے، پیٹرول سے نقصان نہیں
یہ اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑتا
سوائے ایک لکیر کے جسے خط۔ غربت کہتے ہیں

دیکھنا اس دن مزید چہرے بجھے ہوئے
دریافت ہوا جس دن ایک اور کنواں تیل کا

تب بخشی جائے گی تمہیں حیات۔ نو
تاکہ مزید تیل کھینچ تان کے نکال سکو
اپنے جی جان سے---دوسروں کے لیے
تم سے یہ پکا ہے وعدہ تیل کا---
---جہاں پاک

☆☆☆☆

آدم شیر

زکریا تامر: ایک تعارف

عربی کے اہم ترین ادیبوں میں سے ایک زکریا تامر ہیں جو دو جنوری انیس سو اکتیس عیسوی کو شام کے دارالحکومت دمشق میں پیدا ہوئے۔

زکریا تامر نہ صرف افسانہ نگاری کے لیے مشہور ہیں بل کہ انہیں بچوں کا کہانی کار بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے کہانیوں کی کئی کتابیں لکھی ہیں اور بڑوں کے لیے ان کی ننھی منی کہانیاں معنویت کے لحاظ سے بہت بڑی تسلیم کی جا چکی ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود کئی پرتیں لیے ہوتی ہیں۔ وہ طنزیہ مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے لیے لوک داستانوں کو بھی بنیاد بناتے ہیں۔ ان کے افسانے انسانوں کی ایک دوسرے کے ساتھ غیر انسانی حرکات کو عیاں کرتے ہیں۔

ان کی کہانیاں جو دراصل فلیش فکشن کہلاتی ہیں، سہل ممتنع کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اختصار اور جامعیت ان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ زکریا تامر کی کہانیاں پہلی بار انیس سو ستاون عیسوی میں شائع ہوئی تھیں اور اب تک کہانیوں کے گیارہ مجموعے، مضامین کی دو کتب اور بچوں کے لیے متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی کہانیوں کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ زکریا تامر کی کہانیاں کئی ممالک میں بطور نصاب بھی پڑھائی جا رہی ہیں۔ زکریا تامر کے افسانے اپنے عہد سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں۔ وہ سیاسی اور سماجی جبر کو اس فنکاری سے موضوع بناتے ہیں کہ ان کی کہانیاں شام کے ساتھ عرب ممالک اور دنیا بھر کے عام افراد کی کہانیاں بن جاتی ہیں۔

زکریا تامر اب لندن میں رہتے ہیں اور عمر کے اس حصے میں بھی اپنے عصر کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے شام میں بہتی خون کی نہر پر کھل کر لکھ رہے ہیں۔

☆☆☆☆

زکریا تامر

انگریزی سے ترجمہ: آدم شیر

مجسمہ

ایک عمر رسیدہ عورت، جس کی کمر جھکی ہوئی تھی، باغ میں گئی جہاں سارے درخت ٹنڈ منڈ تھے۔ وہ کھردرے چہرے والے دراز قامت آدمی کے پتھر سے تراشے بڑے مجسمے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس آدمی کا دایاں ہاتھ ہوا میں یوں اٹھا ہوا تھا کہ احترام اور خوف آتا تھا۔ یوں معلوم دیتا تھا کہ وہ اپنے نظر نہ آنے والے عقیدت مندوں کو جو اس کے سامنے جھکے ہوئے ہیں، اپنی رحمت سے نواز رہا ہے۔ ضعیف عورت اس کے سامنے بے پناہ خوف زدہ تھی، اتنی زیادہ کہ اس کی ٹانگوں میں ضعف آ گیا۔ وہ اس آدمی کو نظروں سے پاش پاش کر دینا چاہتی تھی جس نے اس کے شوہر اور بیٹوں کو قتل کیا تھا مگر اس کی آنکھوں میں موجود یاسیت اور سدا کی عاجزی نے ایسا نہ ہونے دیا۔ تب بوڑھی اماں کو محسوس ہوا کہ وہ سکڑ رہی ہے اور وہ سکڑتی رہی یہاں تک کہ نہ رہی۔ اس کے اردگرد موجود ہر شے، عمارتیں اور لوگ بھی اتنے سمٹے کہ غائب ہو گئے۔ کچھ باقی نہ رہا مگر سخت گیر آدمی کا مجسمہ اور پرندے جو اس پر گندگی پھیلا کر خوش ہوتے ہیں۔

(یہ کہانی زکریا تامر کی کتاب تکسیر رکب سے لی گئی ہے جس کا انگریزی میں Breaking-Knees کے عنوان سے فلسطینی پروفیسر ابراہیم مہوی نے ترجمہ کیا۔)

دوسرا گھر

خالد الحلب نے درشت جج کے سامنے دوپہر تک ذلت آمیز انتظار کو بھولنے کا انتظام کیا۔ جج نے اسے کرایہ کا مکان خالی کرنے کا حکم دیا تھا جس میں خالد بچپن سے رہ رہا تھا۔ وہ اس وقت عاجزی اور مسرت سے بھر گیا جب اس نے دوپہر کی نماز کے بعد کسی کو کہتے سنا کہ جنت تمام ماؤں کے قدموں تلے ہے۔ خالد گھر لوٹتے وقت اپنے ساتھ کدال اور بیلچہ لایا اور دالان میں لکڑی کی کرسی پر بیٹھی اپنی ماں کے قدموں کے نیچے کھدائی شروع کر دی۔ ماں کی چیخیں کسی طرح رکنے کا نام نہ لے رہی تھیں مگر خالد کئی گھنٹے کھودتا رہا لیکن جب اسے سلی مٹی کے سوا کچھ نہ ملا تو اس نے غصے کے ساتھ کدال اور بیلچہ پرے پھینک دیا۔ اس نے ماں کو میٹھی چائے کی پیالی دی جس میں نیند لانے والا مادہ انتہائی مقدار میں ملا ہوا تھا۔ خالد کی ماں چند منٹ کے اندر سو گئی تو خالد نے کھودے ہوئے گڑھے میں ایک قالین اور دو تکیے رکھ دیے۔ اس نے ماں کو اٹھایا اور قالین پر لٹا دیا۔

پھر وہ تھکاوٹ سے ہانپتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا، بچی ہوئی چائے پی اور ماں کے ساتھ گڑھے میں لیٹ گیا۔ خالد نے ماں کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور آنکھیں بند کر کے قبر کا اندھیرا فوری چھانے کی دعا شروع کر دی۔۔۔

(مندرجہ بالا کہانی Another Home زکریا تامر کی کتاب الحصرم Sour Grapes مطبوعہ 2000ء میں شامل ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ابراہیم مہوی نے کیا تھا)

خاموش آدمی

زہیر صابری ایک عورت سے ملا۔ ہری شاخ پر کھلے سرخ پھول کی طرح خوبصورت عورت نے زہیر کو تھرتھراتی آواز میں کہا، ''میں تم سے پیار کرتی ہوں اور تمہارے سوا کبھی کسی کو چاہ نہیں سکتی۔'' سکتی مگر زہیر نے کہا، ''مجھے صرف اپنے مستقبل کی پرواہ ہے۔'' اور زہیر کو گردن پر ایک تکلیف دہ تھپڑ پڑا اس نے چونکتے ہوئے اردگرد دیکھا مگر تھپڑ مارنے والا نظر نہ آیا۔

زہیر کو دوبارہ تھپڑ پڑا جب اس نے ایک امیر آدمی کی خوش آمدی کہ ''وہ اس ملک میں سامنے آنے والا عظیم ترین آدمی ہے۔'' لیکن اس بار بھی مارنے والا نظر نہ آیا۔ زہیر کو تیسری بار چانٹا تب رسید ہوا جب زہیر نے ایک باریش آدمی کا احترام سے ہاتھ چوما اور دعا کی التجا کی۔ مگر کس نے اس کا منہ لال کیا، اس دفعہ بھی کچھ پتا نہ چلا۔

زہیر کو روزانہ کئی مرتبہ تھپڑ پڑے مگر اسے مارنے والا کبھی نظر نہیں آ سکا اور اس نے کسی سے ان خفیہ تھپڑوں کے متعلق بات بھی نہ کی کہ کوئی یقین نہیں کرے گا اور الٹا اسے پاگل ٹھہرایا جائے گا۔ اسے پورا یقین تھا کہ ہر کسی کو اس کی طرح تھپڑ پڑتے ہیں اور وہ بھی خاموش رہتے ہیں۔

(مندرجہ بالا کہانی Silent One زکریا تامر کی کتاب الحصرم Sour Grapes مطبوعہ 2000ء میں شامل ہے۔ انگریزی ترجمہ ابراہیم مہوی نے کیا تھا)

اندھا

شیخ محمود نے نوجوان شاگردوں کو کھڑکی سے جھانک کر آسمان دیکھنے کے لیے کہا تو شاگرد کھڑکی کی جانب لپکے، اور شیخ محمود نے ان سے پوچھا۔

''تم نے آسمان پر کیا دیکھا؟''

''ایک جہاز۔'' شاگردوں نے جواب دیا۔

"اچھی طرح دیکھو، اور کیا نظر آ رہا ہے؟" شیخ محمود نے سوال دہرایا۔

شاگردوں نے کہا، "ہمیں بادل کے چند ٹکڑے اور ایک سورج نظر آیا۔"

شیخ محمود نے زور دے کر پوچھا، "تمہیں سورج، بادلوں اور جہاز کے علاوہ کچھ نظر آیا؟" تو شاگردوں نے دوبارہ آسمان کو دیکھا اور کامل یقین کے ساتھ بولے۔

"نہیں۔ سورج اور بادلوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا اور اب جہاز غائب ہو چکا ہے۔"

شیخ محمود نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا، "تم سب بے کار ہو۔ میں اندھوں کو پڑھاتا رہا جنہیں کچھ نظر نہیں آتا۔"

جب ننھے منے شاگرد سکول سے نکل کر گلی میں چل رہے تھے، انہیں خیال آ رہا تھا کہ وہ اندھے بھکاری ہیں جنہوں نے بھیک کے لیے ہر در پر دستک دی مگر ان کے لیے کوئی دروازہ نہ کھلا، اور انہوں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا لیکن انہیں بادلوں اور سورج کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔۔۔

(یہ کہانی زکریا تامر کے فیس بک پر موجود صفحے سے لی گئی۔ اس کا انگریزی ترجمہ مارلین ہیکر نے کیا تھا)

دریا کی خاموشی

اگلے وقتوں کی بات ہے کہ دریا باتیں کرتا تھا اور اسے بچوں سے گفتگو کرنا بہت پسند تھا جو پانی پینے اور ہاتھ منہ دھونے آتے تھے۔ وہ مذاق کرتا، "کیا زمین سورج کے گرد چکر کاٹتی ہے یا سورج زمین کے اطراف گھومتا ہے؟"

دریا درختوں کو اپنا پانی دے کر ان کے پتے ہرے کرتے ہوئے خوش رہتا، وہ گلابوں کو فراخ دلی سے پانی دیتا تاکہ وہ مرجھا نہ جائیں اور وہ پرندوں کو ہجرت سے پہلے طاقت کے لیے پانی پینے کی دعوت دیتا تھا۔ وہ پیاس بجھانے کے لیے آنے والی بلیوں سے اٹھکیلیاں کرتا، ان پر چھینٹے اڑاتا اور بلیوں کے پانی سے نکل کر خشک ہونے کے لیے زور زور سے ہلنے جلنے پر مسکراتا تھا۔

پھر ایک دن جذبات سے عاری چہرے والا آدمی آیا جس کے پاس تلوار تھی۔ اس نے بچوں، درختوں، گلابوں، پرندوں اور بلیوں کو دریا سے پانی نہ لینے دیا اور کہا کہ یہ دریا صرف اس کا ہے۔

دریا کو غصہ آیا اور وہ چلایا، "میں کسی کی ملکیت نہیں۔"

ایک عمر رسیدہ پرندہ بولا، "کوئی جان دار دریا کا سارا پانی اکیلے نہیں پی سکتا۔"

لیکن تلوار والے آدمی نے دریا کے چلانے اور پرندے کے الفاظ پر توجہ نہ دی، وہ بے ڈھنگی اور کرخت آواز میں بولا، "جو دریا سے پانی پینا چاہتا ہے، اسے سونے کا ایک ٹکڑا دینا پڑے گا۔"

پرندوں نے کہا، ''ہم تمہارے لیے انتہائی مسحور کن گیت گائیں گے۔''

آدمی بولا، ''مجھے سونا چاہیے موسیقی نہیں۔''

درختوں نے صدا دی، ''ہم تمہیں اپنے پہلے پہلے پھل دیں گے۔''

آدمی نے کہا، ''میں تمہارے پھل کھا لوں گا جب میرا جی چاہے گا، مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔''

گلابوں نے بتایا، ''ہم تمہیں اپنا سب سے خوبصورت گلاب دیں گے۔''

آدمی نے مضحکہ اڑایا، ''اور کیا ایک خوبصورت گلاب اچھا ہے؟''

بلیوں نے کہا، ''ہم تمہارے لیے پیارے پیارے کھیل کھیلیں گی اور رات کو تمہاری پہرہ داری کریں گی۔''

آدمی بولا، ''مجھے تمہارے کھیلوں سے نفرت ہے اور میری تلوار ہی اکلوتی پہرے دار ہے جس پر میں اعتماد کرتا ہوں۔''

بچوں نے کہا، ''تم جو کہو گے ہم وہی کریں گے۔''

آدمی نے جواب دیا، ''تم کسی کام کے نہیں، تمہارے پاس طاقتور بازو نہیں۔''

اس پر وہ سارے پریشان اور غمزدہ ہو گئے مگر آدمی بولتا رہا، ''اگر تم دریا سے پانی پینا چاہتے ہو تو مجھے سونا دو۔''

ایک ننھا پرندہ بہت پیاسا تھا، وہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے دریا سے پانی پینے کا خطرہ اٹھا لیا جس پر آدمی لپکا، پرندے کو پکڑا اور اپنی تلوار سے قتل کر دیا۔

گلاب روئے۔ درخت روئے۔ پرندے روئے۔ بلیاں روئیں اور بچے روئے۔ ان میں سے کسی کے پاس سونا نہیں تھا اور ان میں سے کوئی بھی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا لیکن تلوار والے آدمی نے انہیں دریا سے پانی نہ پینے دیا۔ گلاب مرجھا گئے۔ درخت سوکھ گئے۔ پرندے اڑ گئے۔ بلیاں اور بچے بھی چلے گئے۔ دریا غصے میں تھا اور اس نے کبھی نہ بولنے کا فیصلہ کیا۔

لیکن جلد ہی وہ آدمی آئے جو بچوں، بلیوں، گلابوں، درختوں اور پرندوں سے پیار کرتے تھے۔ انہوں نے تلوار والے آدمی کو ہمیشہ کے لیے بھگا دیا اور دریا دوبارہ آزاد ہو گیا ہر کسی کو اپنا پانی دینے کے لیے مگر وہ خاموش رہتا ہے۔ وہ تلوار والے آدمی کی واپسی کے ڈر سے لرزتا رہتا ہے۔۔۔

(زکریا تامر نے یہ کہانی بچوں کے لیے لکھی تھی اور اس کا انگریزی ترجمہ why did the river stop talking? کے نام سے ہوا۔ بچوں کے لیے لکھی کہانیوں کے مجموعے کا نام بھی یہی تھا۔ اس کہانی کا ترجمہ گلیشن کلارک نے کیا تھا۔)

☆☆☆☆

عالمگیر ہاشمی

انگریزی سے ترجمہ: الیاس بابر اعوان

چھیاسویں برس کی دہلیز پہ دھرا ایک سانحہ

انہوں نے کہا، وہ مر گیا ہے!

وہ! پارک میں ایستادہ سب سے قدیم ایلم کا درخت

جسے میری ماں نے

جنوب سے یہاں لا کر بویا تھا

جہاں اس نے اسے

ایک ننھے پودے کی صورت میں دیکھا تھا

باغ میں لگے پودوں سی دیکھ بھال اس کی ضرورت نہ تھی

تاہم اب وہ اس کا عادی ہو چکا تھا

اس کے پتے ہر سرما میں تالیاں بجاتے

گویا ہم بچوں کو اپنی طرف کھیلنے یا آرام کرنے کا اشارہ کرتے

اور بوقتِ آرام بچوں کو اپنی آغوش میں لے لیتا

اور اب ایک ہفتہ ہو چلا ہے

گرد و غبار اور بچی کچھی خشک جڑیں

صاف ہو چکی ہیں

کمرے یا جو بھی مناسب ہو

اب تعمیر کیا جا سکتا ہے

اب زمین ہمیشہ کے لیے ہموار ہو چکی ہے۔

☆☆☆☆

توفیق رفعت

انگریزی سے ترجمہ: الیاس بابر اعوان

گاؤں کی لڑکی

وہ گاؤں کی ایک سرو قد
اور سیدھی سادھی لڑکی
جیسے گنے کا ڈانڈا
اور میں نے؛ جو ان پیاسے دنوں میں
دلکشی کے گھونٹ پینے کا خواہش مند تھا،
جب اسے دیکھا
تو اس سیدھی سادی اور سرو قد دوشیزہ نے
اپنے بالوں کو جس ادا سے جھٹکا
وہ کسی بھی انسان کی برداشت سے باہر تھا

☆☆☆☆

افضل مراد

براہوی سے ترجمہ: جہاں آرا تبسم

میرا چندا

اندھیری رات کی آواز سن سکو تو سنو
دلوں کی بات کی آواز سُن سکو تو سنو
تمھارے چاروں طرف جو شبِ اماوس ہے
تمھاری آنکھ کا کاجل ہے اور کچھ بھی نہیں
تمھارے پاس اگر چاند کا اجالا نہیں
تمھارے پاس ستاروں بھرا حوالہ نہیں
مگر تمھارے مقدر کی تیرگی میں کہیں
محبتوں کی حسیں چاندنی چمکتی ہے
کسی کی پیار بھری روشنی مہکتی ہے
یہ ٹھیک ہے کہ تمھیں کچھ نظر نہیں آتا
مگر یہ آنکھ جو ظاہر کا حسن دیکھتی ہے
وہ آنکھ اپنے ہی باہر کا حسن دیکھتی ہے
جو آنکھ دل کے چراغوں سے نور لیتی ہے
جو آنکھ روح سے روشن سرور لیتی ہے
وہ آنکھ کھول کے دیکھو کہ اُس کے تاروں نے
چمکتی چاندنی کے دل نشیں نظاروں نے
حسین چاند کو کیا روشنی عطا کیا ہے
حسین رات کو اک زندگی عطا کی ہے

○○

ادھر دیکھو----!

مرے محبوب کو اک تازگی عطا کی ہے
مگر دیکھو گی تم کیسے؟
اندھیری رات
تیرے پاس
نہ اب چندا کا ہالہ ہے
نہ تاروں کا اجالا ہے
اندھیری رات ہو تم
اور اندھیری ہیں تری آنکھیں
مگر پھر بھی
ادھر دیکھو
تمھارے چاند تاروں نے
مرا چندا
سنوارا ہے

☆☆☆☆

اے آر دارد

بلوچی سے ترجمہ: واحد بخش بزدار

بےنوائی

میں فن کار تھا اور نہ ہی کوئی جان کار۔ مجھ میں کسی قسم کی اہلیت وصلاحیت نہیں تھی۔ میں ایک میرؔ کے چوکھٹ کا محافظ اور پہرے دار تھا۔ میں جب سے پیدا ہوا تھا، یہیں تھا۔ مجھے یہاں کون لایا تھا۔ مجھے معلوم نہیں۔ اگر کوئی آ جاتا اور اندر داخل ہونے کو کہتا تو میں اُسے روک نہیں سکتا تھا۔

یہ بندوق اور گولیاں بس یوں ہی زمانے کو دکھانے کے لیے تھیں کہ میں بھی ایک محافظ ہوں اور اسی چوکھٹ کا رکھوالا ہوں۔

میں آج تک یہ جان نہ سکا کہ میں کس کا بیٹا ہوں؟ میں نے جب سے آنکھ کھولی ہے یہیں پہ کھڑا ہوں۔ میرا کوئی عزیز و وارث نہیں ہے۔ میں نے میرؔ کو بھی کبھی نہیں دیکھا کہ وہ کیسا اور کس طرح کا ہے؟ بس آنے جانے والے یہ کہہ کر اندر داخل ہوتے ہیں کہ وہ میرؔ سے ملنا چاہتے ہیں۔

میری چشمِ تصور کے مطابق وہ بوڑھا آدمی ہے۔ سفید لباس میں ملبوس، ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھا ہے اور لوگوں سے گفتگو کرتا ہے۔ ایک دو مرتبہ میرے دل میں بھی یہی خواہش پیدا ہوئی کہ اندر جا کر میرؔ سے مل لوں اور اُن سے پوچھ لوں کہ میرا کام کیا ہے؟ میں یہاں کس لیے رکھا گیا ہوں؟ مگر ہر بار کسی انجانے خوف نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔

میں یہیں پہ سوتا، یہیں پہ بیٹھا رہتا، یہیں پہ کھڑا رہتا۔ لوگ، شہر، بازار خود میرے پاس آتے اور جاتے رہتے تھے۔ مجھے کسی اور طرف جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے بس یہی کہا گیا تھا کہ میں کھڑا رہوں۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی میں اپنی طرح کے شخص کو دیکھ نہ سکا۔

ایک دن، جس چوکھٹ پہ میں کھڑا تھا۔ ایک شخص آیا اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس شخص کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا کہ یہ تو میں خود تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ یا تو تم نے مجھے چُرا لیا ہے یا میں نے تجھ کو۔ وہ ہنسا اور اُس نے پوچھا۔ آخر کیسے؟ میں نے کہا کہ تم بالکل میری طرح لگتے ہو، میں اور تُو ایک ہی شخص ہیں۔ یہ سن کر وہ شخص چلایا اور کہا ”تم نہیں جانتے، میرؔ میں ہوں۔“

میں نے اُس سے استفسار کیا کہ ”وہ میرؔ جو اندر بیٹھا ہے، وہ کون ہے؟ تم جھوٹ بولتے ہو۔ میرؔ تو

اندر تشریف فرما ہے۔ ''اس کی نہ تو کوئی داڑھی ہے، نہ ہی سفید لباس میں ملبوس ہے اور نہ ہی ہاتھ میں تسبیح ہے۔ اُس نے کہا؛

''میں تو اب تک وہیں باہر رہا ہوں، اندر گیا ہی نہیں ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ مجھ سے رہا نہ گیا، دل نے کہا کہ میں بھی اندر جا کر دیکھ لوں کہ معاملہ کیا ہے؟ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ میرا ہم شکل شخص بھی مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ یہاں کوئی اور گھر تھا کوئی اور عمارت تھی۔ میں چلتا گیا۔ چلتے چلتے ایک جنگل نظر آیا۔ وہی پہلا شخص جو گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا تھا، وہ سب سے آگے چلا جا رہا تھا۔ میرا ہم شکل شخص بھی نظر آیا، کہ جو اِن کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ میں بھی اپنی بندوق اور اسلحہ پھینک کر اُنھی کے پیچھے چل پڑا۔ میں کہاں جا رہا تھا، یہ معلوم نہ تھا۔

☆☆☆☆

ابراہیم رومان

پشتو سے ترجمہ: ابراہیم رومان

مٹی کی خاطر

سارہ سیلے: ہائے

حسام: کیسی ہو؟ اور کہاں رہتی ہو؟

سارہ: ٹھیک ہوں، میں آج کل یورپ کے ٹور پہ ہوں اور اس وقت جرمنی میں ۔ آپ کہاں کی ہیں؟

حسام: پاکستان ۔

سارہ: کہاں ہے؟

حسام: آپ نہیں جانتی، کمال ہے ۔ ہم تو آپ ہی کی جنگ جیتنے کی خاطر ذلیل وخوار ہیں اور آپ کو پتا بھی نہیں ۔

سارہ: کیا مطلب؟ کیا انڈیا کے ساتھ ہے پاکستان

حسام: انڈیا کے بارے میں جانتی ہیں ۔

ہاں، اور ہندی بھی جانتی ہوں، ہندی فلمیں بھی دیکھتی ہوں ۔

حسام: ٹھیک ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اردو جانتی ہیں؟

سارہ: نہیں جی اردو نہیں جانتی ۔ ہندی جانتی ہوں ۔

حسام: آپ یہ جو بول رہی ہیں ۔ یہی تو اردو ہے نا اور یہی ہماری قومی زبان بھی ہے ۔

سارہ: اچھا ۔۔۔ میں اس کو ہندی کہتی ہوں

حسام: آپ کیا کام کرتی ہیں؟

سارہ: میں آرمی میں ہوں، لیکن اس وقت میں ایک ٹانگ سے معزور ہوں، اس لیے میں ترجمان کی حیثیت سے کام کرتی ہوں ۔ لیکن یہ تو بتایئے آپ لوگ کیسے ذلیل وخوار ہوئے ہیں ۔

حسام: میں نے کہا نا آپ لوگوں کی جنگ جیتنے کی خاطر

سارہ: وہ کیسے؟

حسام: ہم آپ لوگوں کی خاطر اپنے ملک ہی میں مسافر ہیں ۔ ہماری مٹی آگ بگولہ ہے ۔ اپنی

ہی زمین پر غیروں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم غیر محفوظ ہیں۔ بے گھر ہیں، ہمیں نوکری نہیں مل رہی۔ ہم ذلیل وخوار ہو گئے ہیں۔ ہماری مسجد، حجرہ، گھر، درسگاہ سب کچھ غیر محفوظ ہیں۔

سارہ: یہ کیوں؟

حسام: میں نے کہانا، آپ لوگوں کی خاطر، آپ لوگوں کی جنگ جیتنے کی خاطر، ہم قطاروں میں روٹی کے لیے کھڑے رہتے ہیں۔ ہماری عورتیں قطاروں میں مواد لینے کے لیے کھڑی رہتی ہیں۔ ہم اس ترقی کے دور میں روز بروز گراوٹ کا شکار ہیں۔ چھت نہیں آسمان تلے ہم خیموں میں رہتے ہیں۔

سارہ: اوہ، ریلی۔۔۔۔؟

حسام: جی ہاں

سارہ: میں یہاں سرکاری دورے پر آئی ہوں۔ میں اپنے ہی ملک سے ابھی رابطہ کرتی ہوں۔ ہمارے ملک آجانا، یہ تو افسوس کی بات ہے کہ آپ بھوکے ہیں۔ اور آپ کا گھر نہیں ہے، نوکری بھی نہیں۔

حسام: آپ کس کس کو بلالیں گی؟

سارہ: آپ ہی کو اور کس کو؟

حسام: میں اپنے لیے نہیں کہہ رہا، لیکن میری ایک خواہش ہے، اگر وہ پوری کر دیں، تو میرے لیے سب کچھ ہوگا۔

سارہ: کہو تو

حسام: میرا ایک پیغام ہے، اگر یہ اپنے فوجی حاکموں تک پہنچا دیں۔

سارہ: ای میل کر دینا، پہنچ جائے گا

حسام: اپنے آقاوؤں کو کہہ دینا، کہ یہ خون خرابے کی پالیسی ترک کر دیں، کیوں کہ اگر اسی طرح آپ لوگ کسی کی زندگی سے کھیلیں گے، آپ خود بھی سکون سے نہیں رہیں گے۔ آپ افرادی قوت ضائع کر رہے ہیں۔ آپ لوگ مقروض ہوتے جا رہے ہیں۔ لوگ آپ سے نفرت کر رہے ہیں۔ مگر یاد رکھنا جیت بھی آپ کا مقدر نہیں بن سکتی۔

سارہ: یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ہم آپ کے ملک میں امن اور سکون لانا چاہتے ہیں۔

حسام: کیسا امن؟ کیسا سکون؟ جن لوگوں کے ساتھ لڑ رہے ہو، کل یہ آپ کے دوست تھے۔ آج جن کو آپ نے دوستی کا ہاتھ دیا ہے۔ کل یہ آپ کے دشمن تھے۔ اور اگلے دن پتہ نہیں کس کو دوست بناؤ گے اور کس کو دشمن؟ ہماری زمین میدان جنگ بنی ہوئی ہے۔ ہم نے آپس میں لڑنا ہے اور بس۔

سارہ: آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔

حسام: آپ اس آگ کی تپش سے دور ہو۔ آپکو کیا اندازہ؟

سارہ: ٹھیک ہے آپ کا یہ میسج پہنچ جائے گا۔ آپ کی جو بھی ضرورت یا مسئلہ ہو مجھے بتا دینا کیوں کہ میں آپ سے تعلق رکھنا چاہتی ہوں۔ آپ میں حوصلہ ہے۔ عزم ہے اور یہ مجھے اس لیے پیارا ہے۔ کہ میں ایک معذور عورت ہوں اور 65 سال پرانی ہوں۔ مگر پھر بھی حوصلہ نہیں ہاری۔

حسام: کس طرح معذور؟

سارہ: میں اپنی غلطی کی وجہ سے برفیلے پہاڑوں پر پھسلتی ہوئی اپنی ایک ٹانگ سے ہاتھ دھو بیٹھی مگر مجھ میں اب بھی حوصلہ اور عزم ہے۔ اس لیے اب بھی کام کر رہی ہوں۔ اس وقت ایک اور مصروفیت آن پڑی۔ Next Time۔ بائے

حسام: ٹھیک ہے۔ بائے

حسام کی والدہ: بس اب یہ کمپیوٹر بند بھی کرنا، صبح کام کے لیے نہیں جائیں گے کیا؟

حسام: اچھا مما

والدہ: اٹھ جا، باہر کوئی دروازہ پر دستک دے رہا ہے۔

حسام: اچھا مما، دیکھتا ہوں۔

آدمی: تم حسام ہو؟

حسام: جی! آپ کون؟

آدمی: اِدھر آیئے آپ سے کچھ کام ہے۔

حسام: خیریت تو ہے؟

آدمی: ہاں خیرت ہے۔

والدہ: حسام کے ابا چائے کے لیے آجاؤ

والد: لو جی آ گیا اور ہاں حسام اب تک سویا ہوا ہے؟

والدہ: نہیں کسی نے دروازہ پر دستک دی، باہر گیا ہے، ابھی تک واپس نہیں لوٹا۔

والد: کب؟

والدہ: تھوڑی دیر ہوئی

والد: میں باہر دیکھ کے آتا ہوں۔ (دیر سے گھر آتا ہے)

والدہ: حسام کہاں ہے؟ کہاں گیا۔۔۔؟

والد: کچھ پتہ نہیں اُن کے دوستوں نے بھی نہیں دیکھا

والدہ: آخر یہ لڑکا کس کے ساتھ گیا؟ کچھ کیجیے حسام کے ابا۔

والد: (افسردگی سے) کر تو رہا ہوں کیا کروں۔ ان دیکھے سائے میرے وجود سے جو لپٹے ہیں۔

ڈاکٹر نصیب اللہ سیماب

پشتو سے ترجمہ: اجمیر افغان

بنجارا

چوڑیاں لے لو۔ بالیاں لے لو۔ سرمہ لے لو۔ واسلین لے لو۔ پوڈر لے لو۔ ہار لے لو۔

امی! آپی! بنجارا آ گیا۔

گلی محلے کا جو بچہ یہ آواز سنتا تو گھر کی طرف دوڑ پڑتا اور اپنے گھر کی خواتین کو بنجارے کی آمد سے آگاہ کرتا۔

بنجارے کی آواز سے ہر گھر کا ہر فرد اچھی طرح مانوس تھا۔ بچے، جواں، بوڑھے سب اس کی آواز جانتے پہچانتے تھے۔ چیک بنجارا بھی سارے گاؤں والوں کو فرداً فرداً جانتا پہچانتا تھا۔ وہ ہر گھر کی ہر عورت کی الگ الگ پہچان رکھتا تھا۔ گاؤں کی اکثر عورتیں چاہے دوشیزائیں ہوں یا بڑی بوڑھیاں، چیک سے پردہ نہ کریں۔ چیک بنجارا بھی جب گدھے پر سامان لادے گھر سے نکلتا تو وہ صرف اور صرف بنجارا ہو جاتا۔ وہ جب کسی دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر آواز لگاتا اور کوئی بچہ گھر سے باہر آتا یا کوئی عورت کواڑ کی آڑ سے جھانک لیتی تو ایک آدھ بار سب گھر والوں کی خیریت ضرور دریافت کر لیتا۔

”ماں جی کیسی ہیں؟ دلہن بٹیا کس حال میں ہے۔ بہن جی بیمار تھی اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟ بڑے میاں اب جھگڑتے وگڑتے تو نہیں؟

وہ ہر گھر کے ہر فرد کی خیریت یوں پوچھتا گویا ہر گھر اس کا اپنا گھر اور گھر کا ہر فرد اس کے اپنے گھر کا کوئی فرد ہو۔ ہر گھر کا حال احوال اسے معلوم تھا۔ فلاں کی بہو کی اپنی نندوں سے نہیں بنتی۔ فلاں کی بیٹی کا اپنی بھابھی سے رویہ ٹھیک نہیں۔ فلاں کی لڑکیاں ہر وقت دوسروں کی غیبت کرتی رہتی ہیں۔ وہ اپنا سرخی پوڈر وغیرہ بھی بیچتا اور عورتوں سے ان ہی کے گھروں کے گھریلو حالات پر تبصرہ بھی کرتا رہتا۔ ساتھ ساتھ انھیں اپنے ماہرانہ مشوروں سے بھی نوازتا۔ خواتین بھی اسے اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنے گھروں کا سارا احوال کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے رکھتیں۔ چیک بنجارا بھی تھا اور گاؤں والوں کا ہمدرد اور غم خوار بھی۔ وہ گاؤں والوں کے ہر غم اور خوشی میں یوں پیش پیش رہتا جیسے وہ اس کے قریبی عزیز اور رشتہ دار ہوں۔ وہ ہر مشکل میں ان کے کام آتا۔

اچانک ساس کو بہو کے لیے بناؤ سنگار کی چیزوں کی ضرورت پڑی لیکن گھر میں نقد پیسے نہیں تو فوراً چیک بنجارے کا خیال آیا اور ضرورت کی ہر چیز اس سے ادھار لی۔ بعد میں تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کر دی یا مرغی

کے انڈوں سے کام چلا لیا۔

چپک پیسوں کے لیے ان سے کبھی نہ الجھتا اور نہ عورتیں اس کے پیسے کبھی ہڑپ کرتیں۔ کبھی کبھی ادائیگی میں تاخیر ہو بھی جاتی لیکن قرض چکاتیں ضرور۔ گاؤں کی کوئی عورت چپک بنجارے کی ناراضی مول لینا نہ چاہتی۔ کیوں کہ گاؤں کی عورتیں کسی بھی تقریب میں شرکت کے لیے اس کی محتاج تھیں۔

دوشیزائیں ہر وقت اس بنجارے کی ٹوکری پر جھکی رہتیں اور چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتیں۔ کوئی چوڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھتی تو کوئی کیلوں کو اٹھا اٹھا کر قیمت پوچھتی۔ چپک اس بات پر اکثر ان سے جھگڑتا۔

"ہٹو۔ ساری چیزیں گڈمڈ کر دیں۔" کبھی کبھی تو بہت زیادہ غصہ ہو جاتا مگر نہ تو اس کا غصہ لڑکیوں کو ناگوار گزرتا اور نہ ان کا چلبلا پن اُسے کھلتا۔ وہ کون سا رشتہ تھا جو انھیں آپس میں باندھے ہوئے تھا۔ چپک کسی وجہ سے اگر ایک آدھ دن چھٹی کر لیتا تو گاؤں والے اس کے بارے میں فکرمند ہو جاتے۔ خاص طور پر عورتیں اس کے لیے بہت پریشان ہوتیں کہ خدا نہ کرے اسے کچھ ہو گیا ہو۔ بنجارے کے دل میں بھی ان کے لیے کچھ اسی قسم کے جذبات تھے۔

چپک بنجارا گھر لوٹتا تو اس کے چہرے پر تھکن کے بجائے طمانیت کے آثار جھلملاتے ہوئے نظر آتے۔ وہ مسکراتے ہوئے گھر میں داخل ہوتا اور شکر کے الفاظ ہمیشہ اس کی زبان پر ہوتے۔

"یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے جو مجھے اتنا اچھا روزگار دیا ہے کہ جس میں ایک آدھ وقت کی روزی روٹی بھی مل جاتی ہے اور ضرورت مندوں کے کام بھی آجاتا ہوں۔"

گاؤں کے ہر فرد کو اس پر بھرپور اعتماد تھا۔ وہ نہایت نیک اور سلجھا ہوا انسان تھا۔

ایک دن وہ گھر لوٹا تو خلافِ معمول تھکا ماندہ دکھائی دیا۔ افسردگی اس کے چہرے پر عیاں تھی۔ گھر آتے ہی وہ سیدھا اپنے کمرے کی طرف گیا۔ آج اس نے ہمیشہ کی طرح بیٹی کو بھی نہیں پکارا کہ "میری ننھی گڑیا کہاں ہو؟ آجاؤ ذرا ٹوکری اتارنے میں میری مدد تو کرو۔" اور نہ اپنی دودھ پیتی بچی کو گود میں اٹھا کر اسے پیار کیا۔ گدھے کو حسبِ معمول صحن میں کھلا چھوڑ دیا۔ بیوی نے ہمیشہ کی طرح گدھے سے سامان اتار کر اسے کھرلی پر باندھ دیا۔ اب وہ کمرے کی طرف ہولی۔ دیکھا کہ اس کا شوہر چارپائی پر چت لیٹا ہوا چھت کو گھور رہا ہے۔ وہ کسی گہری سوچ میں معلوم ہو رہا تھا۔

بیوی نے آواز دی۔ "کھانا لا دوں؟" لیکن اس نے سنی اَن سنی کر دی۔ بیوی نے پیر پکڑ کر تھوڑا ہلایا بھی----"آپ سے کہہ رہی تھی۔"

"ہوں----ہوں----" بنجارا جیسے کسی گہری نیند سے جاگا ہو۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے، کیا قیامت آئی ہے جو اتنا شور مچا رہی ہو۔"

"میں پوچھ رہی تھی کھانا لا دوں؟"

''نہ۔۔۔۔نہیں کھانا مجھے۔'' بنجارے نے دوبارہ لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

''شاید کہیں سے پھر کچھ کھا کر آئے ہیں۔ میں نے آپ سے آج جاتے وقت کہہ جو دیا تھا کہ باہر سے کچھ کھا کر مت آیا کریں لیکن آپ ہیں کہ۔۔۔۔مجھے نہیں یاد پڑتا کہ آپ نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر کبھی کھانا کھایا ہو۔ آج میرا دل بہت چاہ رہا تھا کہ اکٹھے بیٹھ کر کھالیں۔ آج ذرا جلدی لوٹے تو دل میں خوشی ہوئی کہ آج یہ تمنا پوری ہو جائے گی لیکن آپ ہیں کہ انکار کرتے جا رہے ہیں۔'' بیوی نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں نے کہیں سے کچھ کھایا وایا نہیں اور نہ اب کھانے کو جی کرتا ہے۔''

''کیا دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔'' بیوی پریشان ہو کر بولی۔

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ذرا تھکن ہو گئی ہے۔ اب جاؤ مجھے آرام کرنا ہے۔'' شوہر کی طبیعت میں بے زاری تھی۔

اگلی صبح بیوی ناشتے میں چائے اور باسی روٹی لے کر آئی اور کہا۔ ''میں نے گدھے پر پالان کس دیا ہے لیکن تم پہلے ناشتہ کرو پھر میں جا کر گدھے پر ٹوکری لاد دیتی ہوں۔''

''مجھے آج نہیں جانا، دل نہیں کرتا جانے کو۔''

''یہ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ پہلے تو جانے کو اتنی جلدی ہوتی تھی جیسے کسی نے آپ کو خاص دعوت پر بلایا ہو۔''

''کیا کروں؛ کل اس پار والے گاؤں میں ایک لڑکی نے بات ہی کچھ ایسی کہہ دی کہ بس اس کام ہی سے جی بھر گیا۔''

''آپ نے تو کبھی کسی کی بات کا برا نہیں مانا پھر ہر لڑکی تو آپ کے لیے سگی بیٹی سے کم نہیں ہوتی۔''

''اسی بات کا تو دکھ ہے کہ انھیں اپنی بیٹیاں سمجھتا ہوں۔''

''ایسی کیا بات کی اس لڑکی نے؟''

''وہ شینکی کا کا کی بیٹی ہے۔ اچھا سا نام ہے اس کا (ذہن پر زور دیتے ہوئے) یاد آیا لوگ وَرَئی کہہ کر پکارتے ہیں اُسے۔''

''ہاں۔ ہاں جانتی ہوں۔ وہ تو بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''میں نے بھی اس پر کسی برائی کا فتویٰ نہیں لگایا۔ کل جب میں اس کی گلی سے گزر رہا تھا کچھ معلوم ہے اس نے مجھ سے کیا کہا؟''

''۔۔۔۔ایسا کیا کہا؟''

''کہہ رہی تھی بنجارے چاچا تمھاری لائی ہوئی چیزیں بہت پرانی قسم کی ہوتی ہیں۔ بالکل پتھر کے زمانے کی۔ ایک نیا بنجارا اس گاؤں میں آیا ہے وہ نئی اور تازہ برانڈ کی چیزیں لاتا ہے۔ ایک دم نئی اور ایک آپ

ہیں کہ سڑی ہوئی چیزیں لا لا کر بیچتے ہیں۔ آپ نے تو ہمارے چہروں کا ستیاناس کر دیا۔ یا تو اس نئے بنجارے کی طرح نئی نویلی چیزیں لایا کرو یا پھر منہ اٹھا کر ادھر آنا ہی مت۔

''آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ ایک بچی کی بات پر اتنے ناراض ہوئے۔ یہ تو صرف ایک لڑکی کی رائے ہے۔ سارے گاؤں کی مرضی تھوڑی ہے۔'' بیوی نے تسلی دی۔

''بات صرف اس ایک کی نہیں ہے۔ گاؤں کی دوسری عورتوں کا بھی رویہ کچھ بدلا بدلا سا ہے۔''

''یہ نیا بنجارا کون ہے؟ ہمارے گاؤں میں بھی لڑکیاں اس کا تذکرہ کرتی ہیں۔''

''معلوم نہیں۔'' گاؤں میں اسے کوئی بھی نہیں جانتا۔ اس دن میرو کاکا نے صرف اتنا بتایا کہ شہر کی طرف سے آتا ہے۔''

''تو آپ بھی نئی وضع کی چیزیں لایا کریں۔ بس وہی آپ ہیں اور وہی میرو کاکا کی پتھر کے زمانے کی چیزیں ہیں۔'' بیوی نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ارے پگلی۔ شہر جانے کے لیے نقد رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک عدد ملازم اور سائیکل بھی تو پاس ہو۔ میں تو اُدھار سے اپنا گھربار چلا رہا ہوں۔ میرو کاکا سے میرا لین دین اُدھار کا ہے۔ شہر میں کون ہے جو مجھے جانتا ہے اور اجنبی کو کوئی ادھار دیتا نہیں۔''

''اللہ خیر کرے گا۔ اللہ پر بھروسا رکھیں۔ چلیں اٹھ کھڑے ہوں۔ انسان ہمت کرے تو کیا نہیں ہو سکتا۔''

چیک بنجارا بادلِ نخواستہ گدھے پر سامان لاد کر نکل کھڑا ہوا۔ گاؤں میں قدم رکھتے ہی اپنی مخصوص آواز میں چلایا۔

چوڑیاں لے لو۔ بالیاں لے لو۔ سرمہ لے لو۔ واسلین لے لو۔ پوڈر لے لو۔ ہار لے لو۔

لیکن نہ تو کسی بچے نے شور مچایا کہ چیک بنجارا آگیا اور نہ کسی خاتون نے تاک جھانک کی۔ گاؤں میں روز بروز اُس کے خریدار گھٹنے لگے۔ جب کہ نئے بنجارے کے گاہکوں میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ نیا بنجارا سائیکل پر بیٹھ کر چیزیں بیچا کرتا۔ اس کے آواز لگانے کا انداز یکسر مختلف تھا۔ گاؤں والے اس کی آواز دور سے پہچان سکتے تھے جب وہ آواز لگاتا:

''شیمپو لے لو، کاجل لے لو، صابن، کریم، ہار لے لو۔''

بچے جب گھر آکر بتاتے کہ بنجارا آیا ہے تو لڑکیاں جھٹ پوچھتیں: ''کون سا بنجارا، چیک یا وہ نیلی آنکھوں والا؟''

''ہاں۔ ہاں وہی وہی لال سی نیلی آنکھوں والا۔'' بچے ہانپتے ہوئے جواب دیتے۔

اُدھیڑ عمر عورتیں ناک بھوں چڑھا کر کہتیں۔ ''دفع کرو موئے کو اس کی نیلی آنکھوں پر خاک پڑے۔

اس اللہ مارے کی وجہ سے ہم اپنی پسند کی چیزوں سے محروم رہ گئے ۔“

نوجوان لڑکیاں جھنجھلا کر کہتیں ۔

”خاک پڑے چپک کی نوکری پر ۔ خود بھی پتھر کے زمانے کا ہے اور چیزیں بھی پتھر ہی کے زمانے کی لاتا ہے ۔ وہی گھٹیا واسلین ، گلا سڑا صابن ، ہمارے چہروں اور بالوں کا بیڑا غرق کر دیا موئے نے تو ۔“

”اللہ بھلا کرے نئے بنجارے کا جو ایک دم نئی نویلی چیزیں لاتا ہے ۔ وہ جو کریم لاتا ہے اس کا کیا کہنا ۔ چہرے سے داغ دھبے یوں مٹاتی ہے گویا کبھی تھے ہی نہیں ۔ اور اس کے لائے ہوئے شیمپو سے تو بال ایسے ملائم ہو جاتے ہیں جیسے ریشم ۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ نیا بنجارا خریداری پر ایک آدھ چیز مفت میں بھی دے دیتا ہے ۔ چپک تو اتنا کنجوس ہے جو کبھی کسی کو اپنی جوں بھی مفت میں نہ دے ۔“

نئے بنجارے کے گاہک زیادہ تر نوجوان لڑکیاں تھیں جب کہ چپک سے صرف اُدھیڑ عمر کی عورتیں خریداری کیا کرتیں مگر اب ان کی تعداد بھی گھٹنی شروع ہو گئی تھی ۔

ایک دن چپک بنجارا گاؤں کی گلی گلی ، کوچہ کوچہ گھوما گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے مخصوص انداز میں چلایا لیکن اس کی ایک چیز بھی نہ بکی ۔ وہ گاؤں میں جدھر جاتا ، نیا بنجارا اُس سے پہلے پہنچ چکا ہوتا اور اس کے اردگرد بچوں اور عورتوں کا مجمع لگا ہوتا ۔ اب گاؤں کے بچے اور خواتین چپک سے یوں دُور رہتیں گویا اس کی نوکری میں کوئی بم ہو ۔

چپک بنجارا تھکا ماندہ اور مایوس ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہی تھا کہ دیوار کی دوسری طرف اس نے دو لڑکیوں کو آپس میں باتیں کرتے سُنا ۔ ایک دوسرے سے کہہ رہی تھی ۔ ”آج بنجارے سے کیا کیا خریدا ؟“

چپک بنجارا اُسی لڑکی ورئی کی آواز پہچان گیا ۔

دوسری لڑکی نے جواب دیا ۔ ”میں نے وہ نئے برانڈ کا شیمپو خریدا ۔ نظر بچا کر بابا سے کچھ پیسے چرائے تھے لیکن بدقسمتی سے وہ بھی کم پڑ گئے ۔“ لیکن بنجارا کہہ رہا تھا کہ کوئی بات نہیں ۔ اگلے دن دینے کو کہہ کر چلا گیا ۔ ”چونگی میں کچھ ملا بھی“ ورئی نے دلچسپی سے پوچھا ۔

”ہاں ایک چھوٹی سی ڈبیا دی تو ہے لیکن ابھی کھولی نہیں میں نے کہ اس میں ہے کیا ؟ وہ کہہ رہا تھا کہ کل آ کر اس کے بارے میں مجھے سمجھا دے گا ۔“

”ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی“ ورئی متجسس ہو گئی ۔

”تم ٹھہرو میں خود کھولتی ہوں کہ آخر اس میں ہے کیا چیز ؟ ارے اس میں تو غبارے ہیں ۔ مورکھ کہیں کا ۔ میں اُسے کوئی ننھی بچی نظر آئی جو مجھے غبارے لا کر دیے ۔ کل اس نے مجھے سمجھانے کو بھی کہا ہے تو کیا انھیں پھلانا مجھے آتا نہیں ۔ اس بات پر وہ دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں ۔ پھر ان دونوں کی کھلکھلاہٹ مدھم ہوتے ہوتے چپک کی سماعت سے اوجھل ہو گئی ۔

قیوم طاہر

پنجابی سے ترجمہ: سید ضیاء الدین نعیم

لفظوں کو تحریر جو کرتے ہیں

لفظوں کو تحریر جو کرتے ہیں
وہ ہاتھ
ماتھا، وہ جو
ان لفظوں کو سوچتا ہے
پڑھتی ہیں جو ان لفظوں کو
وہ جگنو آنکھیں
لفظوں کو رنگوں میں رنگتا
میرا انوکھا دل

خوف ہے کیوں ان سب کے من میں؟

سب یہ ڈھولے، ٹپے، ماہیے
مٹی ہی کے سنگ اگر مٹی ہو جاتے
کہیں گلاب کے پھول یہ بنتے
کہیں چنبیلی بن کر کھلتے
کہیں ستارے بن بن، دمکتے!!
سچے لفظ
کہاں مرتے ہیں ----

☆☆☆☆

جمیل احمد پال

پنجابی سے ترجمہ: سلطان کھاروی

خطا کار

”ذرا پکانے کو سبزی لا دو۔“ اُس نے کہا۔

”اچھا کہہ کر میں کتاب پڑھنے میں لگ گیا۔ میرے پسندیدہ لکھاری کی کہانیوں کا مجموعہ میرے ہاتھ میں تھا۔ کہانیاں کیا تھیں جادو تھا جادو۔ ابھی میں نے پہلی کہانی ختم کی تھی اور دیر تک اُس کے زیرِ اثر آنکھیں بند کر کے بیٹھا سوچتا رہا کہ انسانی دل کی کیفیت کو اس خوب صورت انداز سے اور کون بیان کر سکتا ہے؟

پھر جو دوسری کہانی شروع کی تو پھر گھر میں کھانے پکانے کی یہی مشکل آن پڑی۔ میں نے پھر اچھا کہا اور دوسری کہانی کے جادو میں پھنس گیا۔ بڑی اچھی کہانی تھی۔ میں خود بھی تھوڑا بہت لکھ لیتا ہوں مگر اس کہانی کار کی تو بات ہی کچھ اور ہے جیسے جیسے پڑھیں لگتا ہے کہانی لکھنا تو اسی کو آتا ہے۔ ہم تو وقت کا ضیاع کرتے ہیں۔ دوسری کہانی بھی پڑھی گئی تو میں نے تیسری شروع کر دی۔

”لے آؤ نا پھر پڑھ لینا۔“ وہ پھر چلی آئی۔

دفتر میں میری کئی چھٹیاں باقی تھیں، اسی لیے میں نے دو دن کی چھٹی لی تھی کہ آرام بھی کروں گا اور لکھنے پڑھنے کا کام بھی۔ آج پہلی چھٹی تھی۔ دیر سے اُٹھا ناشتہ کیا پھر میں نے اپنے من پسند لکھاریوں کی کتابیں بیٹھک کی میز پر لا رکھیں۔ بعض کتابیں دو مہینے پہلے خریدیں تھیں مگر پڑھنے کی نوبت نہ آ سکی۔ گھر کے ساتھ والی گلی میں لوگ آ جا رہے تھے مگر میری کتابوں نے مجھے اور ماحول میں پہنچا دیا تھا۔ جہاں نہ گلی تھی اور نہ آتے جاتے لوگ۔۔۔۔ مگر سبزی گوشت والا جھگڑا میرے سر پر سوار تھا۔ گھر میں میرے اور اُس کے سوا کوئی نہ تھا۔ بچے سکول جا چکے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ لاؤں گا تو میں ہی مگر کہانی کو یوں چھوڑ کر کون جائے؟ کہانی ختم ہو گی تو جاؤں گا۔ اُسے ٹالنے کو کہہ دیا:

”ابھی تو نو بجے ہیں، لے آؤں گا۔“

”پھر گوشت اچھا نہ ملے گا۔“

”مل جائے گا میں لے آؤں گا۔“ میں پھر کہانی میں شامل ہو گیا اور پڑھنے کے ساتھ ساتھ جذباتی بھی ہوتا گیا اور کہانی کے ختم ہونے پر دیر تک اپنے آپ میں نہ رہا۔ کمال سے اتنا اچھا لکھا جا رہا ہے پنجابی

میں ۔ یُوں تو میں اُس لکھاری سے پہلے ہی متاثر ہوں مگر اس مجموعے کی تو بات ہی اور ہے ۔ کتاب پڑھ لُوں پھر اس کو خط لکھوں گا ۔

چوتھی کہانی کب شروع ہوئی مجھے احساس تک نہ ہوا، اور وہ پھر میرے سر پر سوار ہو گئی:

’’میں نے کہا جاؤ لے آؤ ۔ کل بھی آپ کو چھٹی ہے ۔ کتاب پھر پڑھتے رہنا ۔ گوشت نہیں ملے گا ۔‘‘

’’میں ابھی لے آتا ہوں ۔ میری جان! چائے کی ایک پیالی لا دو ۔‘‘

وہ جانے کب چائے بنا کر میری میز پر رکھ گئی ۔ مجھے خبر تک نہ ہوئی ۔ جب چوتھی کہانی ختم ہوئی تو مجھے میز پر پڑی چائے نظر آئی اور ایسے میں وہ پھر میرے سرہانے آ کر کھڑی ہوئی ۔

’’ہائے رے ۔ آپ نے چائے نہیں پی؟ یہ تو ٹھنڈی ہو گئی نا ۔‘‘

’’کوئی بات نہیں آپ جانتی ہیں میں چائے پتی کی وجہ سے پیتا ہوں ۔ ٹھنڈی بھی ہو تو پھر کیا ۔‘‘

یہ کہا اور میں نے لسی کی طرح چائے کا کپ ایک ہی بار میں خالی کر کے میز پر رکھ دیا اور اُس کی طرف دیکھا ۔

اُس نے خالی کپ اٹھایا اور جاتے جاتے بولی: ’’سوا دس ہو گئے ہیں ۔ آپ سبزی لے آتے تو میں بھی کام نپٹا لیتی ۔‘‘

’’فقط ایک کہانی اور پڑھوں گا ۔‘‘

’’پھر گوشت نہیں ملے گا اور مجھ سے شکایت کریں گے ۔‘‘

’’شکایت نہیں ہو گی ابھی لے آتا ہوں ۔ یہ بھی روز کا عذاب ہے کوئی بچہ بھی گھر میں ہوتا تو اب تک لے بھی آتا ۔ صرف یہ کہانی پڑھ لوں، لاتا ہوں ۔‘‘

میں نے اگلی کہانی شروع کی تو وہ سب سے دل چسپ تھی ۔ میں محو ہو گیا ۔ پڑھتے پڑھتے مجھے یاد آیا جیسے وہ مجھے یاد کرا رہی ہے مگر میں ’ہوں‘‘ کہ اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا ۔ کہانی بہت ہی دل چسپ تھی ۔

وہ کہانی ختم ہوئی تو میں نے اگلی شروع کر لی ۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ گلی والے دروازے میں کھڑی پپو کو بُلا رہی تھی؛

’’پپو ذرا بات سُننا ۔‘‘

پپو ہمارے ہمسائے کا چھوٹا لڑکا ہے ۔ یہی کوئی دس بارہ برس کا ۔ وہ پڑھتا نہیں ۔ کہیں کام سیکھنے جاتا ہے ۔

’’جی خالہ ۔‘‘ پپو کی آواز سنائی دی ۔

”بیٹے! مجھے سبزی تو لا دو ۔ یہ لو پیسے۔۔۔۔ آدھ کلو گوشت اور آلو یا توریاں لے آنا ۔ چلو مشکل آسان ہوئی ۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب مجھے سبزی کے لیے نہیں جانا ۔ اُس کی باتیں سُننے سے پہلے میں کہانی میں کھو چکا تھا۔ پھر صحن سے جھاڑو کی آواز آتی رہی ۔ بیٹھک کی صفائی تو میرے بیٹھنے سے پہلے کر چکی تھی ۔ میں کہانیاں پڑھتا رہا اور میرا پسندیدہ کہانی کار ہر سطر میں ایک نئے جہان کی سیر کراتا رہا۔ انسانی فطرت کا اتنا عمیق مشاہدہ بہت کم لوگوں نے کیا ہو گا ۔ کہانی کے بعد کہانی پڑھتے ہوئے میں نے فہرست کا صفحہ دیکھا۔ صرف ایک کہانی رہ گئی تھی ۔ گھڑی دیکھی تو ایک بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے ۔ پتہ ہی نہ چلا وقت گزرنے کا اور کتاب ختم ہو گئی ۔ میں آخری کہانی شروع کرنے والا تھا کہ بیٹھک کا پردہ ہٹا اور وہ کھانا لے کر اندر آ گئی۔ تھالی میں آلو گوشت کا سالن، روٹیاں، ایک پلیٹ میں کھیرے کے گول ٹکڑے، کٹے ہوئے سُرخ ٹماٹر اور پیاز کے لچھے ۔

بغیر کچھ کہے وہ کھانا میز پر رکھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد پھر آئی اور میز پر پانی کا جگ اور گلاس رکھ گئی۔

میں کھانا کھا رہا تھا ۔ سالن نہایت مزے کا تھا مگر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو ۔ میں اپنے آپ کو چور سمجھ رہا تھا، لگتا تھا میں اُس سے آنکھیں نہیں ملا پاؤں گا ۔

☆☆☆☆

منظور عارف

چھاچھی سے اردو ترجمہ: علی یاسرؔ

پرایا گھر

چاہے لاکھوں سُکھ ہوں یارو گھر مت رہو پرائے
کانٹوں جیسے پھول، پرائی سیج سے رب بچائے

گھبرو لڑکے، گھر بے گانے، کمزوروں سے بدتر
بوڑھی رلائے بے گانہ گھر، لڑکیاں خوب ہنسائے

گھر بے گانے سونا چمکے چاندی کرنیں بکھیرے
گھر بے گانے، ہر شے پرائی، کیا اپنے ہاتھ آئے

سیٹھ کہیں سب، دن میں لاکھوں کا اس کا لین اور دین
ساری رات وہ پائی پائی دل میں گنتا جائے

سونا اور رنگیں پوشاکیں دیکھ کے ہوگئی نوکر
بھوکی، تن پہ چیتھڑے پہنے نکلی بوڑھی ہائے

عارفؔ چھوڑ پرایا گھر کٹیا اک اپنی بنائی
فرش پہ بوری ایک بچھائی، گہری نیند سلائے

بے گانے گھر گنیں نوالے، کس نے کتنا کھایا
غیر کے گھر میں غلامی، اپنے گھر آزادی پائے

☆☆☆☆

خواجہ غلام فرید

سرائیکی سے ترجمہ: سید تابش الوری

وقتِ جدائی آیا

اب وقتِ جدائی آیا
سر پہ ہے غم کا سایہ

ہے قبلہ، اقدس، عالی
ہر عیب سے یکسر خالی
ہر بندہ یہاں سوالی
جو مانگا ہے وہ پایا

واہ ربی امن کا عالم
واہ حرمِ پاک معظم
واہ بیت اللہ مکرم
رحمت کا ہے سرمایہ

اے نورِ سیاہ مجسم
ہے عین سوادِ اعظم
ہے امن میں یکسر بے غم
جو صحنِ حرم میں آیا

بس یاد حرم میں ڈوبوں
دکھ اپنے پرانے چوموں
جی چاہے زہر ہی پی لوں
ہے جیون جھوٹ کی چھایا

اب سُوئے وطن چلتے ہیں
دکھ سینے میں پلتے ہیں
چاہت کے دیے جلتے ہیں
پھر ہو دیدار خدایا

دلبر کے لیے دل تڑپے
گھر شہر لگیں کب اچھے
پھر سے ہوں طواف اُس گھر کے
پھر بخت اگر لے آیا

بن یار فرید گھلوں میں
خوں رووُں آہ بھروں میں
غم سے سو بار مروں میں
دکھ درد نے تن جھلسایا

☆☆☆☆

خواجہ غلام فرید

سرائیکی سے ترجمہ: سید ضیاالدین نعیم

کیا حال سناؤں دل کا
کوئی محرم ہی نہیں ملتا

مرے سر منہ دھول میں اٹ گئے
ناموس گنوادی میں نے
مجھے پوچھنے کوئی نہ آیا
ہنستا ہے عالم الٹا
کیا حال سناؤں دل کا
کوئی محرم ہی نہیں ملتا

بوجھ آیا ہجر کا سر پہ
مری شہر میں ہو گئی خواری
میں نے عمر گزاری روتے
پایا نہ پتا منزل کا
کیا حال سناؤں دل کا
کوئی محرم ہی نہیں ملتا

کوئی آئے معالج مجھ تک
بڑی پڑیاں گھول پلائیں
مرے دل کا بھید نہ پایا
نہیں فرق پڑا، کل بھر کا
کیا حال سناؤں دل کا
کوئی محرم ہی نہیں ملتا

ڈاکٹر رسول میمن

سندھی سے ترجمہ: شاہد حنائی

گدھوں کی آزادی

وہ ساون رُت کے دن تھے۔ ابھی مینہ نہیں برسے تھے۔ تیز دھوپ میں ریت کے ذرّات چمکتی آنکھوں میں آس کی چمک لیے آسمان سے بارش کے منتظر تھے۔ خشک ہوا سے موروں کے تشنہ حلقوم کی چہکاروں کی آوازیں بیٹھ چکی تھیں۔ ٹیلوں کے پاس سے گزرتے سائے کے قریب کھڑی گھاس اس کولہن کے میلے مٹیالے بالوں جیسی لگ رہی تھی جو رہ گزر پر بیٹھ کر اپنے رزق کمانے دور گئے محبوب کا انتظار کرتی ہے۔ ہوا کے جھکڑوں میں گرد اڑ رہی تھی اور آسمان میں سفید گھٹا کی بدلیاں کسی پیاسے شخص کی مانند بھٹکتے معلوم ہوتی تھیں۔

دہکتی زمین سے اُٹھتی لو میں نظر آنے والے پیڑ پانی میں لہراتے عکس کی طرح لرزاں تھے۔ رمّو کولہی جو اب سو گدھوں کا مالک تھا۔ مٹیالی پگڑی اور گدلی دھوتی باندھے آگے آگے چلنے والے گدھے پر یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی مُلک فتح کرنے نکلا ہو۔ اس کے عقب میں ننانوے گدھے ادب کے ساتھ گردنیں جھکائے ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے یوں چل رہے تھے، جیسے کیڑوں کی قطار بارش کی پہلی بوند پڑنے سے پہلے کسی محفوظ جائے پناہ کی تلاش میں جاری ہوتی ہے۔

کوئی وقت تھا جب رمو دو گدھوں کا مالک تھا جو اسے اپنے باپ کی طرف سے ورثے میں ملے تھے۔ اس نے سخت مشقت کی اور طویل جدوجہد کے بعد وہ سو گدھوں کا مالک بن چکا تھا۔ اب وہ اپنے علاقے میں گدھوں کا مشہور بیوپاری تھا۔ جس کسی کو گدھا خریدنا مقصود ہوتا وہ رمو سے ہی رجوع کرتا۔ رمو معمولی منافع لے کے گدھا فروخت کر دیتا تھا جس کی وجہ سے اس کے گاہکوں کی تعداد کافی تھی۔

بے شک صحرائے تھر میں ہر جگہ پانی کھارا ہے مگر کاسبی سے ننگر تک کا پانی ایسا شیریں تھا کہ نہ صرف پیاس بجھاتا تھا بلکہ بھوک کو بھڑکاتا بھی تھا۔ وہاں گدھوں کی تجارت بہت بڑی آس تھی۔ کئی کمین ان گدھوں کی پشت پر پانی کے مشکیزے بھر کر ننگر پارکر کے دفتروں، اسپتالوں اور گھروں تک پہنچاتے تھے۔ کہیں گدھوں پر لدی لکڑیاں نظر آتی تھیں تو کہیں گدھے گھاس پھوس ڈھوتے دکھائی دیتے تھے۔ کارونجھر کی بنیادوں سے جڑے ننگر شہر کی رات جہاں موروں کی چہکار سے گونجتی تھی وہاں گدھوں کی ہنہناہٹ لوگوں کی نیند میں خلل ڈالتی تھی۔

رمو کولہی کا بچپن یہیں گزرا تھا۔ ننگر سے بھوڑیسر جاتے ہوئے راستے میں موجود قدیم مسجد کی بالائی

جانب کے ٹیلوں کو ملا کر کل گیارہ ٹیلے تھے۔ مغربی ٹیلے کے نشیب کی جانب خاردار کیکروں کا جھنگھا تھا۔ کسی زمانے میں رمو کا باپ میگھو وہاں موجود ایک مخروطی جھونپڑی میں پتے کی بیڑیوں میں تمباکو بھرا کرتا تھا۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ یہ بیڑیاں اور دو گدھے تھے۔ جو سینگر کے درخت کے ساتھ رسّے میں بندھے رہتے تھے۔ رمو مخروطی جھونپڑی کے کونے میں بیٹھ کر اپنے باپ کو بیڑیاں بناتے دیکھتا رہتا تھا جو ان بیڑیوں کی بڑی تعداد خود ہی پی جایا کرتا تھا۔ رمو کو بھی یہ لَت وہیں سے لگی۔ وہ پینے کے لیے بیڑی اپنے باپ سے مانگا کرتا۔ باپ کبھی کبھار بیٹے پر رحم کھا کر بیڑی دے دیتا۔ دوسری صورت میں وہ اکثر آنکھ بچا کر باپ کی بنائی ہوئی بیڑیاں چرا کر پیا کرتا۔

’’ارے چھوکرے! اتنی بیڑیاں پھونکو گے تو ہم کھائیں گے کیا؟ گدھے کی لید؟‘‘

وہ جب بیٹے کو نصیحت کرتا تو اس کے ہونٹوں کے کونوں میں دبی بیڑی یوں جھومتی کہ اس سے نکلتے الفاظ دھوئیں کی صورت رقم ہوتے معلوم پڑتے۔

ابھی باپ کی داڑھی کے بال سفید نہیں ہوئے تھے کہ وہ اگلے جہان کوچ کر گیا۔ رمو دو گدھوں کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ حالات نے رمو کو سخت جان بنا دیا۔ اس نے کوسوں کی مسافتیں پیادہ پا کیں۔ وہ کارونجھر کے پہاڑی سلسلے سے آگے کاسبی کی زرخیز زمین تک گیا جہاں گدھوں کے اچھے دام ملتے تھے۔ اسے وہاں خاصا روپیہ ملا۔ وہ پلٹ کر اپنے علاقے میں آیا اور یہاں سے سستے داموں مزید گدھے خرید کر لے گیا۔ اب اس کا بیوپار چل نکلا اور وہ مال دار ہوتا چلا گیا۔

ایک دن ایسا بھی آیا کہ وہ سو گدھوں کا مالک بن چکا تھا۔ اس کے سو گدھے مغربی ٹیلے کے نشیب میں سینگر کے درختوں تلے بندھے ہوتے۔ وہ ننگر اور کاسبی جانے سے قبل گدھوں کی خوب دیکھ ریکھ کرتا۔ صبح سویرے سب سے تنومند گدھے پر سوار ہو کر سفر آغاز کرتا تو بقیہ ننانوے گدھے گردنیں جھکائے قطار بنا کر اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے۔ راستے میں کہیں کوئی کنواں آتا تو گدھے گھاس چرنے کے بعد پانی پی کر تازہ دم ہو جاتے۔ وہ شام ڈھلنے سے قبل واپس لوٹ آتا اور مغربی ٹیلے کے نشیب میں پہنچ کر ہر گدھے کے گلے میں رسّا ڈال کر سینگر کے ساتھ باندھ کر مخروطی جھونپڑی میں جا کر اپنے باپ کی طرف سے ترکے میں چھوڑے ہوئے چبوترے پر لیٹ کر بیڑی کے کش لینے لگتا۔

ایک بار اس نے بیوپار کی غرض سے ساتگی، ننگر اور کاسبی جانے کا قصد کیا۔ صبح ہونے پر گدھوں کے رسّے کھولے۔ جب وہ سب سے قوی گدھے پر سوار ہو کر اسے ہنکارتا ہوا اپنے پیچھے پیچھے آتے ننانوے گدھوں کے ساتھ ننگر سے تھوڑا دور رہ گیا تو آسمان سیاہ بادلوں سے چھپ گیا۔ رمو نے لاپروائی سے سوچا، ایسے کئی بادل آئے اور گزر گئے۔ کبھی بارشوں نے راہ کھوٹی نہ کی۔ اب یہ بھی برسنے سے تو رہے کہ میں ڈر کر لوٹ جاؤں۔ جو ہونا ہے سو تو ہو کر رہے گا۔ رمو یہ سوچ کر سو گدھے لیے ہنومان مندر کے قریب پہنچا تو برسات نے آ لیا۔

بارش کی بوندیں اس کی پرانی پگڑی پر گر جذب ہوتی رہیں۔ جب وہ آگے بڑھتا ہوا لال پہاڑ کے نزدیک پہنچا تو اس کی پگڑی بھیگ کر اس قدر بھاری ہو چکی تھی کہ سر پر بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کی داڑھی کے بال نمی میں بھیگ کر چپک گئے تھے اور گدھے پر بیٹھے رہنے سے اس کی بھیگی دھوتی سے اس کی سیاہ رانیں یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے دو گہری سہیلیاں ایک اوڑھنی میں منہ چھپا کر اس کے گھٹنوں میں آ بیٹھی ہوں۔

اس کے عقب میں چلتے ننانوے گدھوں کی رفتار سست ہو گئی۔ بارش کی رم جھم سے ہر شے دھندلا گئی تھی۔ ٹیلوں اور لال پہاڑ سے پانی نیچے کے رُخ بہنے لگا۔ تمام راستے پانی کے نالے بن چکے تھے۔ یہ ساون رُت کی پہلی برسات تھی۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی البتہ رمو کی تشویش بڑھتی چلی گئی۔ وہ کافی آگے نکل آیا تھا۔ اب واپسی کا سفر محال تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ٹیلوں اور پہاڑوں سے بہنے والے پانی سے سارے راستے زیرِ آب آ چکے ہوں گے۔ وہ گدھوں کو ہانکتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ اب مزید آگے جانا دشوار ہو رہا ہے۔ اس نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ گویا سر چھپانے کی جگہ تلاش کر رہا ہو۔ اسے کچھ پرے ایک ٹیلا دکھائی دیا جس پر کیکر کے درخت تھے اور وہ پانی کے بہاؤ سے کافی بلند اور محفوظ تھا۔ وہ گدھوں کو ہانکتا ہوا اس ٹیلے کی طرف لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اوپر کی سمت سینگریوں کے جھنڈ کو دیکھا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی گدھوں کو اکٹھا کیا اور سینگریوں تلے پناہ لی۔ اس نے شکر کیا کہ اسے سر چھپانے کو اچھی پناہ گاہ مل گئی تھی ورنہ وہ گدھوں کی طرف سے تو ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اس نے سوچا اگر یہ پناہ گاہ نصیب نہ ہوئی ہوتی تو پانی نے گدھوں کو بہا کر لے ہی جانا تھا۔ وہ گدھوں کی نگرانی کرتے ہوئے کافی دیر تک بیٹھا مینہ کے تھمنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب مینہ رُکا تو اس نے دیکھا کہ نیچے جانے کے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ پانی راستوں پر نالی کی صورت بہہ رہا تھا۔ اس کے لیے اب گدھوں کے ساتھ سفر جاری رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔ وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ اسے دور سے ایک راہ گیر ٹیلے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ راہ گیر اسے افسردہ دیکھ کر اوپر چڑھ آیا اور اس سے پوچھنے لگا:

”کیا ہوا؟ بڑے اُلجھے اُلجھے سے دکھائی دے رہے ہو۔ کیا مسئلہ ہے؟ مجھے بتاؤ ہو سکتا ہے مَیں کچھ مدد کر سکوں۔“

اس کی بات سن کر رمو نے ٹھنڈی سانس لی:

”مَیں گدھوں کا بیوپاری ہوں۔ یہ سوچ کر سو گدھے لے نکلا تھا کہ بنگرا اور کاسبی میں فروخت کر کے اچھے دام کھرے کروں گا مگر مینہ نے راستہ روک لیا ہے۔ اگر مَیں تن تنہا ہوتا تو کمر کس کر اوپر اوپر چلتا ہوا اپنے گاؤں جا پہنچتا۔ مگر اب ان سو گدھوں کا کیا کروں؟“

بات سن کر راہ گیر رمو کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ کوئی جا ایسی نہ تھی جہاں پانی نہ کھڑا ہو۔ شام ہونے کو تھی اور رات تک راستوں سے پانی اُترنے کا کوئی امکان دکھائی نہ دیتا تھا۔

لگتا ہے رات یہاں رُکنے کے بعد صبح سویرے سفر کرنا ہو گا۔“ راہ گیر نے کہا۔

”کہتے تو سچ ہو۔“ رمو نے مایوسی کے عالم میں کہا، ”لیکن ان گدھوں کو کہاں چھپاؤں۔ اگر اپنی جگہ ہوتی تو اِنھیں رسوں سے باندھ کر قابو کر لیتا۔ کہیں یہ اِدھر اُدھر نکل گئے تو میرا بڑا نقصان ہو جائے گا۔ رسوں کے بنا اِنھیں قابو کرنا بڑا مشکل ہے۔“

رمو کی یہ بات سن کر راہ گیر مسلسل قہقہے لگانے لگا:

”یہ کون سا مسئلہ ہے۔“ اس نے کہا۔ میں مانتا ہوں کہ تم ضرور گدھوں کو سو رسوں سے باندھ کر رکھتے ہو گے لیکن یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میری بات غور سے سنو۔“

پھر راہ گیر رمو کے قریب آ کر رازداری کے انداز میں اسے بتانے لگا:

” تم ایسا کرو۔ جس طرح اپنے گھر کے سامنے گدھوں کی گردنوں میں رسے ڈال کر سینگر کے درختوں سے باندھتے ہو اسی طرح ہر گدھے کو سینگر کے پاس کھڑا کر کے خالی ہاتھ ہر ایک کی گردن کے گرد پھیر کر سینگر کے ساتھ گانٹھ لگانے کا اشارہ کرو۔ گدھے یہی سمجھیں گے کہ وہ باندھے جا چکے ہیں۔ تم میری بات پر یقین کرو یہ خود کو بندھا ہوا سمجھ کر کھڑے رہیں گے۔ جب رات گزر جائے تو تم اپنی راہ لینا۔“

راہ گیر اسے صلاح دے کر چلتا بنا۔ اس کے جانے کے بعد رمو نے ایسا ہی کیا۔ وہ ہر گدھے کو سینگر کے پاس کھڑا کر کے خالی ہاتھ اس کی گردن کے گرد ہاتھ گھماتا اور پھر گرہ لگانے کا ڈراما کرتا۔ اس کارروائی سے فارغ ہو چکنے کے بعد رمو نے دیکھا کہ سارے گدھے اسی طرح کھڑے تھے جیسے مغربی ٹیلے کی ڈھلوان میں باندھے جانے کے بعد کھڑے ہوں۔ رمو نے سکھ کا سانس لیا اور سوچا کہ چلو اچھا ہی ہوا کہ راہ گیر مل گیا جس نے ایسی تدبیر بتائی جو کہ وقتِ ضرورت کارگر ثابت ہوئی۔

جب رات نے اپنے پَر بکھیرے تو بارش تھم چکی تھی مگر بجلی آسمان پر شگاف ڈال کر چمک رہی تھی۔ پہاڑی کے نیچے سانپوں کے تیرنے سے پانی میں سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ رمو کی جیبیں بھری ہوئی تھیں لیکن اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ننگر پار کر پہنچ کر تحصیل دار کے دفتر کے باہر موجود دینو کے ہوٹل سے دال روٹی کھا کر آگے چل پڑے گا۔ مگر ننگر پار کر تو ابھی کچھ پرے کارونجھر کے ٹیلے منظر میں چھپا ہوا تھا۔ رمو کو بھوک ستا رہی تھی۔ اس نے موسم کے تغیر میں دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس نے سوچا جانے ہوٹل کھلا ہو گا کہ نہیں۔ یہ سوچنے کے بعد وہ انگڑائی لے کر جمائیاں لینے لگا۔ اسے بھوک ستا رہی تھی۔ وہ یہ سوچ کر کپڑے جھاڑتا ہوا چل دیا کہ اگر دینو کا ہوٹل بند ہوا تو اِدھر اُدھر سے پیٹ بھرنے کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے گا۔ جب وہ چلتا ہوا کارونجھر کے قریب پہنچا تو دفعتاً شمال کی طرف سے اٹھتی گھٹا چھا گئی۔ مطلع ابر آلود ہو گیا۔ بھاری بھاری بوندیں برسنے لگیں اور بادلوں میں گھن گرج ہونے لگی۔ جیسے آسمان پھٹ گیا ہو۔ آگ کی لاٹ کی طرح کوندتی بجلی جب کارونجھر پر گری تو کارونجھر جلنے لگا۔ رمو منہ کے بل نیچے جا گرا۔ جب وہ گرتا پڑتا جین مندر میں جا پہنچا تو مندر کے برآمدے میں دَھم سے جا گرا تو شیش ناگ چونک کر مہاویر کے بت میں چھپ

گئے۔ رمو کے منہ سے بہتا لہو جم گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور آسمان سے برسات کی بوندیں ان پر آنسوؤں کی طرح گر رہی تھیں۔

ٹیلے پر سینگر کے درختوں کے نیچے کھڑے گدھے وہیں کھڑے رہے۔ وہ اپنی جگہ سے ذرا نہ ہلے۔ چار روز گزر گئے۔ رمو کو آنا تھا نہ وہ آیا۔ اچانک وہی راہ گیر جس نے رمو کو تجویز دی تھی وہاں سے گزرا۔ اس نے دیکھا کہ رمو کا تو کوئی اتا پتا تک نہیں تھا۔ گدھے سینگر کے درختوں تلے بھوک سے مرے جاتے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس رات رمو کے ساتھ ضرور کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ گدھے اس تصور سے کہ وہ رسیوں سے بندھے ہوئے ہیں اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر نہ گئے۔ بھوک، پیاس نے گدھوں کو ادھ موا کر ڈالا تھا۔ گدھے بے چارے بڑے مظلوم دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اِک اِک گدھے کے پاس گیا اور انھیں آزاد کرنے کی نیت سے ان کی گردنوں کے گرد اپنے ہاتھ اسی طرح گھماتا رہا۔ جیسے رسے کھول رہا ہو۔ گدھوں نے جب خود کو آزاد محسوس کیا تو نتھنے پھلا کر ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ راہ گیر نے انھیں گھاس کھلا کر پانی پلایا۔ پھر وہ سب سے جسیم گدھے پر سوار ہو گیا۔ ننانوے گدھے گردنیں جھکائے قطار بنا کر اس کے پیچھے پیچھے اسی طرح چلنے لگے جیسے وہ رمو کے پیچھے چلا کرتے تھے۔

☆ ☆ ☆ ☆

ڈاکٹر اسحاق سمیجو

سندھی سے ترجمہ: حبدار سولنگی

وہ

اُس کی نظر ایک بازار فتح کر سکتی تھی
اُس کا تبسم ایک شہر
اور اُس کا حُسن ایک مکمل دیس
مگر وہ کچھ بھی فتح نہ کر سکی
اُس کی ماں کی ’’ایڈز‘‘
اُس میں منتقل ہو گئی
اور وہ
کم سن ہی مر گئی

(نثری نظم)

☆☆☆☆

آسی زمینی

سندھی سے ترجمہ: ابرار ابڑو

بوسہ

میں نے بوسہ دینا چاہا
میرے سامنے
یار کے گال
محبوب کے ہونٹ
زاہد کی پیشانی
اور مزدور کے ہاتھ تھے
(مجھے صرف ایک بوسہ دینا تھا)
میں نے
ایک فیصلہ کن نظر
سب پر ڈالی
اور پھر
مزدور کے دونوں ہاتھوں کو
مقدس کتاب کی طرح کھول کر
اُن کے اوپر اپنی آنکھیں
اور ہونٹ رکھ دیے

☆☆☆☆

کشمیری تخلیق و ترجمہ: غلام حسن بٹ

شریف چور

رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت سے کچھ عرصہ پہلے “وادیِ کشمیر” میں چوری اتنی عام تھی کہ امیر اور ایمان دار لوگ پریشان رہتے اور یہ جاننے سے قاصر تھے کہ اپنی کمائی اور جمع پونجی کو کیسے سنبھال کر رکھا جائے۔

ان دنوں ڈاکوؤں میں مشہور شریف چور تھا۔ وہ چوری میں اتنا ماہر اور عیار تھا کہ لوگ اس کا نام سُن کر تھرتھرا جاتے۔ جب کہ لوگ اسے مافوق الفطرت کردار سمجھنے لگے تھے۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ شریف، یا تو بُری آنکھ رکھتا ہے یا پھر اس کے پاس جادو ہے جو اسے چوری کے منصوبوں کو پورا کرنے میں رکاوٹ پیش نہیں آتی۔

ایک دو مرتبہ شریف کو عدالت تک لے جایا گیا لیکن کچھ ثابت نہ ہونے پر لوگ اپنے دل کو تسلی دے کر یہ سوچ کر معاملہ بھول جاتے شاید یہی ان کا مقدر ہے۔

شریف چور کبیر غنی کا بیٹا تھا۔ کبیر غنی شالوں کا بہت بڑا تاجر اور زینہ کدل سری نگر میں رہتا تھا۔ شریف نے کبھی بھی اپنے والد کے کاروبار کو سمجھنے کی نہ تو کوشش کی اور نہ اس جانب دھیان دیا۔ نتیجتاً شریف ایک لاپرواہ، سُست اور آوارہ شخص ثابت ہوا۔ بظاہر اسے کھانے پینے اور روپیہ خرچ کرنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ اس کے باپ کی وفات کے بعد شریف نے اپنے باپ کی تمام جائیداد اور روپیہ بُری صحبتوں اور فضول دعوتوں پر خرچ کر دیا۔ اب شریف کیا کرتا؟ نہ وہ زمین کھود سکتا تھا اور نہ بھیک مانگ۔ لہٰذا اس نے چوریاں کرنے کی ٹھان لی۔

ایک دفعہ شریف نے نہایت زرک برق لباس پہنا اور بھیس بدل کر ایک باغ میں گیا جہاں امیر خاندانوں کے بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔ شریف نے دیکھا کہ بچے نئے اور قیمتی جوتے پہنے ہوئے ہیں وہ بچوں کے قریب گیا اور بچوں کو بُلا کر بیٹھ جانے کو کہا۔ بچے دوڑے ہوئے آئے اور حسبِ رواج اپنے جوتے اُتارے اور بیٹھنے لگے۔ شریف نے بچوں کو منع کر دیا اور کہا کہ “شریف چور قریب ہی ہے وہ آپ کے جوتے لے جائے گا۔” بچے سُن کر ہنسنے لگے! “وہ لے جائے گا، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟” بچوں نے جواب دیا۔ “کیا ہم اندھے، یا بے وقوف ہیں؟ یہ جوتے ہمارے قریب ہیں ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے جوتے کوئی اٹھا کر لے جائے۔”

شریف بھیس بدلے چور نے جواب دیا “کچھ دیر انتظار کرو میں دکھاتا ہوں کیسے لے جائے گا۔” شریف ادھر اُدھر تھوڑا فاصلہ گھوما کوئی ہمسایہ تو نہیں دیکھ رہا۔ واپس آیا تمام جوتے ایک چادر میں باندھے اور

تیزی سے بھاگ نکلا۔ بچے بے چینی سے انتظار کرتے رہے کچھ دیر گزری شریف، واپس نہ آیا، بچے چلائے اور معاملہ شہر تک لے جایا گیا لیکن سب بے سود۔

ایک دفعہ شریف، امام مسجد کا روپ دھار کر مسجد میں داخل ہوا اور نماز کے لیے زور سے آواز لگائی۔ لوگ آواز سُن کر مسجد میں آ گئے۔ شریف چور نے لوگوں سے صف باندھنے کا اشارہ کیا اور اس سے قبل کے نماز شروع کرتے شریف چور نے لوگوں سے کہا کہ ''شریف چور مسجد کے اردگرد بازار، عمارت یا کسی قریبی جگہ چکر لگا رہا ہے لہٰذا اپنی چادریں جمع کر کے ایک گٹھے میں باندھ کر میرے پاس رکھ دیں۔'' لوگوں نے اپنی چادریں ''شریف چور'' کے پاس جمع کرادیں اور نماز شروع کر دی جوں ہی سجدے میں گئے تو ''شریف چور'' آہستہ سے اٹھا موقع غنیمت جان کر قریب کے دروازے سے چادروں کی گٹھ اٹھا کر بھاگ گیا۔ جب لوگ بہت دیر سجدے میں رہے تو انھوں نے سمجھا امام صاحب بے ہوش ہو گئے ہیں۔ اچانک ایک شخص نے سر اوپر اٹھا کر امام کی طرف دیکھا اور۔۔۔۔۔ امام غائب تھا۔ وہ چلایا ''لوگو ہم لٹ گئے۔ شریف چور ہماری چادریں لے گیا۔ افسوس! شریف چور ہمیں دھوکہ دے گیا ہے۔''

ایک مرتبہ ایک جولاہا سوتی کپڑے کا تھان لے کر سری نگر بازار میں بیچنے کے لیے آیا۔ اسے رستے میں شریف چور ملا۔ شریف چور نے سلام کیا اور کہا آپ اپنا بوجھ کم کر لیں۔ جولاہا بولا وہ کیسے؟ کپڑا بیچ دیں! جولاہے نے کہا ''تین روپے کا کپڑا فروخت کروں گا۔'' شریف نے چاپلوسی کی اور بولا ''مناسب قیمت بتاؤ۔'' جولاہے نے قسم اٹھا کر کہا کپڑے کی قیمت اُس کی اصل قیمت سے آٹھ آنے کم ہے اُس کی مزدوری سے زیادہ منافع تو نہیں۔''

تاہم شریف کو یقین نہ آیا اُس نے کچھ مٹی اٹھائی اور مُٹھی میں دبایا اور کہا کہ یہ پیر صاحب کا روضہ ہے اور کپڑے کے تھان اس کے پاس رکھیں۔ جولاہا تعظیم میں نیچے جھکا (شریف چور) پیچھے سے کپڑا لے کر بھاگ گیا۔

ایک دفعہ شریف چور ایک مقبرے کے قریب فاتحہ پڑھنے کے بہانے کھڑا ہو گیا اسی اثنا میں ایک شخص وہاں سے گزرا۔ شریف چور نے اسے اپنی طرف بلایا اور کہا ''اللہ آپ کو خوش رکھے'' میں نے اپنے والد کے لیے دعا کرنی ہے اور تم مجھے روٹی لا دو میں نے غریبوں میں تقسیم کرنی ہے۔'' آدمی نے نیک کام سمجھا اور روٹیاں لانے کے لیے جانے لگا۔ شریف چور نے اسے واپس بلایا اور کہا ''شاید تم واپس نہ آسکو برائے مہربانی اپنا سامان یہیں رکھ دو۔ جب تک تم روٹیاں لے آؤ۔'' آدمی کو یقین ہو گیا اس نے اپنا سامان شریف کے پاس رکھا اور روٹیاں لانے کے لیے چلا گیا۔ جوں ہی آدمی نظروں سے اوجھل ہوا، شریف چور نے اس کا سامان اٹھایا اور بھاگ نکلا یوں معمولی پیسوں کے عوض شریف کو قیمتی سامان مل گیا۔

ایک مرتبہ ایک پنڈت نئی چادر اوڑھے سری نگر میں دریائے جہلم کے کنارے چل رہا تھا۔ شریف چور نے پنڈت کو دیکھا فوراً دریا کے کنارے بندھی ہوئی خالی کشتی پر چڑھ گیا اور اپنے آپ کو ملاح ثابت کرتے ہوئے پنڈت سے کہا۔ ”میری ذرا مدد کریں۔ اس کے بدلے میں آپ کو چھوٹے راستے سے منزل تک پہنچا دوں گا۔“

پنڈت نے شریف کی بات مان لی۔ رسی کھولی اور شریف کے ہم راہ کشتی پر سوار ہو گیا۔ جب وہ منزل کے قریب پہنچنے لگے اندھیرا ہو گیا۔ شریف چور نے پنڈت سے احسان جتاتے ہوئے کہا۔ ”پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ آپ کا گھر بہت فاصلے پر ہے۔ کیا آپ رات کا کھانا میرے ساتھ کشتی پر بیٹھ کر نہیں کھاتے اور سویرے تازہ دم گھر جائیں گے۔ دوست ایک روپیہ لے لو اور بازار سے کھانا لے آؤ۔“ پنڈت نے ایک روپیہ لیا اور روٹی لانے کے لیے جانے لگا۔ شریف چور نے پنڈت سے کہا آپ مہاراج بہت تھکے ہوئے ہیں میں ابھی تازہ دم ہوں کھانا لا سکتا ہوں۔ آپ کشتی میں آرام فرمائیں اور اپنی چادر مجھے دیں واپسی پر روٹیاں چادر کے اندر رکھوں تاکہ ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔ پنڈت نے بلا تامل اپنی چادر شریف چور کو دی اور خود کشتی میں بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا لیکن انتظار کرتے کرتے اسے سردی نے کمزور اور لاغر کر دیا اور آخر میں زور زور سے چلایا ”میں شریف چور سے مل لوں گا۔“

☆☆☆☆

رانا فضل حسین

گوجری سے ترجمہ: رانا غلام سرور

سَورن نگر یا سونے کا شہر

بہت ہی پرانی داستان ہے کہ ایک ملک کے بادشاہ کی بیٹی بڑی رحم دل اور نہایت عقل مند تھی شہزادی کا باپ حکمرانی کے نشے میں مغرور اور ظالم ہو گیا تھا۔ بادشاہ کی ملکہ ذہین اور سگھڑ عورت تھی وہ اپنے خاوند کو ہمیشہ بھلائی اور انسان دوستی کی تلقین کیا کرتی تھی۔ راج کماری کو اپنی ماں کی تربیت اور بہتر اخلاقی روش نے انتہائی ذہانت اور لیاقت عطا کر دی تھی۔ راج کماری بھی اپنے باپ کو ظالمانہ روش ترک کرنے پر زور دیا کرتی تھی۔ اکلوتی بیٹی سے باپ کو بہت پیار تھا۔ مغرور اور گھمنڈی بادشاہ اپنی بیٹی کے پند و نصائح پر اسے ہلکی سے ڈانٹ ڈپٹ بھی کر دیا کرتا تھا۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ راج کماری کی شفیق ماں اپنی زندگی کے سانس ہار گئی۔

شاہی محل میں اب اس کا کوئی مونس اور غمخوار نہ تھا۔ باپ اور بیٹی کے مزاج، عادت و اطوار میں بعد تھا۔ شفقت پدری آہستہ آہستہ سرد مہری میں تبدیل ہوتی گئی۔ جب کبھی بادشاہ کو کوئی مشکل مرحلہ پیش آتا، وہ بیوی سے صلاح مشورہ کر لیا کرتا تھا۔ پہلے تو دونوں ماں بیٹی کی باہمی رفاقت بادشاہ کو اکثر معاملات میں متاثر کر لیا کرتی تھی۔ اب وہ صورت حال نہ تھی۔ معصوم رائے کو باپ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اُس کے ظلم بڑھتے گئے۔ رعایا بہت دُکھی تھی۔ کسی علاقے میں بغاوت ہو گئی۔ ملک میں افراتفری پھیلی۔ ایک دن باپ نے بیٹی سے پوچھا۔ بتاؤ بیٹی یہ لوگ میرے خلاف کیوں ہیں۔ اس سے قبل تو ایسی سرکشی نہ تھی۔ راج کماری نے کہا، ابا حضور پہلے آپ کا وزیر خصوصی یعنی ملکہ عقل مند تھی۔ میری ماں آپ کی بہترین مشیر تھی۔ باہمی مشوروں سے امور سلطنت طے ہو جاتے تھے۔ اب وجاہت میسر نہیں ہے۔ آپ رعایا سے بہتر سلوک روا نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ لوگ آپ سے نالاں ہیں۔ بادشاہ اپنے آپ کو عقل کل تصور کرتا تھا۔ اسے بیٹی کی بھلی باتیں ناگوار گزریں۔ یوں وقت گزرتا گیا۔ باپ کا دل بیٹی سے بھر گیا اور اسی الجھن میں بادشاہ نے کسی عورت سے ایک نیا بیاہ رچایا۔ سوتیلی ماں نے لاڈلی شہزادی سے برا سلوک روا رکھا۔ ایک دن بادشاہ نے بیٹی سے پوچھا بیٹی دنیا میں سب سے خوش نصیب حکمران کون ہو سکتا ہے؟ بیٹی بولی کہ خوش نصیب حکمران وہ ہے جس کی مشیر عقل مند عورت ہو۔ لڑکی کا یہ جواب بادشاہ اور نئی ملکہ کو نہ بھایا کیوں کہ ان دونوں کے لیے دولت اور حکمرانی عقل اور بھل منساہٹ سے زیادہ اچھی تھی لیکن شہزادی کا خیال تو اس کے برعکس تھا اور وہ شرافت کو سب سے اونچا سمجھتی تھی ان ہی خیالات کی وجہ سے بادشاہ کی نظروں میں اُس کی بیٹی کا وجود کھٹکنے لگا اور ایک روز اُس نے اپنی لاڈلی بیٹی کو ایک غریب لکڑہارے کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ نے

لکڑہارے سے کہا کہ اس لڑکی کو لے جاؤ اور دیکھو کہ تمہاری قسمت اور اس کی عقل اور بھل منساہٹ سے کیسے سنور سکتی ہے۔ بوڑھا لکڑہارا شہزادی کو لے کر اُس کی قسمت پر افسوس کرتا ہوا اسے اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔

شہزادی نے لکڑہارے کے گھر کی افسوسناک حالت دیکھی تو اسے بہت دکھ ہوا۔ لکڑہارے کے بچے آوارہ اور اُوباش لڑکوں کی طرح کھیل کود میں مصروف تھے۔ جنہیں اپنی حالت کا کچھ خیال نہ تھا۔ لکڑہارے کی بوڑھی بیوی نے ایک نوجوان لڑکی کو اپنے میاں کے ساتھ دیکھا تو مارے حسد کے راکھ ہو کر رہ گئی۔

بڑھیا نے لکڑہارے کو جلی کٹی سنائیں اور شہزادی کے بارے میں بھی برے کلمات منہ سے نکالے لیکن لکڑہارے نے بڑھیا کو یہ کہہ کر ڈانٹ پلائی کہ یہ نوجوان لڑکی جسے میں اپنی بیٹی سمجھ کر ساتھ لایا ہوں ایک شہزادی ہے جسے سچائی اور شرافت کی بنا پر شاہی محل چھوڑنا پڑا ہے۔ شہزادی نے چپ چاپ پہلی رات اس جھونپڑی میں بسر کی اور اپنی عقل سے کام لے کر جھونپڑی میں رہنے والے ان لوگوں کی سوچ میں انقلاب لانے کی تدبیریں سوچتی رہی۔ صبح ہوئی تو شہزادی نے لکڑہارے سے کہا کہ بابا میرے پاس ایک قیمتی رومال ہے آپ قصبے میں جا کر یہ رومال بیچ آئیں اور جو رقم ملے اس سے کچھ دھاگہ اور کپڑا خرید لائیں۔ یوں شہزادی نے کپڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے خوبصورت رومال بنائے اور انتہائی اعلیٰ کشیدہ کاری کا کام کر کے یہ رومال لکڑہارے کے حوالے کیے۔ لکڑہارا یہ رومال بازار جا کر بیچ آیا اور یوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ شہزادی گھر کے اخراجات کے ساتھ ساتھ کچھ رقم پس انداز بھی کرتی رہی اور لکڑہارے کے بچوں کو تعلیم بھی دیتی رہی۔ اُدھر لکڑہارا بھی لکڑیاں جمع کر کے روز بازار جا کر تھوڑے سے پیسے لے آتا اور یوں گزارہ چلتا رہا۔ ایک دن شہزادی نے لکڑہارے سے کہا کہ وہ روز بازار جا کر لکڑیاں بیچنے کے بجائے جنگل میں لکڑیوں کا ایک ڈھیر اکٹھا کرے اور پھر اس ڈھیر کو اکٹھے کسی ٹھیکے دار کے ہاتھوں بیچ ڈالے۔ لکڑہارے کو یہ تجویز پسند آ گئی۔ وہ لکڑیوں کا ایک انبار جمع کرنے کے بعد اس نیت سے شہر چلا گیا اور ایک ٹھیکے دار سے سودا طے کر کے اُسے اپنے ساتھ جنگل میں لے آیا کہ ٹھیکے دار لکڑی کے ڈھیر کو دیکھ کر اپنی تسلی کر لے۔ اتفاق سے اُسی رات کو جنگل میں ڈاکوؤں کا گزر ہوا اور انہوں نے سوکھی لکڑیاں دیکھ کر شاید کھانے پکانے کی غرض سے آگ جلائی۔۔۔ ڈاکو اٹھ کر چلے گئے تو ہوا کے جھونکے سے کوئی چنگاری اُڑ کر لکڑیوں کے ڈھیر تک چلی گئی اور سوکھی لکڑیوں کو شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لکڑیوں کا ڈھیر راکھ کے ڈھیر میں بدل گیا۔ اب جو لکڑہارا ٹھیکے دار کو لے کر جنگل میں پہنچا تو اُسے لکڑیوں کے بدلے وہاں راکھ کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ ٹھیکے دار تو لکڑہارے کو بُرا بھلا کہہ کر چلا گیا لیکن لکڑہارا اُداس ہو کر وہیں بیٹھا رہا۔۔۔ وہ نا اُمیدی میں بے سدھ ہو کر راکھ اُڑاتا رہا، یہاں تک کہ راکھ کے ڈھیر میں ایک پتھر اُس کے ہاتھ سے ٹکرایا۔ سُنہرا سا گول مٹول پتھر دیکھ کر لکڑہارے کا جی چاہا کہ وہ اس پتھر کو اپنے گھر لے جائے۔ بوجھل قدموں گھر پہنچ کر اُس نے شہزادی کو ساری بپتا سنائی اور پتھر کا وہ ٹکڑا شہزادی کی طرف لڑھکاتے ہوئے بولا کہ بیٹی دیکھو تو کتنا عجیب و غریب پتھر ہے۔ ''ہاں عجیب و غریب تو ہے۔'' شہزادی

نے پتھر کو غور سے پرکھتے ہوئے کہا۔ ''بابا تم مجھے اُس جگہ پر لے چلو گے جہاں سے تمہیں یہ پتھر ملا ہے؟'' شہزادی بولی۔ بابا شہزادی کو لے کر جنگل کی اُنہیں چٹانوں تک لے آیا جہاں اس نے خشک لکڑیاں اکٹھی کر رکھی تھیں۔ شہزادی نے اِدھر اُدھر چٹانوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ لگا لیا کہ یہاں پر سونے کی کان ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہزادی نے اپنی عقل مندی سے جنگل کو ایک شہر میں بدلنے کا نقشہ کھینچ لیا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد یہاں جنگل کے بدلے ایک عالی شان محل کھڑا ہو گیا اور یہ جگہ سورن نگر یا سونے کا شہر کہلائی۔

اُدھر لڑکی کا باپ نیا بیاہ رچانے اور بیٹی کو لکڑہارے کے حوالے کرنے کے بعد لہو و لعب میں اور بھی زیادہ ڈوب گیا تھا۔ اُس نے سورن نگر کی شہرت سُنی تو دولت کے لالچ میں اِس شہر کی مالکن سے شادی کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ ایک دن ''بادشاہ سلامت'' بچ مچ اپنے مشیروں کے ساتھ سورن نگر میں آن پہنچے۔ شہزادی نے ''معزز'' مہمانوں کو دیوان خانے میں بٹھایا جہاں سے محل کے ساتوں دروازے نظر آ رہے تھے۔ شہزادی نے کچھ اس طرح بھیس بدل لیے کہ وقفے وقفے کے بعد وہ محل کے ہر دروازے پر آ کر کھڑی ہو جاتی تا کہ یہ لوگ اسے اچھی طرح دیکھ سکیں۔

بادشاہ اور مشیر حیران تھے کہ ایک سے ایک خوبصورت یہ سات ہم عمر لڑکیاں کون ہیں اور ان میں سونے کے اِس شہر کی مالکہ کون سی ہے جس سے شادی کرنے کے لیے بادشاہ منصوبہ بنا کر یہاں تک آن پہنچا ہے۔ بادشاہ نے اپنی ایک پرانی خادمہ سے کہا کہ وہ ذرا اس بات کی ٹوہ لگائے۔ خادمہ نے جو شہزادی کو بچپن سے جانتی اور چاہتی تھی نے کہا ''بادشاہ سلامت! محل کے ساتوں دروازوں پر مختلف لباس پہن کر ظاہر ہونے والی خاتون ایک ہی شخصیت ہے۔ آپ نے اُس کے قدموں کی طرف دیکھا ہوتا تو آپ کو معلوم ہوتا کہ کئی روپ دھارنے والی اس خاتون کے پیروں میں ہر بار وہی جوتے تھے جو پہلے دروازے پر ظاہر ہوتے ہوئے اُس نے پہن رکھے تھے۔'' اب بادشاہ نے لڑکی کے باپ کو (لکڑہارے کو) طلب کیا اور شادی کا پیغام دیا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ پہلے لڑکی سے دریافت کرے گا۔

بادشاہ بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ اُس کی آنکھیں محل کی طرف لگی ہوئی تھیں: کیا دیکھتا ہے کہ ایک لکڑہارا پھٹے پرانے کپڑے پہنے، کاندھے پر رسی اور کلہاڑی لیے اُس کی طرف چلا آ رہا ہے۔ بادشاہ کے ذہن میں ایک بھولی بسری تصویر اُبھر آئی۔ بادشاہ کو یاد آیا کہ ایسے ہی ایک لکڑہارے کو اُس نے اپنی بیٹی یہ کہہ کر سونپ دی تھی کہ ''اسے لے جاؤ اور اس کی شرافت اور عقل کے گھمنڈ کا تماشا دیکھتے جاؤ۔''

لیکن یہ دھندلی سی تصویر شادی رچانے کے چاؤ میں پھر بادشاہ کے ذہن سے محو ہو گئی۔ آخر بادشاہ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ 'سورن نگر' کی مالکن سے بیاہ رچانے کا خواہشمند عقل کا اندھا اپنی ہی بیٹی سے بیاہ رچانے چلا ہے اور سونے کا یہ شہر اُسی لڑکی کی عقل مندی اور بھلمنساہٹ کا ایک شاہکار ہے۔ جسے بادشاہ نے اپنے گھر سے نکال کر لکڑہارے کے حوالے کیا تھا۔

ہندکو تخلیق و ترجمہ: احمد حسین مجاہد

بڑے شاہ صاحب کی وصیت

جس جگہ باغ تھا
شاہ صاحب اب اسی جگہ
اپنے لیے نیا مکان بنا رہے ہیں
درختوں سے ان کی عمر کون پوچھتا ہے
چڑیاں اور ان کے گھونسلے کون دیکھتا ہے
ٹھیکیدار کی نظروں میں یہ سب بے وقعت چیزیں ہیں
شاہ صاحب تسبیح بھی رولتے ہیں
اور نوکروں کو گالیاں بھی دیتے رہتے ہیں
اس بار وہ چوتھے حج پہ جاتے ہوئے
بتا گئے ہیں
کہ وہ اپنے والدِ مرحوم کی وصیت کے مطابق
اس نئے مکان کے لیے پردے مدینہ سے لے کے
آئیں گے۔

☆☆☆☆

شیراز طاہر

جدید پوٹھوہاری ادب

”پوٹھوہاری زبان سنسکرت، پالی آرامی، ساسانی، یونانی، پنجابی اور فارسی کے میل جول سے وجود میں آئی“ صرف مفروضے کے سوا کچھ نہیں۔ کیوں کہ جب دوسری قومیں یہاں آئیں تو یہاں کے مقامی لوگ گونگے نہیں تھے کوئی نہ کوئی زبان ضرور بولتے تھے۔ ہاں فاتح لوگ اپنی زبان کو اعلیٰ اور معتبر گرداننے لگے اور مقامی زبان کو دوسرے درجے کی زبان قرار دے کر پراکرت بنا دیا گیا۔

پاکستان میں اکثر زبانوں کا رسم الخط فارسی ہے۔ جن میں آوازوں کے لیے فارسی زبان میں حروف موجود نہیں، ان کے لیے ہندی، بھاشا اور سن سکرت سے حروف مستعار لیے گئے۔ مثلاً ٹ۔ ڈ۔ اور ”ڑ“ کی ثقیل اصوات فارسی زبان میں موجود نہیں۔ اس لیے یہ تینوں حروف ہندی بھاشا سے لیے گئے ہیں اور حروف پر نقطوں کے بجائے ”ط“ ڈال کر انھیں اُردو کا جامہ پہنایا گیا۔ بہت سی ثقیل اور سنسکرتی لب و لہجے کی مخصوص اصوات کے لیے مرکب حروف بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح سے بھ، پھ، ٹھ، جھ، چھ، کھ مرکب حروف اردو زبان میں شامل ہوئے۔ چوں کہ اہلِ پوٹھوہار کا لب ولہجہ بھی سن سکرتی لہجے کے قریب تر ہے۔ اس لیے ان ثقیل اصوات کو ظاہر کرنے والے حروف اور مرکب حروف پوٹھوہاری زبان میں بھی شامل ہیں۔ چوں کہ پوٹھوہاری زبان کا اپنا ایک مستقل ذخیرہ الفاظ موجود ہے۔ افعال کی بناوٹ اور ضمائر کی ساخت کے قاعدے بھی اس کے اپنے ہیں۔

ہر چند کہ پوٹھوہاری زبان کو علمی اور ادبی زبان کا درجہ نہ مل سکا اور اس کے ادب کے بارے میں تاریخ کوئی قابلِ قدر مواد پیش نہیں کر سکی۔ مگر پوٹھوہاری زبان نہایت قدیم اور پرانی زبان ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں جو ایک علیحدہ بحث ہے۔ اس کے برعکس پوٹھوہاری لوک ادب باقی لوک ادب کی طرح مالا مال ہے اس میں دوہے، چار بیتے، ٹپے، ڈھولے، ماہیے، واراں، شادی بیاہ کے گیت اور سٹھنیوں کے علاوہ بجھارتیں بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ لوک کہانیاں، لوک قصے اور لوک شاعری، منظوم سہ حرفیاں تک موجود ہیں۔ بھرپور معاشقوں کی داستانیں بھی ہیں۔ ایک ایسی داستان قصہ دلِ خورشید اعلیٰ پائے کی نظم ہے جو پوٹھوہاری زبان کی شیرینی کا مرقع ہے۔ پورن بھگت کا قصہ بھی منظوم صورت میں موجود ہے۔ پوٹھوہاری شعر و ادب میں تہور بھی ہے شیرینی بھی، ٹمیاروں کی زبان پر اگر برہا کے گیت ہیں تو صوفی شاعروں کا کلام بھی پہروں ذوق وشوق کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ جس میں میاں محمد کا کلام بہت ہی میٹھے اور پُر درد آواز میں پڑھا جاتا ہے۔

تمام شاعری میں ابیات کی شاعری پورے عروج پر نظر آتی ہے۔ سائیں احمد علی ایرانی کی اِتباع

میں لاتعداد شعرا نے اشعار کہے اور ہزاروں کی تعداد میں اپنے اپنے شاگرد بھی پیدا کیے اور آج تک یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ ایک زمانے میں جب ڈھول، ستار اور گھڑے پر ان بیتوں کو پڑھا اور گایا جانے لگا تو لوگ شاعروں کو بھول گئے اور شعر خوانوں کو جاننے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ چار مصرعے کی شاعری پوٹھوہاری شاعری کی بنیاد بنی، مگر اس میں کہیں بھی پوٹھوہاری زبان کا استعمال نہیں کیا گیا جس سے آج یہ سارا سرمایہ کسی کھاتے میں نہیں پڑتا نہ پوٹھوہاری نہ پنجابی مل کہ اپنی اس واحد صنف پر ڈٹے رہنے سے اس نے پوٹھوہاری کی جدید دیگر اصناف کا راستہ بھی روکے رکھا۔ البتہ ایسے ماحول میں انیس سو چالیس کی دہائی میں اُبھرنے والی پوٹھوہار کی ایک آواز شیر زمان مرزا نے اپنی بلند پایہ فکری، پوٹھوہاری روزمرہ محاورے اور ڈھیٹ پوٹھوہاری استعاروں کا استعمال کر کے تصوف کی شیرینیوں میں گُندھے ابیات لکھ کر اس دھرتی کے ادب پہ چار چاند لگائے۔ ان کی ابیات کی کتاب عشق رمزاں مرتبہ "یاسر محمود کیانی" کمال کی چیز ہے جو خصوصی توجہ کا تقاضا کرتی ہے۔ اس طرح اُن کی دیکھا دیکھی نئے لکھنے والوں نی بھی اپنے کلام میں مقامی رنگ کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ابنِ آدم نے انیس سو چھیاسی کی ایک نشست میں کہا تھا؛

"کہ اب ہمیں پوٹھوہاری شاعری کرنی چاہیے، یعنی دیگر اصناف کی طرف بھی دھیان دینا چاہیے لیکن اس وقت بھی قدامت پرست آڑے آئے اور ابنِ آدم کے اس نظریے کی نفی کر دی اور کہا، کہ ان کا خیال اپنا ہے لیکن ہمارے ادب میں جدید ادب اور آزاد نظم کی اتنی پذیرائی نہیں جتنی بیتوں یعنی شعروں کی ہے اور نہ ہی یہ گھڑے ستار پہ بولی اور گائی جا سکتی ہے۔ آج ہمارے شعرا پوٹھوہاری ادب کو ترقی دینے کی بجائے اس کو اردو میں نقل کر کے اس کا جنازہ نکال رہے ہیں۔ ایسے شاعر بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہم نے پوٹھوہاری کو ایک نیا رنگ دیا ہے۔ حالاں کہ وہ نیا رنگ نہیں مل کہ نیا زنگ لگا رہے ہیں۔ وہ اردو نظمیں لکھیں، لیکن ہمارے ادب کا حلیہ نہ بگاڑیں۔"

پوٹھوہاری زبان سے عوام کی والہانہ دلچسپی کا اندازہ مقامی ریڈیو کی نشریات سے باآسانی لگایا جا سکتا ہے کیوں کہ کسی خطہ کی اپنی بولی ہی وہاں کے لوگوں کے دلوں کی ترجمان ہوتی ہے۔ انیس سو پچاس میں ریڈیو پاکستان راولپنڈی قائم ہوا۔ اس کا قیام پوٹھوہاری زبان اور پوٹھوہاری لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ اس طرح بیت بازی اور سہ حرفیوں کی جگہ آہستہ آہستہ نئے ادب نے لے لی اور خود بخود ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ریڈیو کے وسیلے سے جہاں پوٹھوہاری پروگرام نشر کیے گئے وہاں اس نے اپنے "پنجاب رنگ" پروگرام کے ذریعے بے شمار شاعروں اور ادیبوں کو پوٹھوہاری زبان کی طرف راغب کیا۔ جن میں باقی صدیقی، اختر امام رضوی، سید ضمیر جعفری، سید اختر جعفری، افضل پرویز، سید طارق مسعود، حسن عباس رضا، ریاض عشائی، ابنِ آدم، کرم حیدری، سعد اللہ کلیم، جمیل ملک، امین راحت چغتائی، پروفیسر قیوم شاکر، ماجد صدیقی، سید منظور حیدر، الطاف پرواز، شمیم اکرام الحق، کاملہ انجم، طاہر پرواز، دلپذیر شاد، انوار فیروز، طالب بخاری، عزیز ملک، امداد ہمدانی، باغ حسین کمال، پروفیسر امین، تصدق اعجاز، شریف شاد، منصور قیصر، سید حبیب

شاہ بخاری، نجمی صدیقی، پروفیسر یوسف حسن، سلیم رفیق محمد یونس، رشیدہ سلیم سیمی، عابد جنجوعہ، خالدہ ملک، صغریٰ یوسف اور سلطان محمود ملنگی جیسے لوگ بھی آ گے آ گئے۔ آ ج تک ریڈیو پاکستان راول پنڈی سے جو پوٹھوہاری فیچر پیش کیے گئے اگر ان ہی کو جمع کر کے چھاپ دیا جاتا تو یہی (اسکرپٹ) نثری ادب آ ج ہماری نسلوں کے لیے ایک سرمایہ ادب اور شاعروں، ادیبوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتا۔ یہ ہماری کم عقلی بھی ہے اور ہماری بدبختی بھی۔ ریڈیو کے علاوہ بھی چند معروف ادیب اور شعرا ایسے بھی ہیں جنہوں نے پوٹھوہاری زبان کو اپنی تخلیقات کے ذریعے خالص ادب مہیا کیا۔

تقسیم سے پہلے بھی بہت ساری کتابیں پوٹھوہاری زبان میں لکھی گئیں جن میں ایشر سنگھ ایشر کی کتاب (ادھلہ بھایا) موہن سنگھ کی کتاب (ساوے پتر) قابلِ ذکر ہیں۔ انیس سو سٹھ میں باقی صدیقی کی کتاب ”کچے گھڑے“ جس میں پنڈی وال زبان کا مضبوط لہجہ استعمال کیا گیا تھا۔ اصل میں یہ اُن کا پوٹھوہاری کلام تھا، جسے پنجابی کا نام دے کر مجلس شاہ حسین لاہور نے پہلی بار شائع کیا۔ جس کا دوسرا ایڈیشن انیس سو ستاسی میں شائع ہوا، جب کہ اس کا تیسرا ایڈیشن ساک پبلشر کوٹ سیداں گوجر خان سے آلِ عمران نے شائع کیا۔ انھی کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے ایک شاعر نجمی صدیقی جنہوں نے خالصتاً پوٹھوہاری میں عمدہ غزل لکھ کر پوٹھوہاری کا سر بلند کیا، مگر اس سے بھی پہلے بزرگ شاعر رشید نثار نے پوٹھوہاری کے خوبصورت آہنگ میں غزل لکھی۔ اختر امام رضوی جنھیں پوٹھوہاری ادب میں ایک بہت بڑی شخصیت کے طور پر مانا جاتا ہے کتاب تو نہ لا سکے مگر انھیں آزاد نظم اور غزل کے حوالے سے منفرد مقام حاصل ہے۔ برسوں ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے پوٹھوہاری پروگرام پیش کرتے رہے، پروگرام راول رویل ان کا ایک طویل سکرپٹ ہے جو ان کے جانے کے بعد بھی ان کی صاحبزادی چلا رہی ہیں۔ اختر عثمان جو اردو شاعری میں نئے لہجے کے شاعر کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں، پوٹھوہاری شاعری کا لہجہ بھی اپنی اردو شاعری کی طرح بالکل نیا رکھتے ہیں۔ اسی طرح اختر رضا سلیمی بھی، جن کی مادری زبان ہندکو ہے، اپنی اردو شاعری کی طرح پوٹھوہاری میں بھی جدید لہجہ لے کر آئے ہیں اور پوٹھوہاری شاعری میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ سلطان ظہور اختر کی کتاب ”ڈونگھے سمندر“ کتابوں کی آمد میں ایک روشن باب تھا۔ عبدالقادر قادری کی کتاب وسناں پوٹھوہار جس کی خالص زبان جو ہمارے اردگرد کھیت کھلیانوں اور گھروں سے لے کر تمام شعبہ ہائے زندگی میں ہمارے کانوں میں رس گھولتی ہے، منظرِ عام پر آئی اور سید حبیب شاہ بخاری کی کتاب ”پُھٹھیاں کلیاں“ اور قاعدہ کی صورت میں پوٹھوہاری ادب میں مزید اضافہ کیا۔ دو ہزار کی دہائی میں مانچسٹر (برطانیہ) سے پہاڑی پوٹھوہاری کا پہلا اور معیاری رسالہ نکالا گیا جسے برطانیہ کی پُرچکا کمیٹی نے برطانیہ اور پاکستان سے بیک وقت جاری کیا۔ جس کے روحِ رواں مرزا طارق محمود تھے، اس کے علاوہ انہوں نے پوٹھوہاری زبان کی پٹی اور قاعدے پر بھی خاصا کام کیا۔ ”ونس بِدڑانس“ سیانڑا گِدڑ کتابیں پوٹھوہاری اور انگریزی زبان میں ایک ساتھ شائع کیں۔ اس کے بعد انہوں نے جو

قابلِ تعریف کام کیا، وہ رسالہ ''دستگی'' تھا جو دینہ پاکستان سے نکالا گیا۔ اور فوری طبی امداد پر پوٹھوہاری پہاڑی زبان میں ایک معیاری کتاب بھی شائع کی۔ اسی کے ساتھ بریڈ فورڈ برطانیہ ہی سے ایک رسالہ ''چانن'' کے نام سے شائع ہوا، پاکستان میں جس کے ایڈیٹر اختر شیخ (مرحوم) اور برطانیہ میں چیف ایڈیٹر محمد سلیم مرزا تھے۔ یہ رسالہ کافی دیر تک اپنا ''چانن'' پھیلاتا رہا، مگر بعد میں بند کر دیا گیا لیکن ادبی طور پر پوٹھوہار جاگ پڑا تھا، جو دن رات اپنی مادری زبان پر کام کرنا چاہتا تھا۔

اکیسویں صدی کا نقطہ آغاز پوٹھوہاری زبان کے لیے انقلابی ثابت ہوا، جس میں بے شمار ادب تخلیق کیا گیا اور بے شمار پوٹھوہاری کتابیں شائع کی گئیں۔ شاہد لطیف ہاشمی کی کتاب ''تتر'' شائع ہوئی اس سے پہلے ہاشمی صاحب کے پوٹھوہاری زبان میں لکھے تقریباً دو سو کالم ''گمدانڈ'' کے نام سے ''روزنامہ صدائے پوٹھوہار'' میں چھپ چکے تھے۔ پوٹھوہاری زبان و ادب کے لیے کوشاں اور پیش پیش آلِ عمران کی کتاب ''پھٹ نہ پھرول'' ۲۰۰۲ء میں منظرِ عام پر آئی۔ لیکن آلِ عمران کی جدوجہد یہیں تک محدود نہ تھی۔ پوٹھوہاری ادبی بورڈ کی تشکیل کے ساتھ ہی علاقائی شاعروں اور ادیبوں کی نگارشات اور تخلیقات کو سامنے لانے کے لیے ''سرگ'' کتابی سلسلے کا اجرا کیا جو آج تک جاری ہے۔ ساک پبلشر کے تحت راقم کی کتاب ''بنگ بنگ زنجیر'' پوٹھوہاری شاعری امتیاز گلیانوی کی کتاب ''سدھراں نا سیک'' پوٹھوہاری افسانوں کا مجموعہ اور راقم کی دوسری کتاب گلو جے پوٹھوہاری افسانوں کا مجموعہ دو ہزار تین میں شائع کی گئیں۔ جب کہ ماڈرن بک ڈپو اسلام آباد نے معروف ٹی وی ڈرامہ نگار ارشد چہال کا ناول کوکن بیر شائع کیا۔ ادبی تنظیم ''پرالہ'' جس کے چیئرمین طارق محمود کے والد خود تھے ''تارا تارا لو'' کے نام سے ایک پوٹھوہاری افسانوں کا انتخاب مرتب کیا، جس میں پاکستان اور برطانیہ دونوں ملکوں کے پوٹھوہاری افسانہ نگار شامل تھے۔ یاسر کیانی نے ایک کتاب ''پوٹھوہاری گرائمر'' شائع کی جس میں پوٹھوہاری زبان کا خالصتاً گرائمر کی بنیادوں پر جائزہ لیا گیا۔ اسماء، ضمائر، افعال، تذکیروتانیث، واحد جمع اور گردانوں پر بنیادی بحث کی گئی۔ جو یقیناً انتہائی اہمیت کا حامل ابتدائی کام ہے۔ راجہ شاہد رشید کی شاعری کی کتاب ''حرف انمول'' شائع ہوئی جس میں غزل نظم اور ابیات، ماہیے شامل ہیں۔ زبان کے حوالے سے یہ ایک قابلِ فخر اضافہ ہے۔ دل پذیر شادؔ کی کتابیں ''ویلے نی اکھ''، ''سخنِ سلوک'' اور ''اردو غزل کا پوٹھوہار رنگ'' چھپیں۔ ''ویلے نی اکھ'' میں غزلیں قطعے اور ابیات، جب کہ ''سخنِ سلوک'' سیف الملوک کی طرز پر منظوم کی گئی ہے۔ جس میں اصلاحی موضوعات نمایاں ہیں کہ ''اردو غزل کا پوٹھوہار رنگ'' میں اردو غزلوں کا پوٹھوہاری ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو اپنے اعتبار سے ایک اچھوتا کام ہے۔ مختار کربلائی کی ''کتاب حرفاں نا دل بولے'' سیف الملوک اکادمی کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ محمد سلیم مرزا کی کتاب ''قدراں'' (شاعری) پوٹھوہاری ہندکو سوسائٹی بریڈ فورڈ یو۔ کے تعاون سے شائع ہونے کے بعد دوسری کتاب گوہڑے ساک چانن انٹرنیشنل بریڈ فورڈ برطانیہ نے شائع کی ''گڈیاں پٹولے''، ''بھیاں گوکاں'' اور

”سانجھیاں یاداں“ نابن پریس گوجر خان نے شائع کیں ۔ جب کہ اس سے پہلے عارف ادیب کیانی کی کتاب ”سُکے ناڑے“ (شاعری) مجلس شعاعِ پوٹھوہار نے شائع کی ۔ اسی اثنا میں ٹی ۔ وی سے تعلق رکھنے والے ڈرامہ نگار شعیب خالق کی کتاب ”تری لیکی“ (ہائیکو) کی صنف میں لکھی پیار فاؤنڈیشن نے شائع کی ۔ راجہ وحید قاسم کی چار کتابیں یکے بعد دیرے شائع ہوئیں، جن میں ”تریڑیں“ اُن کی نمائندہ کتاب ہے ۔ نئی آنے والی کتاب جس کا نام ”سانجھے ڈُکھ“ ہے عنقریب منظرِ عام پر آنے والی ہے ۔ سب سے سینئر اور بزرگ شاعر اور ریڈیو پاکستان کے پروگرام جمہور دی واز کے حوالے سے معروف شخصیت سید طارق مسعود کی کتاب ”ناواں ناواں تارہ“ جس نے پوٹھوہاری ادب میں ایک خاطر خواہ اضافہ کیا ایک اور صوفی منش بزرگ شاعر بابو اکرم کلیامیؔ کی دو کتابیں ”آرزوئے درویش“ اور ”خوشبوئے درویش“ شائع ہوئیں ۔ ”پوٹھوہاری پڑھبے“ اور ”اکھنارا اسمان“ قدرت حسین قدرتؔ کی دو کتابیں شائع ہوئیں ۔ ڈاکٹر کوثر محمود، نثار یاورؔ کے علاوہ قمر عبداللہ کی پوٹھوہاری افسانوں کی کتاب ”سانجھاں وچ تریڑاں“ ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی ۲۰۱۱ء میں زمان اختر کی کتاب ”کچیاں کنداں“ پوٹھوہاری ادب میں ایک نیا اضافہ بن کر آئی ۔ علی احمد قمر کی کتاب ”پچھاوا“ اسلام آباد سے شائع ہوئی ۔ ۲۱ فروری ۲۰۱۶ کو راقم کی افسانوں کی کتاب کوکلے اور شیراز اختر مغل کی شاعری کی کتاب ”کنڑیاں“ منظرِ عام پر آئیں ۔ اور ایک بہت بڑے سیمینار کا اہتمام کیا گیا ۔ یوں پوٹھوہاری ادب اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گیا لیکن ایک کمی جو پوٹھوہاری ادب میں ہر وقت کھٹکتی تھی وہ پوٹھوہاری لُغت کی کمی تھی ۔ جسے شریف شاد اور دل پذیر شادؔ کی لُغتوں نے پورا کر دیا ۔ اس کے علاوہ امجد علی بھٹی اور راقم کی لغت زیرِ مرتب ہیں گوجر خان میں ادب کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں جس شخص نے ارتعاش پیدا کیا وہ بزمِ سخن کے بانی شکور احسن ہیں ۔ بزمِ سخن کے تحت گوجر خان لائبریری میں باقاعدہ ہفتہ وار پچاس تنقیدی نشستیں منعقد کرا کر چار سالہ ریکارڈ قائم کیا ۔ اور اپنی پوٹھوہاری کی ایک کتاب ”جھکھو سبھے منظر جھکے“ دے کر پوٹھوہاری زبان سے محبت کا ثبوت پیش کیا ۔ شیراز اختر مغل کی پوٹھوہاری تنظیم ”کنڑیاں“ (گوجر خان) اور ”مشال“ (مندرہ) پوٹھوہاری ادب کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہیں ۔ راقم کا سہ ماہی رسالہ ”پَرا“ جس کا اجرا جون ۲۰۱۱ کو ہوا، اب تک آٹھ پرچوں کے علاوہ غزل نمبر، نظم نمبر اور اب افسانہ نمبر نکال چکا ہے ۔ افسانہ نمبر میں پچیس سے زائد افسانہ نگاروں کے افسانے شامل ہیں ۔ جن میں اردو کے معروف افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ترجم بھی شامل ہیں ۔ مادری زبانوں کے عالمی دن کے حوالے سے ۲۱ فروری ۲۰۱۵ کو سلیم اختر لائبریری (گوجر خان) میں پہلی دفعہ پوٹھوہاری زبان و ادب پر مضامین پڑھے گئے اور پوٹھوہاری مشاعرے کا اہتمام کیا گیا ۔ ۲۰۱۵ء میں راقم کی افسانوں کتاب ”کوکلے“ اور شیراز اختر مغل کی شاعری کی کتاب ”کنڑیاں“ شائع ہوئیں ۔ ۲۰۱۶ء میں راقم کی پوٹھوہاری لغت ”شیراز اللغات“ ہندکو اکیڈمی پشاور والوں نے شائع کی ۔ اسی طرح پوٹھوہاری زبان میں نئے لکھنے والوں کی بھی ایک بہت بڑی کھیپ سامنے آئی ۔ جن میں بابو محمد اکرم کلیامی مرحوم، تمکین تابانی،

سلیم شوالوی، علی قمر، احمد اصغر راجہ، اختر دولتالوی، تراب نقوی، ماجد وفا عابدی، اخلاق ساقی، قاضی غلام رسول، راجہ عامر افضل، راجہ شبیر طاہر (مرحوم) راجہ شاہد رشید۔ شہزاد عربی ناقش، عمران کوٹلی ستیاں، ڈاکٹر مزمل شاد، راجہ نذیر احمد بشیر، نذیر بٹ (مرحوم)، فیصل عرفان فیصل، ازرم خیام، ذہین احمد، اعظم احساس، علی راز، عظمت مغل، یعقوب انجم، خالد محمود خالد، حسن دلگیر، نیاز جوشی، علی ارمان، الیاس بابر، نثار ناز، توقیر ناشاد، ناصر محمود عاطر، شوکت معصوم، عمران جہانگیر، شکور احسن، راجہ شاہد رشید، صفیر عافی، مختار محل، شیراز اختر مغل، عمران عامی، احمد فاروق عامر، زاہد شیخ، وشال اسد، عاصم مغل، ظہور نقی اور خادم حسین خاکسار، عامر حبیب عامر، سعد اللہ سعدی، ذاکر حسین ذاکر، ضیاءالحسن ضیاء، نعمان رزاق، آصف خاکی، راشد محمود شام، عامر تنہا کیانی، شفیق سعدی، فاروق ناصر، الفت گل، نعیم اختر اعوان، غلام رضا شاکر، فاروق جرال، قمر ضیاء، انجم مسعود اسد، فرید زاہد کے علاوہ خواتین میں غزالہ تسلیم، پھولبر سلطانہ اور نازیہ وقار کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں جب کہ نزہت یاسمین مترجم کے طور پر پہچانی جاتی ہیں۔ جدید پوٹھوہاری ادب کے حوالے سے پوٹھوہاری شعرا کے کلام کے چند نمونے:

گڈی لنگھ گئی
تے پچھے رہ گیا
بھاں بھاں کرنا ٹیشن
تے شاں شاں کرنے کن (باقی صدیقی)

ٹٹ پاتھ اپر مری گیا کوئی
نہ کوئی بُلھے ڈسکے نہ کوئی اکھ روئی
کوئی دے مستانڑے گئے پچھو
نہ جاڑ جھلے نہ ای شہر بھوئی (افضل پرویز)

ساہناں سوٹھا کرنے لوک
نہ جینے نہ مرنے لوک
ناں بدناں آ ویلیاں
اپنے آپ توں ڈرنے لوک (اختر امام رضوی)

مھاڑے بیڑے لوکاں نے پرانے لغڑیں
مھاڑے ڈونگے لوکاں جوگے

گُھٹے کھیڑاں اِتی ڈنہ
نظر نُیں اساں اڈھنہ

غزل کا جدید لہجہ بھی ملاحظہ ہو
پِچھے پھاٹرے رَت سکائے ہوراں تائیں
بانئیے رانئیے، کپنئیے گانئیے چوراں تائیں (اختر عثمان)

ہِک ڈُووے نا مونہہ پِچھے تکنے بیٹھے سوچ کنارے
ڈل پانی وچ پیار نا بٹہ پہلوں کیہڑا مارے (دل پذیر شادؔ)

کہہ تُھوڑ رکہہ کاں
بکے پیو نے دو پُتر
بجّرے بجّرے تاں (عبدالقادر قادریؔ)

کسے کھوہے اج ماری چھال
چودھویں نی ادھی راتیں
کوئی ملیا آپنے نال (شعیب خالقؔ)

دُھن دولت نِیاں شکر دوپہراں
ننگے پِنڈے سارے
لمیاں لمیاں کاراں آلیاں
تُھاہی کے سارے کچے کوٹھے
پکے کوٹھے چاڑھے (آلِ عمرانؔ)

بدل گئے
بندے نُیں
لوک خدا نے غضباں کولوں
فِر وی
بَکیاں ڈرنے نُیں؟ (شاہد لطیف ہاشمیؔ)

وچ کچہری نظری اشنے
کالے کالے کوٹ
گِن انہاں نے نیہڑے کچھے؟
منگویں ساوے نوٹ (راجہ افضل عامر)

چنگے سنگی لوڑے نی
کنڈے نال چھوڑے نی (عارف ادیب کیانی)

مذہباں تے نظریاں کول
اصول بڑے بانکے وے
گلاں بہوں چنگیاں یاں
پر ایہہ میوے
کوہ کافیں پکے
کُنہاں کھادے؟
کُنہاں چکھے؟ (یاسر کیانی)

کُتھوں آئے
اِنھاں نیں موہنہ پر
رنگ برنگے رنگ
باشا پُچھ پُچھ تھکیا
پھلاں بھیت نا نہہ دسیا (اختر رضا سلیمی)

کدے کدے میں سوچناں آں
اپڑیں کھرے نیں
پکے فرشتے تھلوں
چیکاں ساوے کھا ہے نیاں (علی ارمان)

نھیرے نیں اس کفنے وچوں
دل کرنا میں نکل گچھاں

دوردراڈے
دیسوں وطنوں
جتھے چِڑیاں کاں بکھیرو
پھونہہ پھونہہ پانڑیں پینڑیں (شیراز طاہر)

کوئی وی شئے بیکار نئیں ہونڑیں
ربوں جس کی بار نئیں ہونڑیں
میں چکڑے وچ پھسیا ہنہ
میکی بھاویں باہر نانہہ کڈھو
مھاڑے اپر پیر رکھی کے
بچیو!
تُساں پار ہوئی گچھو (شیراز اختر مغل)

مھاڑیاں اکھیاں وچوں
پھٹنے آلی لو
مھاڑیاں اُچیاں سوچاں ناں
نتیجہ آ (شکور احسن)

گویاں ہوسن تے رولے ہوسن
ماپیے، ٹپھولے ہوسن
مھاڑے بیہڑے جنج نانہہ ڈھکی
میداں لائی لائی جندڑی تھکی
کاکی آں نانہہ یانڑی آں
بس!
غریب نی تھی رانڑی آں (نعمان رزاق)

☆☆☆☆

ڈاکٹر رشید نثار

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شعیب خالق

لمحے بُنتی اجرک

اُس نے مجھے جوگی روپ میں بیٹھا ہوا دیکھا تو وہ ہنسنے لگی۔ بوڑھے بوہڑ کے ڈھیروں پتے زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ اُس نے اُن پتوں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔ پھر اُنہیں دھویا، پھر پانی سے بھری بالٹی زمین پر اُلٹ دی۔ میں آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا۔ اُس نے جگانے کے لیے مجھے بلایا اور بولی ”دیکھ یہ زمین ہے اور میں اِس پر پیر رکھ کر وقت کی تصویر بنانے لگی ہوں“۔ اُس نے پیر زمین پر رکھا اور اُٹھا لیا۔ پھر کہنے لگی، ”یہ میرے پاؤں کی مورت ہے، اِس مورت میں ڈھیروں لمحے بھرے ہوئے ہیں“۔

میں نے آنکھ کھول، پاؤں کا دلکش نقش بنا ہوا دیکھا۔ اپنے آپ سے میں نے آہستگی سے کہا، ”یہ نقش تو آدھا ہے.......... پاؤں کے ایک اکیلے نقش کی ساتھ لمحوں کی اجرک نہیں بنائی جا سکتی، ایک پاؤں کے ساتھ دوسرا پاؤں بھی ہونا چاہئے“۔ میں نے ابھی اپنے ساتھ بات مکمل نہیں کی تھی کہ اُس نے پاؤں میں پہنی پازیب اُتار دی۔ پھر اُس نے دوسرا پاؤں دھو کر اُسے زمین پر ایسے رکھا اور اُٹھایا جیسے کوئی ٹھپہ لگایا جائے...... دوسرا پاؤں پہلے سے کچھ آگے تھا سو میں نے ذرا جھک کر دیکھا۔ پاؤں دونوں ایک جیسے تھے اور اُن پیروں کی دو لکیریں بھی گیلی مٹی پر نقش کی صورت دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے اپنی پاؤں شناسی سے کام لیتے ہوئے جان لیا کہ اِن پیروں میں گردشی زنجیر پڑی ہوئی ہے۔ ابھی میں پاؤں کا نقش پڑھ ہی رہا تھا کہ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

”تم نے جب دونوں پاؤں کو پکارا تھا تو اسی وقت میرے پاؤں خود بخود چلنے لگ پڑے تھے“۔ اُس نے پاؤں آگے بڑھا کر پازیب اُتار دی اور زمین پر وقت کی تصویر مکمل کر دی۔ میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ”اُس نے پاؤں کی پازیب اُتار دی ہے لیکن پاؤں کے کان تو نہیں ہوتے نا“۔ اُس نے میری خود کلامی نجانے کیسے سُن لی اور میں نے ابھی اپنے ساتھ بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ بول اُٹھی۔

”میرے پاؤں کے کان نہیں ہیں مگر زمین تمہاری گھُپ چُپ سرگوشی سن سکتی ہے“۔ میں نے سوچا وہ تو میری نیت بھی جان سکتی ہے۔ اُس نے اپنی آواز اونچی کرتے ہوئے کہا۔

”میرے پاؤں کا نقش اکیلا تھا، زمین نے میرا پاؤں بلایا اور اُسے اپنے ہاتھوں سے کھینچا، میرا دوسرا پاؤں خود بخود کھنچتا چلا گیا۔ میں نے اُس کے ساتھ بندھی پازیب اُتار دی اور اُس پاؤں نے آزادی کے ساتھ زمین پر نقش بنا ڈالا ہے“۔

”تم نے پازیب اُتار کے زمین کو میٹھے سُر سے محروم کر دیا ہے۔ تم اگر پازیب نہ اُتارتیں اور اُسے

پہنے ہوئے ہی زمین پر ٹھپہ لگاتیں تو زمین بھی دھمال ڈالتی اور پازیب کے گھنگرو بج اُٹھتے۔ یوں زمین کی خاموش دھمال میں کوئی چنچل سُر بھی شامل ہو جاتا''۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا، ''او پگلی، زمین کی چُپ گڑُپ دھمال میں اگر گھنگھروؤں کی آواز شامل نہ ہو تو کوئی کمی سی رہ جاتی ہے''۔

دونوں پاؤں کی پازیب بج رہی تھی۔ رقصاں قدموں میں چھنکار گونجنے لگی، مگر زمین پر قدموں کی تصویر بدستور خاموش رہی۔ وہ رُکی اور کہنے لگی ''تم نے بوہڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے وقت کو قید کر رکھا ہے۔ تمہارا گندا پسینہ دھرتی کی سانسوں میں رِس رِس کر اُسے ناپاک بنا چکا ہے تم نے زمین کو بدبودار کیا ہے''۔ اُس نے میرے اِردگرد ایک دائرہ کھینچ کر کہا، ''تم تھوڑی سی جس زمین پر بیٹھے ہوئے ہو وہاں تمہارے وجودی وزن کے باعث اُس کی صورت دب گئی ہے''۔ اس نے پازیب چھنچھناتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''زمین کے پاؤں میں گھنگھرو تو بندھے ہوئے ہیں۔ جس وقت وہ بجے تو اس وقت تمہارے کان سماعت کھو بیٹھیں گے۔ تم وہ چھنکار سن نہیں پاؤ گے''۔ وہ ہنسی اور آنکھیں مسکاتے ہوئے بولی۔ ''میں وہ چھنکار سن سکتی ہوں''۔ یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھی اور ناچنے لگی۔

اُس کے ناچتے قدموں نے زمین پر ایک دائرہ بنایا اور وہ چھلانگ لگاتے ہوئے دھڑام سے گرنے اور اُٹھنے لگی۔ اِس کے قدموں کی تھرتھراہٹ کے ساتھ زمین کی گونج بھی شامل ہو گئی۔ گھنگھروؤں کی سنگت میں جیسے ساز بجنے لگے۔ میں نے آنکھ کھولی تو دھرتی دھمال ڈال رہی تھی۔ گھنگھروؤں کی جھنکار گھوم رہی تھی اور میں ہی بس ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ پھر میں زمین کی دھمال سے عاجز آیا مگر اپنے وجود کے سنگھاسن کو پتھر بنا، گُھپ چُپ سادھے ہوئے تھا۔ اُس وقت چلتے لمحے رُک گئے تھے۔ میرے سامنے دو پھولوں جیسے کومل پاؤں زمین پر ٹھپہ لگاتے ہوئے تھرک رہے تھے۔ دونوں پاؤں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے اور دو قدموں کے عکس کے بیچ ایک انگلی برابر فاصلہ تھا۔ میں نے سوچا، ''میں وقت کی گُردن کو لکیر بنا کے ایک جگہ رُک اور اُسے تھام کر بس بیٹھ گیا ہوں۔ دونوں پاؤں کے بیچ ایک انگلی کا فاصلہ ایسے ہی پڑا رہا تو یہ فاصلہ بڑھنا شروع ہوگا اور بگاڑ بن جائے گا۔ یوں دونوں پاؤں آپس میں جُڑ نہیں پائیں گے''۔

میں نے آنکھیں میچ لیں اور وہ بھی ناچ ناچ کر تھک چکی تھی۔ اُس نے پازیب اُتار، دونوں پاؤں کی مورتوں کے درمیان زمین پر رکھ دی۔ پھر مجھے کہنے لگی ''میں نے دونوں پاؤں کے درمیان پازیب رکھ دی ہے۔ میری پازیب کے گھنگھرو زمین کے ساتھ نتھی رہیں گے اور ان کے درمیان کوئی پگڈنڈی نہیں ہوگی۔ وقت اپنی مستی میں چلتا اور آگے بڑھتا رہے گا''۔ اس نے بات سے بات نتھی کرتے ہوئے کہا، ''تم بھی آؤ اور زمین پر اپنے پاؤں کا ٹھپہ لگاؤ''۔ اُس نے فوراً مجھے جھٹکا دے اُٹھایا، گھما کے دائرے سے باہر پھینکا اور ہنسنے لگی۔ میں دھڑام سے زمین پر آ گرا اور پلٹ کر دیکھا تو دائرے کی زمین بھیگی ہوئی تھی اور اُس پر کوئی ٹھپہ نہیں تھا۔ وہ ہنستے ہنستے دور چلی گئی۔ دور سے آواز دیتے ہوئے کہنے لگی۔

''میرے پاؤں کا ٹھپہ پازیب باندھ کر ناچ رہا ہے۔ تم جس گول دائرے میں بیٹھے تھے وہ بنا بنایا

ہے۔ وہ دائرہ رس رسیلا نہیں، دیکھو، میرے پاؤں رسیلا ور کنول کے پھول جیسے ہیں"۔ وہ بھاگتی میرے قریب آئی میرے پاؤں زمین سے اوپر اُٹھا بولی، "تم بھی اپنے پاؤں کا ٹھپہ لگا دو"۔

میں نے اُسے کہا، "پاگل ہو تم جانتی نہیں پاؤں کا ٹھپہ وقت کا بدل نہیں ہو سکتا۔ تم پاؤں کے ٹھپوں کے ساتھ اسے ناپ نہیں سکتی"۔ پھر غصے کے ساتھ اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، "میں گول دائرے کا قیدی نہیں۔ میں نے اس گول دائرے کو اپنے وجود کی زنجیر سے باندھ رکھا ہے"۔

وہ کہنے لگی، "دھرتی کبھی کسی گول دائرے کے نقطے پر نہیں بیٹھتی ہم تو چوکڑ مار زمین کو صحن بنائے بیٹھے ہو، دیکھو، یہ، میرے پاؤں کا ٹھپہ دھرتی پر اور میرے گھنگھرو اسی کے اندر، تم بھاری بھرکم وزن سے زمین اپنے نیچے دبا کر بیٹھے ہوئے ہو، ذرا گول دائرے پر کان رکھ کر سنو، اِدھر کوئی گھنگھرو بجتا سنائی نہیں دیتا۔ تمہاری تپیا دھرتی کو کوئی گھنگھرو نہیں دے سکی"۔

میں اُس کی باتوں کو کسی پاگل کی بات جان کر چپ رہا اور اس کے پاؤں کے ٹھپے نزدیک بیٹھ سوچنے لگا۔ "میں اپنے آپ سے اگر کوئی بات کروں تو وہ سن لیتی اور میں کچھ کرنے لگتا ہوں تو وہ جان جاتی ہے۔ اُس کے حواس مجھ سے تیز ہیں یا میرا وجود بانجھ ہو گیا ہے۔ وہ فوراً نتیجہ نکال لیتی ہے اور میں نتیجہ نہیں نکال پاتا"۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور اپنی ہنسی قابو کرتے ہوئے بولی۔

"وقت ایک دریا ہے اور تم بوڑھے بوہڑ کے درخت نیچے بیٹھے ہوئے ہو۔ دریا اور چھاؤں دونوں الگ الگ ہیں۔ وقت اگر نہ ہوتا تو میرے پاؤں میں گھنگھرو بھی نہ ہوتے"۔

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگ گئی اور ہنستے ہنستے پاگل سی ہو گئی۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ پاگلوں کی طرح جنگل کی طرف بھاگتی چلی گئی۔ اُس کے ہنسنے کی آواز بھی دور جاتی رہی اور میں نے سینے پر ہاتھ رکھا تو دھک دھک دل کی دھڑکن ہاتھ پر دستک دے رہی تھی۔ ایک دھڑکنی ساز کی آواز بج رہی تھی۔ میں نے سوچا، "میرا دل ساز بجا رہا ہے مگر میرا وجود برف کی طرح یخ کیوں ہو گیا ہے۔ میں بوہڑ کی چھاؤں کو پھانسی گھاٹ بنائے ہوئے ہوں اور میرے دل کے کھٹولے پر جو بچہ سویا پڑا ہے۔ میں اُسے تھپکیاں دے رہا ہوں۔ ایسے ہی بوڑھا بوہڑ مجھے اپنی چھاؤں کی جھولی میں بٹھا کر خود دھوپ بادل بارش اور آندھی سے مجھے بچائے ہوئے ہے"۔

میں نے کپڑے جھاڑ کر گول دائرے کو مٹایا اور اُس کے پیروں کے نقش میں کوئی فاصلہ نہیں رہنے دیا۔ میں بھی اپنے پاؤں کے ٹھپوں کی اجرک بناتا بہت دور نکل گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو دونوں پاؤں کے درمیان پازیب پڑی تھی۔ پیروں کے ٹھپوں میں کوئی فاصلہ نہیں تھا اور میں نے جان بوجھ کر یہ فاصلہ نہیں رہنے دیا تھا۔

میں خوش تھا کہ میں نے اُس پگلی کے ہاتھوں کے ساتھ اپنی لگن کے پاؤں جوڑ لیے تھے۔ میں نے اب بوہڑ کی چھاؤں چھوڑ کر زمین پر اپنے پیروں کے ٹھپے لگانے شروع کر دیئے ہیں۔ میں اب وقت کے ٹھپے لگا کر لمحوں کی اجرک بُننے میں کھو چکا ہوں۔

شعیب خالق

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شعیب خالق

زخمِ حجم

وہ خلا اوڑھے کائنات کے کسی مقناطیسی گوشے میں ہونے اور نہ ہونے کے عین درمیان کھڑا، دونوں جانب خود کو گھور رہا ہے۔ ایک سمت نہ ہونے کا خمار پوری کائنات کو خود میں سموئے اور دوسری جانب ہو جانے کا وجود کسی دکھائی نہ دینے والے ذرے کی صورت اسے گھورتا نظر آیا۔ ایسے میں دھیان کی پلٹ اور مقناطیسی کشش ہاتھوں کی لکیروں سے رگڑتے ہوئے وہ اپنے انگوٹھے کے نشان کی دائراتی لکیروں کا مرکزی نقطہ روشن کرنا چاہتا ہے۔ انگوٹھے کا نشان، کائناتی وراثت کا گمان بن کر اُس کے ہاتھ میں پکڑے چمکیلے سیاہ گولے میں ظاہر ہوتا اور وہ اسے دیکھ خوشی سے بے حال ہو جاتا ہے۔ گیند نما سیاہ گولے کو فتح یاب احساس کے ساتھ ہاتھوں میں اُچھال اور خلائی دھمال ڈالتے ہوئے اُس کا وجود کائنات کی طرح لامحدود ہو گیا ہے۔ ہر جانب دور و نزدیک ستاروں کے جھرمٹ جھومتے دیکھ وہ بھی اپنے بدن اور تخیل کے درمیان، حیران حسیات میں ڈوبا۔ اپنی پہچان کی سرشاری میں کہکشاؤں کی مانند جھومنے لگا ہے۔

جھوم اور گھوم کے درمیان ایک ستارہ، گردشی لرزاہٹ میں ڈولنے کے بعد، روشنی کی لکیر بن کر اسے اپنی جانب آہستگی سے آتا نظر آ رہا ہے۔ ستارہ ٹوٹنے کی دھمک کا دھیان، اپنا آپ دوہراتا ہے اور کائناتی اجسام کے اربوں کھربوں روشن و اندھیر ذرے، بکھرنے سے پہلے اسے ایک وجود کی کشش میں پیوست نظر آتے ہیں۔ پھر اربوں نوری سالوں کی مسافتی کروٹ، اپنے ایک ہونے کے غبار کے انتشار کا شکار ہوتی ہوئی اردگرد کے دائمی اندھیرے اور مہیب سناٹے میں، ایک بڑے دھماکے کی صورت کشش اور گردش کے دائرے کائنات میں بکھیر ڈالتی ہے۔ یوں گردشی دائروں میں گھومتے ایک اِک ذرے کی داخلی کشش و گردش ایک ہونے کی بازگشت بن کر کائناتی رقص میں شامل ہو جاتی ہے۔

گزرے زمانوں کو اندھیرے میں جھٹک وہ سیاہ گولے کو بھی پاتال کی جانب کمال بے نیازی سے پھینک دیتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی ایک لکیر کا سرا گولا خود میں پیوست کیے دور اُڑتا چلا جا رہا ہے۔ لکیر کا دوسرا سرا اُس کے ہاتھ کی کشش سے بندھا ہوا ہے۔ سو وہ جب چاہے گولے کو واپس بھی کھینچ سکتا ہے مگر اپنی جانب رواں وہ ٹوٹے ستارے کی روشنی کو قہار نگاہی سے دیکھتا اور اپنا ہاتھ ہتھیلی کھول بلند کرتا ہے۔ بلند ہاتھ کی لکیریں ہتھیلی کی پکڑ سے نکل دھاگوں کی صورت، ستارے کی روشنی کو خود میں اُڑس لیتیں اور پھر چند زناٹے دار گھماؤ

کے بعد اُس کی سمت بدل دور پھینک ڈالتی ہیں۔ روشنی دھاگوں کی جھنک سے دور جاتے ہی لکیریں واپس ہتھیلی کی کشش آلود گہرائی میں اپنی خالی جگہ سے آ لپٹی ہیں۔ وہ ہتھیلی زبان سے چاٹتا اور قہقہہ لگاتا ہے۔ قہقہے کی بازگشت پوری کائنات کی کہکشاؤں کو منور کر ڈالتی ہے۔ کائنات میں بکھرے ستارے اسے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کے ساتھ بندھے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور ہر اک ستارے کا حیاتی نشہ اس کے باطن میں اُتر جاتا ہے۔

وہ جو کائنات میں ہونے اور نہ ہونے کے عین درمیان کھڑا ہے، وہ اپنا چہرہ دیکھنے کا بھی منتظر ہے۔ بس کوئی احساس ہے جو اسے اپنے وجود کی گواہی محسوس ہوتا ہے وگرنہ وہ کوئی بھی نہیں اور سب کچھ بھی وہی ہے۔ ایسے ہی وہ خود کو جسم اور روح کی دو انتہاؤں میں تقسیم کر کے سیاہ مقناطیسی گوشے تک آیا ہے تو اسے محسوس ہوا ہے جیسے وہ کہیں بھی نہیں اور ہر جگہ موجود بھی ہے۔ وہ جانتا ہے اگر وہ اپنی سانس اندر کھینچے تو پوری کائنات، تمام کہکشاؤں کے ساتھ اس کے جسم میں سمٹ آئے گی۔ یونہی اس کی پھونک خلائی آندھی بن کر کہکشاؤں کو بھی اُن کی گردشوں سے نکال اور اُڑا لے جائے گی لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گا کیوں کہ نہ ہونے کے وجود سے ہی پھر ہونے کا وجود پھوٹ نکلے گا۔

دور کہیں دودھیا کہکشاں اسے اپنی جانب ہاتھ ہلاتی اور بلاتی دکھائی دیتی ہے۔ اس مانوس کہکشاں کو غور سے دیکھتے ہوئے ایک موہوم سی رقعت اس کی حسیات میں درد آلود چٹکی کاٹتی ہے۔ وہ اس کہکشاں کو قریب لانا چاہتا ہے مگر اسی لمحے کہیں کسی سورج کا دھیان اُبھرتا اور درد کی مٹھاس بھری کیفیت، کائنات کی تمام سمتیں اس کی آنکھوں میں سمیٹ لاتی ہے۔ کسی ایک سمت میں اسے سیاہ چمکیلا گولا دکھائی دیتا ہے۔ وہ دیکھتا اور مسکراتا ہے۔ گولا دودھیا کہکشاں کو اپنے کھچاؤ کی فضا میں پرو چکا ہے۔ وہ قہقہہ روکتا اور صرف دھیمی ہنسی ہنستا ہے۔ انتہائی کشش دودھیا کہکشاں کے ذروں میں موجود خلا خارج کرتی ہوئی گولے کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے۔ کہکشاں اپنی روشن دھول میں دھندلائی سیاہ چمک سے ٹکراتی اور سکڑ کر کسی معمولی سے دھبے کی صورت گولے کی سطح پر چپک جاتی ہے۔ یہ منظر دیکھ وہ اپنا ہاتھ بلند کر کے ہتھیلی کھول تمام لکیروں کی کشش ایک لکیر میں یکجا کرتا اور وہ لکیر گیند نما گولے کو واپس اُس کی مٹھی میں کھینچ لاتی ہے۔

اس بار بھی اپنے ہونے کی خوشی اس کے اندر ہچکولے کھاتی اور کائنات کو دھمال میں شامل کر لیتی ہے۔ دودھیا کہکشاں کے کسی ایک ذرے کی مہک خلاء میں چاروں اور پھیلتی اور سیاہ گولا اپنے چمکیلے وجود سے ایک روشن بلور اُگلتا ہے۔ وہ ایک ہاتھ میں سیاہ گولا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں بلور کو پوروں سے سہلاتا، مسکراتا اور اسے دیکھے جاتا ہے۔ اس دوران میں مقناطیسی گولا اسے بلور میں گم دیکھ اس کی ہتھیلی پر دھاگے کا دوسرا سرا نکالتا، واپس ایک لاتعلق آزادی کے ساتھ پاتال میں اُتر جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے نہ ہونے کے گمان میں لپٹا کوئی شے اپنے ہاتھ سے چھوٹ چلے جانے کا دھیان جھٹک، ٹھوس بلور کے اندر کی جھلک میں مسکراتا اور اسے دیکھتا چلا جاتا ہے۔ اسے بلور میں چھپے ڈھیروں سورجوں میں سے ایک سورج اپنے ہونے کی تمازت بن

کر بے چین کیے ہوئے ہے۔ وہ بار بار روشن بلور کو انگلیوں کی پوروں پر گداز دباؤ کے ساتھ مسلتا ہے۔ اس کے انگوٹھے کی گول لکیریں، بلور کے اندر دھاگوں کی صورت اتر جاتی ہیں۔ لکیروں کا ابتدائی نقطہ چمک اُٹھتا۔ جس کی روشنی اور کشش اس کے اندر اترتی اور جذب ہو جاتی ہے۔

اچانک اسے اپنے وجود کی موجودگی کا نیا احساس اسی مانوس سورج کی لذتی تپش میں پرو لیتا ہے۔ وہ کسی انجانی تسکین کو جانے بغیر اس کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ کائنات بھی جیسے اس کے انگوٹھے کی دائراتی لکیروں کے مرکزی نقطے پر حیران نظریں جمائے ہوئے ہے۔ نہ ہونے کا دائرہ جب ہونے کی لہر میں ڈھلتا ہے تو کائنات اپنے خارج کے ساتھ اسے گھورتی ہے۔ ایسے میں وہ چاہتا ہے گولے کی چمکیلی سیاہی میں اپنا عکس دیکھے مگر وہ جانتا ہے ہاتھ کی لکیر کا دھاگہ ٹوٹ کر اس کی دسترس سے دور جا چکا ہے۔ وہ بلور کو ایک ہاتھ کی انگلیوں میں گداز گھماہٹ سے اوپر تلے کرتا اور اسے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ ہتھیلی اوپر اٹھاتا اور بلور کا توازن سنبھالتے ہوئے۔ اسے نگاہوں کے عین سامنے رکھ غور سے دیکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ غور کی پگھلاہٹ سے بلور گیلاہٹ میں ڈھلتا اور ایک سیال مادہ بن اس کی ہتھیلی کی لکیروں پر اپنی مقناطیسی حدوں کے اندر ڈولتا چلا جاتا ہے ایک ڈول سیال مادے کے اندر وہی مانوس سا سورج اُبھارتا جو سطح پر آ کر تیرنے لگتا ہے۔ وہ سیال مادے پر دوسرے ہاتھ کی شہادت والی انگلی کی دائراتی پور سے سورج کو چپکانے کی کوشش کرتا اور اس میں اپنی حسیات اتار دینا چاہتا ہے۔ مگر وہ شہادت والی انگلی روک لیتا اور کسی کشش میں گم ہوا خود سیال مادے کے اندر اتر جاتا ہے۔

نگاہوں کی باریکی سورج کے گرد گھومتی زمین جب دیکھتی ہے تو اس کی روشن جھلک ایک بار پھر اس کی رقعت باندھتی اور نگاہوں کے پانی سے دھندلا جاتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اب وہ اُن سیاروں کے حجم سے کہیں دور چلا آیا ہے۔ جن کا قطر سورجی نظام کے گردشی دائرے سے بھی بڑا تھا۔ اسے ان بڑے سیاروں میں وہ سیاہ چمکیلا گولا بھی گمان میں آتا ہے جو اس کے ہاتھوں کا کھلونا تھا۔ ایسا کھلونا جو اس کے نہ ہونے کے کشف سے پھوٹا تھا اور تمام کہکشائیں اس کی مقناطیسی قوت کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں مگر اب وہ ہونے کی حدوں میں دکھائی نہ دینے والے ذرے جتنا سیارہ خود میں ختم کرتا چلا جا رہا ہے۔

انتہائی چھوٹے دائرے میں ڈوبتا اور نہ ہونے کی کشش و گردش کو پھلانگتا، ہو جانے کے وجودی احساس کی طرف بڑھتا ہے۔ روشنی کی رفتار اسے عدم سے موجود کی جانب لیے چلتی اور زمین کی مقناطیسی فضا میں داخل ہوتے وقت روشنی کی رفتار میں بھی ایک غیر مانوس جھٹکا نما ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور رفتار کا احساس بدل وہ زمین کی جانب بڑھنے لگا ہے۔ اگلے ہی لمحے زمین کے روشن اور رنگین گولے پر ایک براعظم اپنی گھوم میں لپٹا سامنے آیا ہے۔ پھر اس براعظم کے ایک ملک کا جغرافیہ بھی سمٹا اور شہر کے کسی چھوٹے سے علاقے سے ہوتا ہوا وہ اپنے گھر کی لائبریری میں واپس لوٹ آیا ہے۔

میز پر پڑی کتابوں کے اوپر دھرے فون کی بیل بجتی ہے۔ وہ رائٹنگ پیڈ سے نظریں ہٹا اور فون پر آگے جھک کر نمبر دیکھا گوارا انداز سے قلم کاغذ پر رکھتا ہے۔ اب وہ فون اُٹھا قدرے غصہ ضبط کرتے ہوئے مختصر بات کے بعد فون فوراً بند کر دے گا۔

“ہیلو، پٹواری صاحب، وعلیکم...... او یار ڈیتھ سرٹیفکیٹ عدالت میں جمع کروائے بھی بہت دن گزر چکے۔ اب اس زمین کا انتقال چڑھاؤ میرے نام اور کہانی ختم کرو۔”

☆☆☆☆

شیراز طاہر

پوٹھوہاری ترجمہ: شیراز طاہر

کتے

میری بے کفن لاش بھی انھی لاوارث لاشوں میں رکھی گئی تھی، جن پر رونے والوں کے آنسو اور قبرستان میں پھیلے درختوں پر بیٹھے پرندوں کی بیٹیں کب کی خشک ہو گئی تھیں۔ پولیس ان لاوارث اور بے شناخت لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد بہت خوش تھی اور اپنی اس کارکردگی پر فخر محسوس کر رہی تھی کہ اس نے انسانی اعضا کے چیتھڑوں کو اکٹھا کر کے نہ صرف انھیں باقاعدہ لاشوں کی شکل دے دی تھی بلکہ ان پر کپڑوں کے سفید تھان بھی لپیٹ دیے تھے۔ خودکش حملوں میں سر تو صرف دہشت گردوں کے تلاش کیے جاتے ہیں۔ باقیوں کے سروں سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ان کی صرف بکھری ہوئی بوٹیاں جمع کی جاتی ہیں۔ سرکاری اہلکار مطمئن تھے کہ اس دھماکے میں مرنے والوں میں ان کا اپنا کوئی آدمی نہیں تھا جس کے لیے انھیں پانچ دس لاکھ کا اعلان کرنا پڑے۔ لوگ بھی مطمئن تھے کہ معاملہ نبڑ گیا۔

کچھ ایسا ہی سوچتے ہوئے اُنھوں نے تدفین کی غرض سے میری بے کفن میت اٹھائی تو اس کے پاس کھڑی میری روح بول اُٹھی۔ ”ان لاوارث لاشوں کے نام تو تمھیں نہیں مل سکے، مگر ان کا خون کرنے والوں کے نام اور پتے بھی تم نے ان کی قبروں میں ان کے ساتھ کیوں دفن کر دیے ہیں۔ نام کبھی نہیں مرتے، نام تو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ پھر ان خونیوں کے نام جنھوں نے بے گناہ خون کیا ہوتا ہے اگر قبروں میں دبا بھی دیے جائیں تو زیادہ دیر تک مر نہیں سکتے جی اُٹھتے ہیں۔ کیوں کہ مُردوں کے ساتھ زندے زیادہ دیر تک تنگی برداشت نہیں کر سکتے۔ مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ تم نے ان لاوارث، بے شخصی لاشوں اور ان خونیوں کے درمیان سمجھوتہ کیسے کرا دیا؟“

”روح ہونے کے ناطے تم اپنی میت کے فیصلے کا حق تو ضرور رکھتی ہو، مگر کسی دوسری میت یا ان کا خون کرنے والوں کے بارے کسی قسم کا حق نہیں رکھتی۔ ہم ان کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اگر ان کے حوالے سے تمھیں کوئی اعتراض ہے تو بات کر دیتا کہ ہم اسے بھی تن کتوں کے ساتھ دفن کر دیں۔ ہم ان کی خاطر کل رات سے یہاں لٹکے ہوئے ہیں۔“ ان میں سے ایک، اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ میری روح کچھ شرمندہ سی ہو کر فضا میں ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور گویا ہوا:

”روح تو سب کی سانجھی ہے۔ اس نے تو اپنے تئیں ایک بات کی تھی۔ تم لوگوں نے اس کی قدر نہیں

کی، رہی بات فیصلے کی تو وہ میں تم سے خود بھی کرا سکتا ہوں۔ مجھے تم کس کھاتے میں ان لاوارث لاشوں کے ساتھ دفنانے کی کوشش کر رہے ہو؟ میں تو اسی شہر کا رہنے والا ہوں تم سب مجھے جانتے ہو۔ میرا سر بھی سلامت ہے اور دھڑ بھی۔ میں نہ تو دھماکہ کرنے والوں میں سے ہوں اور نہ ہی دھماکے میں مرنے والوں میں سے۔ میں تم لوگوں سے دست بہ دستہ درخواست گزار ہوں کہ مجھے ان لاوارث لاشوں کے ساتھ دفن نہ کرو۔ پہلے یہ فیصلہ کرلو کہ مجھے مارنے والے کون ہیں۔؟ کم از کم میں ان کے ساتھ دفن ہو کر لاوارث ہونا نہیں چاہتا۔ اگر تمھیں میرا یہ فیصلہ منظور ہو تو مجھے قبر میں اتار دو، ورنہ کوئی بھی راہ چلتا مجھے قبر میں اتار دے گا۔'' روح میری بات سن کر کچھ مطمئن سی ہو گئی۔

برگد کے درخت میں چھپے بیٹھے پرندوں کی طرح لوگوں نے میری طرف دیکھا۔ پھر برگد پر اترتے اندھیرے کی طرف نظر دوڑائی اور آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ خوشی جو، کچھ دیر پہلے، سب کے چہروں پہ کھلی ہوئی تھی، اچانک غائب ہونا شروع ہو گئی۔ سب کی آنکھیں بلوروں کی طرح میرے چہرے پہ جم گئیں۔ جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو یا میرے منہ سے کوئی گالی نکل گئی ہو۔ ان میں سے کچھ منہ بسورتے ہوئے چل دیے اور کچھ منہ اٹھائے وہیں کھڑے رہے۔

اپنی دانست میں، میں نے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کی تھی۔ پتہ نہیں وہ کس قسم کے لوگ تھے۔ ان میں سے کوئی بھی میرے لیے اجنبی نہیں تھا سبھی میرے ساتھ پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ سب نے ایک عمر میرے ساتھ گزاری تھی۔ ان میں سے بیشتر تو ہر ماہ پنشن بھی میرے ساتھ لینے جایا کرتے تھے، لیکن پتہ نہیں کیوں میری بات کا برا مان گئے۔ میں چپ ہو گیا، آخر مرا ہوا آدمی کتنا کچھ بول سکتا ہے؟ میرا گلا تو پہلے ہی موت کی تلخی سے سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔

شرم سے میرا وجود مزید سکڑے جا رہا تھا۔ میری روح جو میری لاش کی نگرانی کے لیے بیٹھی ہوئی تھی، اٹھی اور اڑ کر برگد پر بیٹھے پرندوں کے ساتھ پر پسار کر بیٹھ گئی اور میں مزید تنہا ہو گیا۔ دو چار آدمی اس گہری ہوتی شام کے بعد آئے اور میری چارپائی کے قریب سے ہوتے ہوئے ایک تازہ قبر پر کھڑے ہو کر اگربتیاں جلا کر دعا مانگنے لگے۔ ہلکے ہلکے دھوئیں اور ملگجی اندھیرے میں خوف سا لہرانے لگا۔ دعا کے بعد جب وہ جانے لگے تو وہ لوگ بھی جو پہلے میری لاش کے اردگرد کھڑے تھے، ان کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ یہ دیکھ کر میں نے انھیں دکھ بھری آواز میں پکارا:

''خدا کے لیے واپس آ جاؤ۔'' سب نے ایک ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولے:

''ہم تیرا کفن دفن تو کر سکتے ہیں لیکن تیرے وارث یا لاوارث ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں لگتا ہے کہ تیری میت آج رات بھی یہیں پڑی رہے گی۔''

''میرا فیصلہ اگر تم آج نہ کر سکے تو پھر یہ فیصلہ قیامت تک نہیں ہو سکے گا۔'' یہ سنتے ہی سب ماسک

چڑھے چہرے لیے چل پڑے۔ میں نے دوبارہ کہا۔ ''اچھا یہ بات ہے تو یاد رکھو! میں اپنا فیصلہ اب انسانوں کی بجائے کتوں سے کراؤں گا۔ فوجی گھروں کے کتے بلاؤں گا۔ میرا تم سب پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ اب میں ان کتوں کو ساتھ لے کر پورے گاؤں میں گشت کراؤں گا جو میری بات کا نبیڑا کریں گے۔''

برگد پر بیٹھے پرندے پھڑ پھڑانے لگے۔ روح گھنے پتوں سے نکل کر چوٹی پر جا بیٹھی۔ بابے قاشو کی زیارت کے جن اور بھوت انسانی شکلوں میں باہر آ گئے۔ تازہ قبر پر جلتی اگربتیوں کی خوشبو پورے قبرستان میں پھیل گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب میری چارپائی قبرستان سے اٹھ کر گھر کے صحن میں چلی جائے گی، جہاں اس کے اردگرد میرا سارا قبیلہ دھاڑیں مار کر مجھے لاوارث ہونے سے بچا لے گا۔ ساری عمر دشمنی پالنے والے لوگ بھی جب میت پر آتے ہیں تو پگھل کر رہ جاتے ہیں۔ میں نے جاتے ہوئے لوگوں کی سرگوشیوں پر کان دھرنے کی کوشش کی۔ کوئی آواز واضح طور پر سنائی نہ دی اور میرے تمام بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں نے ہارے ہوئے آدمی کی طرح لوگوں کو اپنے سوکھے ہوئے گلے سے ایک بار پھر پکارا۔

''میری میت کو تنہا مت چھوڑو، جس میت پر کوئی رونے والا نہ ہو وہ بھی تو لاوارثوں میں شمار ہوتی ہے۔'' میری چیخ پکار سن کر برگد کی شاخ پر بیٹھی میری روح لرز کر رہ گئی۔ وہیں اونچی شاخ پر بیٹھے بیٹھے بولی۔

''منت سماجت سے تو بہتر ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ تو بھی سمجھوتہ کر لے۔ اچھا بھلا تجھے قبر میں اتارنے والے تھے مگر تیری ہٹ دھرمی تیرے ساتھ مجھے بھی ذلیل کر کے چھوڑے گی۔ تجھے پتہ ہے کہ روح اور بدن میں کیا فرق ہوتا ہے۔؟ مرنے کے بعد بدن جس قدر بھاری ہو جاتا ہے روح اسی قدر لطیف ہو جاتی ہے۔ جو کچھ وہ دیکھتی ہے بدن نہیں دیکھ سکتا۔ تو اپنی لاوارثی کا فیصلہ کراتا رہ تجھے میرے عذاب اور میری دربدری کا ذرا بھی خیال نہیں۔ میں کب تک ان ٹہنیوں پر بیٹھی تیرے کتوں اور تیرے کھوجیوں کا انتظار کرتی رہوں گی۔ پرندے بھی بس صبح ہونے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ صبح ہوتے ہی یہ بھی اڑ جائیں گے۔ تو مجھے تنہائی کی سولی پر نہ ہی لٹکائے تو اچھا ہے۔ میں تیری روح ہوں، تجھے لوگوں کی طرح تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ تو تو اپنی حیاتی اور اس جہان کا عذاب کاٹ گزرا ہے اگلا عذاب تو میری اکیلی جان پر ہے۔ مجھے کہیں ٹھکانہ کرنے دے، اپنا فیصلہ کرانے کی بجائے لوگوں سے اپنے کفن دفن کی درخواست کرتا کہ لوگ واپس آ جائیں۔ اس اندھیری رات کا عذاب میں ان درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر نہیں جھیل سکتی اور نہ ہی درختوں پر بیٹھے ان پرندوں کی گندی بیٹوں سے تیری لاش بچا سکتی ہوں۔ تجھے اپنے فیصلے کی پڑی ہے اور مجھے منکر نکیروں کے سوالوں کے خوف نے سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ اگر تیری یہی ضد ہے تو میں بھی چار و ناچار تیرے ساتھ فوجیوں کے ''کتا گھر'' چلتی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور کرنا کہ مجھے ''کتا گھر'' سے کچھ فاصلے پر کہیں بٹھا دینا۔ مجھے بھونکتے ہوئے کتوں کی اندھیرے میں چمکتی ہوئی آنکھوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔'' روح اپنا احسان جتاتے ہوئے بولی۔

لوگ تو پہلے ہی جا چکے تھے اب روح بھی پرواز کرنے اور اپنے ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے مجھے ہر

طرح سے راضی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ادھر قبروں کے آس پاس مختلف طرح کی دبی دبی چیخوں کی آوازیں ابھرنا شروع ہو گئی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ صبح ہونے سے پہلے کسی نہ کسی طرح میرا فیصلہ ہو جائے۔ تب مجھے ایک مرتبہ پھر گہری نیند سوئے ہوئے گاؤں کے لوگوں کا خیال آیا۔ کاش یہ لوگ جاتے جاتے میرا فیصلہ کر جاتے۔ ایسا سوچتے ہوئے اونچے "علم" کی روشنی اور کچے تالاب میں اترا ہوا چاند میرے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور میرے قدم بے ساختہ "کتا گھر" کی طرف اُٹھنے لگے۔ کتے تو جیسے ہمارے ہی منتظر تھے۔ دیکھتے ہی بھونکنے لگے۔ مالک نے ان کے بھونکنے کی آوازیں سنیں تو باہر نکل کر سوال کیا۔

"تمہیں چوروں کا سراغ لگانے والے کتے درکار ہیں یا قاتلوں کا سراغ لگانے والے؟"

میں متذبذب ہو گیا۔ "مجھے نہ تو چور پکڑنے والے کتے درکار ہیں اور نہ ہی خون سونگھنے والے۔ میرا خون تو کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ میرا خون تو پہلے ہی نچوڑ لیا گیا تھا اور خون کی اسی کمی کی وجہ سے میری موت واقع ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔

"میں ان دھماکوں میں مرنے والوں کے ساتھ دفن ہونا نہیں چاہتا کیوں کہ یہ سب بے شناخت مارے گئے اور نہ ہی ان کا کوئی وارث ہے یہ سب قیامت تک لاوارث رہیں گے۔ لیکن میں تو نہیں ہوں۔ میری تو گردن بھی میرے ساتھ ہے۔"

"تمھارے ایسا کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اگر کتے تمھارے قاتلوں تک پہنچ گئے تو سب کو یقین آ جائے گا کہ تو ان کے ساتھ نہیں مرا، اور نہ ہی تو کوئی لاوارث ہے، تیری قبر الگ ہو سکتی ہے اور تیری قبر پر تیرے نام کا کتبہ بھی لگ سکتا ہے۔" روح، جسے اپنے ٹھکانے پہنچنے کی جلدی تھی، عجلت میں بول اٹھی۔

"اچھا کتوں کو لے چلو۔" میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ کتے گاؤں کی طرف ایسے سرپٹ دوڑے جیسے گاؤں میں بھونچال آ گیا ہو۔ سوئے ہوئے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ پورے گاؤں میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ مال مویشی کھونٹوں سمیت بھاگ کھڑے ہوئے۔ تالاب میں ڈوبے ہوئے چاند کا دم گھٹنے لگا۔۔۔ ظلم زیادتیاں اور جبر سہنے والے کمی کمین۔۔۔ سود کی چکی میں پسے غریب۔۔۔ زمینوں کو رہن رکھے بھوکے کسان۔۔۔ اولاد کی خوشیوں کی خاطر قرض کے بوجھ تلے دبے ماں باپ۔۔۔ کمر توڑتی مہنگائی کے ہاتھوں صدیوں سے مارے لوگ۔ اپنی اپنی قبروں سے کفن پہنے شرموں کی طرح باہر نکل آئے۔ سرکاری لوگ، گاؤں کی مرکزی مسجد کا امام ، بابا کاشو شاہ کی گدی کا سجادہ نشین، موج دین سنیارا، کھاد اور چینی کا سٹاک رکھنے والے شیخ حیدر کے ساتھ ساتھ علاقے کی پولیس بھی پورے گاؤں سمیت قبرستان میں آ کھڑی ہوئی۔ پچھلی رات کے رت جگے سے تمام لوگوں کی آنکھیں ابھی تک لال سرخ ہو رہی تھیں۔ کتوں کو پھٹی پھٹی ہوئی نظروں دیکھتے ہوئے کہنے لگے "جو یہ کہتا تھا اس نے وہ کر ہی دکھایا۔"

کتے بھوکے شیروں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے سرکاری

اہلکاروں کے پیروں کو سونگھا۔ پھر بڑی مسجد کے امام صاحب کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تسبیح اور پرنے کی طرف لپکے۔ بابا کاشو شاہ کے گدی نشین کے سنہرے تاروں سے بنے چوغے کو دانتوں سے پکڑ کر کھینچا، جس پر غریبوں کے خون کے دھبے صاف نظر آ رہے تھے۔ پھر پولیس والوں کی پیٹیوں میں دانت گاڑھتے ہوئے شیخ حیدر کی سفید ٹوپی پر جھپٹا مارا۔ اس جھپٹا جھپٹی میں پرندوں نے اپنے اپنے پروں کو زور سے جھاڑا تو برگد کے نیچے پروں کا ایک ڈھیر سا لگ گیا۔ روح پھر اُڑتی ہوئی برگد پر جا بیٹھی۔ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سن کر لوگ، جو دور کھڑے تھے، دوڑتے ہوئے آگے بڑھے۔ کتوں نے سونگھنا چھوڑ دیا۔ تو وہ لوگ جنھیں کتوں نے سونگھا تھا اور کتوں کا مالک جنھیں شک وشبے کی نظر سے دیکھ رہا تھا، یک زبان ہو کر بولے:

”ہم میں سے کسی نے بھی اسے نہیں مارا ہے۔ کتے یوں ہی باؤلے ہو رہے ہیں۔ ہرایرے غیرے کو سونگھ رہے ہیں۔ سدھائے ہوئے کتے تو ایسا نہیں کرتے۔ وہ تو صرف مجرم کی شناخت کرتے ہیں سارے گاؤں کو تو چور اور قاتل نہیں بناتے۔“ انہوں نے باقیوں کو بھی اپنے ساتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”کتوں کو ایک بار پھر چھوڑ کر دیکھتے ہیں۔ اگر وہ کسی ایک آدمی کو سونگھتے ہیں تو وہ اس کا قاتل کا نکھیڑا ہو جائے گا۔“ کتوں کا مالک گویا ہوا۔

”اگر فیصلہ ہو گیا تو بھی اسے قبر میں اتارنے کی مصیبت تو ہمیں ہی اٹھانا پڑے گی۔“ اردگرد کھڑے لوگوں میں سے کوئی گویا ہوا۔ اس بیچارے کی بات کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی اور کتے دوبارہ چھوڑ دیے گئے۔ کتوں نے ایک مرتبہ پھر ان تمام لوگوں کو سونگھا، جنھیں وہ پہلے بھی سونگھ چکے تھے اور پھر مغرب کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگے۔ کتے گِھروں کے مالک بھی کچھ ڈھیلے پڑ گئے کہ کتے کسی ایک شخص کی نشاندہی نہیں کر پا رہے تھے۔ لوگوں میں کھسر پھسر شروع ہو گئی اور وہ تمام لوگ جنھیں کتوں نے سونگھا تھا، دوبارہ شیر ہو گئے اور للکار کر کہنے لگے۔

”لاؤ کدال اور بیلچے، کاٹو اس کی گردن۔ اسے چپ کراؤ اور جلدی سے قبر میں اتارو۔ کہیں یہ کوئی اور مصیبت نہ کھڑی کر دے۔“ یہ سن کر تمام لوگ ایک ساتھ آگے بڑھے۔ روح چپ سادھے میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی کہ میں اپنی صفائی میں کوئی ٹھوس دلیل نہیں لا سکا تھا۔ میرا گلا سوکھے ہوئے چمڑے کی طرح خشک ہو گیا تھا۔ اگرچہ میری زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی مگر میں نے اپنی تمام قوت مجتمع کرتے ہوئے بہ مشکل کہا:

”کتے سچے ہیں اور تم سب جھوٹے۔ وہ تمام لوگ جنھیں کتوں نے سونگھا میرے قاتل ہیں۔ دیکھ لو تمام کتے مغرب کی طرف منہ کر کے اس کی گواہی دے رہے ہیں۔ اب بھی اگر تمھیں یقین نہ آئے تو میں کیسے تمھیں یقین دلا سکتا ہوں۔“

مرکزی مسجد کے امام صاحب آگے بڑھے اور کہنے لگے:

’’جو کتے قبلہ کی طرف منہ کر کے بھونکتے ہیں وہ نحس ہوتے ہیں۔ ‘‘سب نے امام صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی۔ میں یہ سن کر تڑپ اٹھا:

’’تم سب کو بھی انھی لوگوں نے مار رکھا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں میت کی صورت چارپائی پر پڑا ہوا ہوں اور تم چل پھر رہے ہو۔ یاد رکھو! اگر کتے بھی ہمارا فیصلہ نہ کر سکے تو یہ فیصلہ قیامت تک کوئی نہیں کر سکے گا۔ ہم ہمیشہ اسی طرح بے شناخت رہیں گے اور کوئی بھی ہمارا وارث بننے کو تیار نہیں ہوگا۔‘‘

ہجوم میں سے کسی نے بھی میری بات کی طرف دھیان نہیں دیا اور سب مل کر مجھے قبر میں اتارنے لگے۔ میں نے کتوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اپنے مردہ بدن میں بکھری تمام قوتِ گویائی کو حلق میں سمیٹنے کی کوشش کی مگر میرے نرخرے سے ایک ہلکی سی خرخراہٹ کے سوا کچھ برآمد نہ ہو سکا۔

☆☆☆☆

علی عدالت

پہاڑی، پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

ایک چھوٹی سی بڑی کہانی

وہ ایک عرصے کے بعد تنّی کو قائل کر سکا تھا، کہ پاکستانی کشمیری بھی انسان ہوتے ہیں۔

آج وہ خود اس کے پاس چلی آئی تھی۔

ٹیک اوے کے باہر بیٹھ کر انہوں نے جی بھر کر کھایا پیا۔ تنّی بار بار اس کو خاص نظروں سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی تھی۔

آج وہ بھی اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھنے لگا تھا اور بہت خوش تھا کہ اس نے خود کو منوا لیا ہے۔ تنّی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اس سے شادی کر رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر اسے اور کیا مل سکتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔

واہ کیا ملک ہے۔۔۔ لڑکی سسرال میں ریہرسل کے لیے جا رہی ہے۔ خوش ہو کر اس نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالا تو کاغذ ایک کا ٹکڑا بھی ساتھ نکل آیا۔ یہ ایک مظلوم کشمیری لڑکی کی تصویر تھی۔ جو فوجیوں کی گینگ ریپ کا شکار ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اسی لمحے دکھوں کے سائے منڈلانے لگے۔ وہ اداس سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر تنّی کو دیکھا اور پھر تصویر پر نظر ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

کنّی! آئی ایم سوری۔ آئی ایم ہری ٹو ڈے۔۔۔ بائے۔

یہ بات سُن کر وہ غصے سے تن گئی۔

واٹ؟ وہ زور سے چیخی اور پھر زمین پر پاؤں پٹختے ہوئے بولی۔

او۔۔ یو۔۔ باسٹرڈ پاکی۔

☆☆☆☆

ارشد چہال

پوٹھوہاری سے ترجمہ: اختر رضا سلیمی

یادوں کا دریچہ

اس دن امجد جب بورڈنگ کارڈ لے کر اسلام آباد ائر پورٹ کے انٹرنیشنل لاؤنج میں داخل ہوا تو اس کا دل بہت اداس تھا۔ وہ جب بھی پاکستان آتا، اس کے ذہن میں پرانی یادوں کا ایک دریچہ سا کھل جاتا اور اُس کے لیے واپس برطانیہ پلٹنا دوبھر ہو جاتا۔ مگر وہ جو کہتے ہیں ناں کہ جہاں آدمی کا دانہ پانی لکھا ہوا ہو، اسے بہرصورت وہاں جانا ہی پڑتا ہے۔۔۔۔ امجد کو برطانیہ میں رہائش پذیر ہوئے پندرہ سال گزر چکے تھے لیکن وہ جب بھی اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملنے پاکستان آتا، اس کے گلشنِ ذہن میں پرانی یادیں، تازہ پھولوں کی طرح کھل اٹھتیں اور اسے یوں لگتا جیسے یہ سب ابھی کل کی بات ہو۔۔۔۔

کچھ عرصہ قبل جب وہ پاکستان آیا تھا تو اس نے یہاں سے واپسی پر تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی پاکستان نہیں پلٹے گا اور اگر پلٹ ہی آیا تو واپس برطانیہ نہیں جائے گا؛ لیکن حالات انسان کی مرضی سے تو نہیں بدلتے ناں۔۔۔ اسے برطانیہ پہنچے ابھی سال بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی ماں بستر سے جا لگی۔ چھوٹے بھائی نے اسے فون پر بتایا کہ اماں سخت بیمار ہیں اور تقاضا کر رہی ہیں کہ امجد سے کہو ایک بار مجھے جیتے جی دیکھ لے۔۔۔ پردیس میں انسان کو چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی پہاڑ سا دکھتا ہے۔ ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے امجد کو لگا جیسے اس کے پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی ماں گزر جائے گی۔۔۔ لیکن جب کئی دنوں کے بعد وہ پاکستان پہنچا تو اماں نہ صرف زندہ تھی بل کہ چل پھر بھی رہی تھی۔ ماں کو ٹھنڈ سے بخار کیا ہو گیا تھا اس نے اپنے طور پر طے کر لیا تھا میرا جانا ٹھہر چکا ہے۔۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ امجد کی جدائی زیادہ دن برداشت نہیں کر پا رہی تھیں۔

کہنے کو تو وہ پورے دو ہفتوں کی چھٹی لے کر آیا تھا لیکن یہاں پہنچتے ہی وقت کو جیسے پر سے لگ گئے تھے، مصروفیت کی وجہ سے اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ گزشتہ سال اس کے کئی عزیز فوت ہوئے تھے اسے ہر ایک کے گھر تعزیت کے لیے جانا تھا۔ ادھر چھوٹی بہن کے سسرال میں کسی جھگڑے نے سر اٹھا رکھا تھا، اسے مٹانا بھی ضروری تھا۔۔۔ اور بھی کئی ضروری کام نمٹانے تھے اور پیروں کا سالانہ میلہ بھی سر پر تھا لیکن اس کی چھٹی بہت تھوڑی تھی وہ بے چارہ کرتا بھی تو کیا کرتا۔ انھی مصروفیات کی وجہ سے اس نے اپنے کئی عزیزوں کی دعوتیں بھی رد کر دی تھیں، جن میں ماموں راسب کی طرف سے دی گئی دعوت بھی شامل تھی، جس پر وہ ناراض ہو گئے تھے۔ ایک جان ہزار عذاب والا معاملہ تھا۔۔۔۔۔

وہ جب بھی پاکستان آتا اس کی شدید خواہش ہوتی کہ کبھی جہلم شہر کا ایک آدھ چکر لگا آئے، جو پنڈی سے کچھ زیادہ فاصلے پر بھی نہیں تھا لیکن اسے اس کی بھی فرصت نہیں ملی۔ کئی بار تیار بھی ہوا لیکن اسے ایک خدشہ سا لاحق ہو گیا کہ معلوم نہیں وہ وہاں ہو گی بھی یا نہیں۔ آخر پندرہ سولہ سال کا عرصہ کچھ تھوڑا بھی تو نہیں ہوتا۔

پندرہ سال۔۔۔۔ پندرہ سال پہلے۔۔۔ جب وہ قائداعظم یونیورسٹی میں بی اے کا طالب علم تھا۔ کتنا بےفکری کا زمانہ تھا۔ اب تو اس کی بڑی بیٹی ایشا بھی بارہ چودہ سال کی ہو چکی تھی۔ ان پندرہ برسوں میں دنیا کیا سے کیا ہو چکی ہے۔۔۔

امجد نے پرانی یادیں ذہن سے جھٹک کر کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا۔ ابھی فلائٹ کی روانگی میں سوا گھنٹا باقی تھا۔ جب سے پاکستان میں سیکورٹی کے مسائل نے سر اٹھایا تھا، برطانیہ جانے والے مسافروں کو فلائٹ کی روانگی سے اڑھائی تین گھنٹے پہلے ہی چیک ان ہونے کی ہدایات دی جانے لگیں تھیں۔ بورڈنگ لاؤنج کے تمام صوفے مسافروں سے پر تھے۔ وہ مسافر جنھیں بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی تھی اپنے موبائل کانوں سے لگائے ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے اور ان کی آوازیں فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

''سوا گھنٹا۔۔۔۔ میں اتنا وقت صوفے پر بیٹھے کیسے گزاروں گا۔ میرا خیال ہے کہ کافی کا ایک کپ لے آؤں اور دوبارہ یہیں بیٹھ کر یادوں کا دریچہ کھول لوں تاکہ پرانی یادوں کی تازہ ہوا میں سانس لے سکوں۔'' یہ سوچتے ہوئے وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

چائے خانے پر خاصا رش تھا۔ کوئی کافی کا طلب گار تھا تو کوئی چائے کا۔ بچے چاکلیٹوں اور چپس کا تقاضا کر رہے تھے۔ امجد ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں ایک عورت کافی کا کپ تھامے اس کے سامنے سے گزری۔ جوں ہی اس کی نظر اس کے چہرے پر پڑی اسے لگا جیسے بجلی کا کوئی کوندا اس کی طرف لپکا ہے۔ وہ یاسمین تھی، جو کافی کا کپ ہونٹوں کی طرف لے جاتے ہوئے یوں مسکرائی تھی، جیسے سترہ سال پہلے قائداعظم یونیورسٹی میں امجد سے داخلہ فارم وصول کرتے ہوئے مسکرائی تھی۔ امجد کو لگا کہ سترہ سال بعد بھی اس کی مسکراہٹ میں وہی تازگی ہے جو گلاب کی کلی میں کھلتے سمے ہوتی ہے۔ وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ اسے کچھ سوجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ اچانک ٹی سٹال والے نے اسے آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ کافی لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اس کی نظریں اب بھی ادھر ہی لگی ہوئی تھیں جدھر یاسمین گئی تھی۔ اس کا ذہن اس کھوج میں تھا کہ آیا وہ اکیلی ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ اس نے دیکھا کہ یاسمین لاؤنج کے دوسرے کونے میں لمحہ بھر کے لیے کھڑی رہی، اپنے بائیں ہاتھ سے گالوں کو چھوتی بالوں کی لٹ کو پیچھے کیا اور ایک صوفے پر بیٹھ کر کافی پینے میں مشغول ہو گئی۔ امجد بے دھیانی میں چلتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ یاسمین اپنے آپ سے بھی بے خبر کافی کی چسکیاں لے رہی تھی لیکن جب عورت کسی مرد کی نظروں کا نشانہ

ہوتو بے خبری زیادہ دیر ساتھ نہیں دیتی، اس نے کافی کی ایک چسکی لے کر جوں ہی نظریں اٹھائیں، اسے لگا جیسے وہ کسی آئینہ خانے میں داخل ہوگئی ہے۔ اس نے بے یقینی کے سے انداز میں پلکیں جھپکیں اور دوبارہ امجد کی طرف یوں دیکھا جیسے کسی دھندلے آئینے میں جھانک کر اپنا عکس تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”آپ امجد ہیں۔“ یاسمین کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

”جی میں امجد ہوں۔ لیکن میں آپ سے یہ ہرگز نہیں پوچھوں گا کہ آپ یاسمین ہیں۔۔۔“ یہ سنتے ہی یاسمین کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ پھیل گئی جو پچھلے سترہ سال سے امجد کی یادداشت میں محفوظ تھی۔

”آپ برطانیہ جا رہے ہیں؟“

”ہاں۔ میں تو برطانیہ ہی جا رہا ہوں۔ لیکن آپ۔۔۔؟“ امجد کو معلوم بھی تھا کہ لاؤنج میں بیٹھے تقریباً سبھی لوگ برطانیہ ہی جا رہے ہیں۔ لیکن وہ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

”میں بھی وہیں جا رہی ہوں۔“ یاسمین کے لبوں پر وہی مسکراہٹ تھی، جو ہمیشہ اس کے چہرے کا خاصہ رہی تھی۔ ”میں اس بار اکیلی تھی۔ سوچ رہی تھی سفر کیسے گزرے گا۔ اچھا ہوا آپ مل گئے۔ خوب گزرے گی۔۔۔ آپ کے ساتھ کون ہے؟“ یاسمین نے یوں پوچھا جیسے وہ ابھی کل ہی بچھڑے ہوں۔ جیسے سترہ سال، سترہ منٹ ہوں۔۔“

”کوئی نہیں ہے۔ اکیلا ہی ہوں۔“ امجد نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ پھر گفتگو کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ باتیں تھیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ یہاں تک کہ وہاں لگے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے مسافروں کو جہاز میں بیٹھنے کی ہدایات دی جانے لگیں۔ دونوں نے اپنے اپنے بیگ اٹھائے اور جہاز کی طرف چل پڑے۔ جہاز میں پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ دونوں کی سیٹیں ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر ہیں۔ انھوں نے جہاز کے عملے سے درخواست کر کے سیٹوں کا تبادلہ کرا لیا اور دونوں برابر کی سیٹوں پر براجمان ہو گئے؛ بالکل یوں جیسے سترہ سال پہلے وہ کلاس روم میں بیٹھا کرتے تھے۔

امجد یوں سوچوں میں گم تھا جیسے اسے یقین ہی نہ ہو کہ یاسمین اس کے ساتھ ہے۔ یاسمین نے اسے گم صم دیکھ کر یوں آنکھ ماری جیسے یونیورسٹی کے دنوں میں وہ اسے چھیڑنے کے لیے مارا کرتی تھی۔

”آپ تو چپ کی بکل مار کے بیٹھ گئے ابھی تو سات گھنٹوں کا سفر ہے۔ میں تو آپ کے کان کھا جاؤں گی۔“ یاسمین نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے یوں دیکھا جیسے اسے یقین ہو چلا ہو کہ اس چپ کا کوئی نہ کوئی تعلق اس اچانک ملاقات سے بھی بنتا ہے۔

جوں ہی جہاز کے انجن جاگے امجد کو لگا جیسے اس کے دل کے نہاں خانوں میں سویا ہوا محبت بھرا جذبہ بھی جاگ اٹھا ہے۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ یاسمین؛ جسے سوچتے ہوئے اس کی عمر گزری ہے، زندگی کے کسی موڑ پر، اسے یوں اچانک مل جائے گی۔ یاسمین اس کے خوابوں کی دیوی۔۔ وہی جس نے اس

کے دل میں محبت کے اتنے پھول کھلائے تھے، جنھیں شمار کرنا ممکن نہیں تھا۔ دونوں نے مل کر کیا کیا خواب بنے تھے۔ لیکن جوں ہی وہ تعلیم سے فارغ ہوا، اس کا ماموں یوسف اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آدھمکا اور اسے اپنی بیٹی فرزانہ کے ساتھ بیاہ کر برطانیہ لے گیا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا جیسے پتنگ اڑاتے ہوئے ڈور تو اس کے ہاتھ سے لپٹی رہ گئی ہو لیکن پتنگ کسی دور دراز کے درخت پر جا اٹکی ہو۔ مگر وہ کٹی پتنگ، اب سترہ سال بعد، جب وہ تین بچوں کا باپ بن چکا تھا، دوبارہ اس کے ہاتھ سے لپٹی ڈور کے ساتھ آبندھی تھی۔

جوں ہی جہاز فضا میں بلند ہوا، یاسمین نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور پھر آنکھ مار کر پوچھا: ”کیا بات ہے امجد۔ آپ نے چپ کی بکل کیوں مار رکھی۔“

”سچی بات ہے مجھے تو اب بھی یقین نہیں آرہا کہ تم میرے ساتھ ہو۔ میں جب بھی پاکستان آتا، سوچتا کہ تمھارا اتا پتا کرنے جہلم جاؤں۔ لیکن جوں ہی تیار ہوتا۔ تمھارا سامنا کرنے سے جی گھبرانے لگتا۔۔۔“ اس نے پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”آپ کی اسی کم ہمتی نے ہمارے درمیان وچھوڑے کے بیج بوئے۔ اگر آپ اس وقت ہمت سے کام لیتے تو یہ سترہ سال ہم نے ایک ساتھ گزارے ہوتے۔“ یاسمین نے بائیں ہاتھ سے اپنے بالوں کی لٹ کو پیچھے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

”بس یار قسمت میں یہی لکھا ہوا تھا۔ میری شادی کہیں اور ہونا تھی اور تمھاری کہیں اور۔۔ اگر قسمت میں ساتھ لکھا ہوتا تو کوئی نہ کوئی سبب بھی بن ہی جاتا۔۔ لیکن سچی بات ہے میں ان سترہ سالوں میں تمھیں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھلا سکا۔“

”بھلا تو میں بھی نہیں سکی۔۔“ یاسمین کے چہرے پر دکھوں کا ایک سایہ سا لہرایا۔ یوں جیسے چاند اچانک بدلی کی اوٹ میں آجائے۔

”یاسمین تمھاری مسکراہٹ آج بھی ویسی ہی ہے۔ سترہ برس پہلے والی۔ وقت نے اس پر کوئی اثر نہیں چھوڑا۔ میں نے اسی کے ذریعے تجھے پہچانا۔۔ مگر تمھارے بال۔۔۔۔“ امجد نے اس کے بالوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو باب کٹ سٹائل میں لہرا رہے تھے۔

”سچ پوچھو تو میں نے اتنے خوبصورت بال، جیسے تمھارے کبھی ہوا کرتے تھے، پھر کبھی زندگی میں نہیں دیکھے۔“ امجد نے کہا اور پھر شرمسار سا ہو گیا، جیسے اس نے کوئی غلط بات کہہ دی ہو۔

”پر لطیف تو کہا کرتا تھا کہ ان بالوں میں تم پینڈو لگتی ہو۔۔ رشتہ بھیجنے کے بعد اس نے سب سے پہلا تقاضا یہی کیا تھا کہ بال ترشوا لوں؛ اور میں نے اس کی بات مان لی۔ آج حیران ہوتی ہوں کہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود میں اتنی جلدی کیسے راضی ہو گئی تھی۔۔۔۔ لیکن افسوس۔۔ میں اس کی ہر بات مان کر بھی اپنا

گھر نہ بچا سکی۔ اس کا خیال تھا پڑھی لکھی لڑکیاں بہت خطرناک ہوتی ہیں۔ انھیں اپنے شوہر کو بے وقوف بنانے کا ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دس سال اکٹھے رہنے کے باوجود میں اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ میں نے اس کی ہر بات مانی۔۔ لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔۔ پھر میں نے جاب کر لی۔“ یاسمین بات کرتے کرتے اچانک رک گئی۔ ائر ہوسٹس سر پر آن کھڑی تھی۔ دونوں نے کولڈ ڈرنک لی۔

”وہیں۔۔ اس کے گھر میں رہ رہی ہو یا کہیں اور۔۔“ امجد نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے یاسمین کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”اب تو ہمیں علاحدہ ہوئے پانچ سال گزر چکے ہیں۔ میرے دونوں بیٹے بھی اسی نے لے لیے اور دوسری شادی بھی کر لی۔ خیر میری چھوڑیں۔۔ آپ اپنی سنائیں۔“ یاسمین نے اپنے چہرے پر وہی مسکراہٹ ابھارنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

”ہم نے اگرچہ علاحدگی اختیار نہیں کی لیکن سلوک اس کا میرے ساتھ بھی وہی ہے جو لطیف کا تمھارے ساتھ رہا ہے۔ لیکن میں زبان دانتوں تلے دبا کر وقت گزار رہا ہوں۔۔ یاسمین اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم برطانیہ میں ہو تو میں کب کا تجھے تلاش کر چکا ہوتا۔“

”۔۔۔ مگر میں آپ کو کیسے ملتی۔ یہاں آ کر تو میں خود کہیں کھو کر رہ گئی ہوں اور آج بھی اس یاسمین کو تلاشنے کی کوشش کر رہی ہوں جو یونیورسٹی میں آپ کے ساتھ پڑھتی تھی۔۔“

”انسان جب اپنے ہاتھوں سے پھسل جاتا ہے تو پھر وہ کبھی خود کو تلاش نہیں کر پاتا، کوئی دوسرا ہی اسے پا سکتا ہے۔ آج میں نے تجھے پا لیا ہے۔۔۔ اب میں تجھے۔۔۔“ امجد اس کی آنکھوں میں ڈوب کر رہ گیا۔

”نہیں امجد۔ میں اپنا گھر تو خراب کر چکی۔ اب کسی اور کا گھر برباد نہیں کرنا چاہتی۔ اسی لیے تو میں پچھلے پانچ سال سے ریڈنگ میں اکیلی رہ رہی ہوں۔“

”یاسمین گھر تو اس کا خراب ہوتا ہے جس کا موجود ہو۔ آج کتنے سال گزر گئے اسے میری پروا ہی نہیں ہے۔ اگر برادری کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ مجھے کب کا چھوڑ کے جا چکی ہوتی۔۔ بس میں تجھے کیا بتاؤں کہ میں نے یہ سترہ سال تیرے بغیر کس عذاب میں گزارے ہیں۔ اب اگر تم مل ہی گئی ہو تو میں تجھے خود سے جدا نہیں ہونے دوں گا۔“ امجد نے یاسمین کے طرف دیکھتے ہوئے کہا، جو کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

”امجد۔“ وہ یک دم گویا ہوئی۔ ”میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو گی۔ مگر میں سوچتی ہوں۔۔“

”تجھے اب کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔“ امجد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ اب تجھے میرا ساتھ دینا ہی ہو گا۔۔ خود ہی سوچو، زندگی کتنی مختصر ہے۔ خدا خدا کر کے سترہ سال بعد تو ملے

ہیں ۔ اب اگر بچھڑے تو معلوم نہیں کتنے جنموں بعد ملیں گے ۔۔۔ ملیں گے بھی یا نہیں؟ میں باقی ماندہ زندگی تمھارے ساتھ بتانا چاہتا ہوں ۔ اور تجھے اس سلسلے میں میرا ساتھ دینا ہی ہوگا ۔ میں اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تمھارے پاس آنے کو تیار ہوں ۔"

یاسمین خاموش رہی ۔ اس کی خاموشی امجد کے دل میں طوفان برپا کر رہی تھی ۔ وہ ہر حال میں اس سے ہاں کا طلب گار تھا ۔ برسوں بعد یاسمین سے مل کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو ۔ وہ اسے کسی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا ۔ اس کے لیے وہ ساری دنیا؛ گھر بار، بیوی بچے سب کچھ تج دیتے لیے تیار ہوگیا تھا ۔ یاسمین اس کا پہلا خواب ۔۔ پہلا پیار ۔۔

"یاسمین ۔۔۔ مجھے یقین ہے ہم دونوں ایک ساتھ بہت خوش رہیں گے ۔" امجد نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا ۔ یاسمین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے چہرے پر مسکراہٹ ابھاری، جو کچھ لمحے پہلے کہیں کھو گئی تھی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دے کر حامی بھر لی ۔

ابھی وہ مستقبل کے منصوبے بنا ہی رہے تھے کہ جہاز لندن کی فضاؤں میں جھولنے لگا اور اگلے کچھ ہی منٹوں میں ہیتھرو ائر پورٹ پر اتر گیا ۔ انھیں سات گھنٹوں کا یہ طویل سفر سات لمحوں سے بھی کم لگا ۔

ائر پورٹ سے باہر نکلتے ہوئے امجد نے یاسمین سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ہفتہ وار تعطیلات سے پہلے پہلے تمام معاملات نمٹا کر اس کے پاس چلا آئے گا ۔ اپنے اپنے گھروں کی طرف روانگی سے پہلے امجد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں انتظار کی گھڑیاں ابھی سے شروع ہو چکی تھیں ۔

فرزانہ، امجد کو لینے اپنی بیٹی اور دونوں بیٹوں کے ساتھ ائر پورٹ کے باہر موجود تھی ۔ اسے دیکھتے ہی اس کے دونوں بیٹے اس کے ساتھ یوں چمٹ گئے جیسے صدیوں بعد ملے ہوں ۔ اس نے بیٹی کے سر پر دلاسا دیا، جو کچھ فاصلے پر سمٹی کھڑی تھی ۔ پھر فرزانہ سے حال احوال پوچھا ۔ دونوں بیٹوں نے باپ سے ملتے ہی وہیں ائر پورٹ پر کہنا شروع کر دیا کہ اس ویک اینڈ پر میرا آنٹی سے ملنے گلاسکو جائیں گے ۔ امجد خاموش رہا ۔ بچے مچلتے ہی رہے ۔ ان بے چاروں کو کیا پتا تھا کہ ان کا باپ آنے والا ویک اینڈ کہاں گزارنے کا پروگرام ترتیب دے چکا ہے ۔

گھر پہنچے ہی وہی بکھیڑے شروع ہو گئے تھے؛ مارٹ گیج، قسطیں، بچوں کو سکول چھوڑنا اور لانا ۔ وقت پر دفتر پہنچنا وغیرہ وغیرہ ۔

لیکن امجد نے ان تمام مصروفیات کے باوجود ویک اینڈ پر یاسمین کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا ۔ بچے بضد تھے کہ گلاسکو چلا جائے ۔ امجد نے ایک رات بہانہ گھڑا کہ اسے اس ویک اینڈ پر اپنے ایک دوست کے پاس فرانس جانا ہے ۔ فرزانہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابھی تو پاکستان سے ہو کے آیا ہے اور اب فرانس جانے کا فیصلہ کیسے کر لیا ہے ۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ اس کی تمام تیاریاں مکمل کر چکا ہے تو یہ سوچ کر

خاموش ہو رہی کہ ضرور کوئی اہم کام ہوگا ورنہ وہ عموماً ایسا نہیں کرتا۔

چھٹی والے دن امجد صبح سویرے اٹھا؛ بیوی بچوں کے ساتھ ناشتہ کیا اور اپنا سامان اٹھایا اور ہمیشہ کے لیے انھیں چھوڑ کر زندگی کی نئی راہ پر روانہ ہو گیا؛ جہاں یاسمین اس کے انتظار میں تھی۔

گھر تو جیسا بھی ہو؛ گھر ہی ہوتا ہے اور اسے چھوڑتے ہوئے انسان کا دل ایک بار پسیجتا ضرور ہے، مگر وہ کہتے ہیں ناں؛ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ امجد کے سر پر عشق کا ایسا بھوت سوار تھا کہ وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ایم۔ٹونٹی فائیو پر چڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے ایک ہی روشنی تھی اور وہ تھی یاسمین کی دل آویز مسکراہٹ کی روشنی۔ جس کی چکاچوند میں اسے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

جوں ہی وہ ریڈنگ کے قریب پہنچا گاڑی کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی رفتار بھی مزید تیز ہو گئی۔ وہ یاسمین جس کے انتظار میں اس نے سترہ سال گزار دیے تھے آج وہ اس کے پاس جا رہا تھا۔ گھر پر تو اس نے بیوی بچوں سے جان چھڑانے کے لیے فرانس جانے کا بہانہ بنایا تھا لیکن اب اس کے ذہن میں یاسمین کے ساتھ فرانس یا کسی دوسرے ملک جانے کا سچ مچ میں منصوبے بن رہا تھا۔ جہاں پہنچ کر وہ ساری دنیا سے کٹ جائے اور صرف اپنی محبت کی چھاؤں میں زندگی گزار سکے۔

ریڈنگ، لندن سے کچھ زیادہ فاصلے پر واقع نہیں تھا لیکن وہ آج زندگی میں پہلی بار یہاں آیا تھا۔ اس نے یاسمین کے گھر کے سامنے گاڑی پارک کر کے، اس کے گھر کی بیل بجائی اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں ایک خاتون نے دروازہ کھولا۔

”جی میرا نام امجد ہے اور میں یاسمین سے ملنے آیا ہوں۔“ اس نے خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یاسمین۔۔۔ وہ تو کل ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔“ خاتون نے جواب دیا۔

”گھر چھوڑ کر چلی گئی؟ مگر کیوں؟“ امجد یوں اچھلا جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

”وجہ تو نہیں معلوم۔۔۔ وہ میری روم میٹ تھی۔ پچھلے دو سالوں سے ہم دونوں ایک ساتھ رہ رہے تھے۔۔۔ مجھے یوں اس کے اچانک چلے جانے پر خود بھی حیرت ہے۔“ عورت نے کہا۔ امجد اسے یوں دیکھنے لگا جیسے اسے یقین ہی نہ آ رہا ہو۔

”اس کا سیل نمبر مل سکتا ہے۔ میں خود اسے تلاش کر لوں گا۔“

”اب آپ اسے نہیں ڈھونڈ سکتے۔ وہ اپنے موبائل کی سم بھی نکال کر یہیں پھینک گئی ہے۔ ہاں آپ کے لیے ایک چھٹی ضرور چھوڑ گئی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ جلدی جلدی اندر گئی۔ کچھ دیر بعد خط لا کر اس کے ہاتھ پر رکھا اور اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔

امجد خط لے کر گاڑی میں آ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ”پتا نہیں اس نے خط میں کیا لکھا

ہوگا۔' اس نے سوچا اور اسے طرح طرح کے وسوسوں نے آن گھیرا۔ پھر یہ سوچ کر کہ ممکن ہے اس نے گھر تبدیل کرلیا ہو اور خط میں وہاں کا پتا درج ہو اس نے جلدی جلدی خط کھولا اور اسے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

ڈیر امجد!

اتنے برسوں بعد آپ سے مل کر جی بہت خوش ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے بہت زور دیا کہ ہم ایک ساتھ زندگی گزاریں گے تو میں نے بھی آپ کی ہاں میں ہاں ملا دی تھی۔ لیکن جب ائرپورٹ کے باہر میں نے آپ کو اپنے بیوی بچوں سے ملتے ہوئے دیکھا تو مجھے لگا کہ آپ مجھے حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بول رہے تھے۔ مگر میں آپ کو اس کا دوش بھی نہیں دیتی کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ آپ نے یہ سب کچھ اپنے دل سے مجبور ہو کر کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اپنے وعدے کے مطابق گھر بار چھوڑ کر آ جائیں گے۔ مگر میں اب ایسا نہیں چاہتی۔ میرا گھر تو برباد ہو چکا۔ میں آپ کا گھر برباد نہیں کرنا چاہتی۔ آج کے بعد مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔ اب میں تجھے نہیں ملنے والی۔۔۔۔ تمھاری یاسمین۔"

امجد کی آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔ وہ کافی دیر اسٹیرنگ پر سر رکھ کر ہچکیاں لیتا رہا۔ اسے یاسمین کے بچھڑ جانے کا دکھ تھا یا اپنا گھر چھوڑنے کا؛ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور اس کا رخ دوبارہ مشرقی لندن کی طرف موڑ دیا۔ جوں ہی گاڑی لندن کی طرف جانے والی مرکزی شاہرہ پر گامزن ہوئی، اس نے اپنے موبائل سے فرزانہ کا نمبر ملایا۔ جوں ہی فرزانہ نے کال رسیو کی، اس نے کہا۔

"فرانس جانے والی فلائٹ کینسل ہو گئی ہے اور میں واپس آ رہا ہوں۔ بچوں کو تیار کر لو ہم آج ہی گلاسکو روانہ ہو رہے ہیں۔" یہ سنتے ہی فرزانہ چہک اٹھی۔

فون بند کرتے ہی اسے لگا جیسے یاسمین اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہے اور دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ آنکھ مار کر اُس سے پوچھ رہی ہے:

"کیوں امجد۔ میں نے ٹھیک کیا ناں؟"

☆☆☆☆

پوٹھوہاری تخلیق وترجمہ: قمر عبداللہ

نمرود کی آنکھ

چینل بدلتے بدلتے یک دم ایک چینل پر اس کی انگلیاں تھم گئیں اور وہ دیر تک مظاہرین کے نعروں، تقریروں اور سینہ کوبی سے محظوظ ہوتا رہا۔ اتنا بڑا مجمع دیکھ کر سیکرٹری (اے) اس کے قریب آ کر بولا۔

”سر! اس دفعہ بجٹ میں چوتھائی بھر ٹیکس عائد ہوئے ہیں۔ جنہوں نے عوام کی کمر توڑ دی ہے۔ وہ ----دیکھیے۔“ سیکرٹری کی بات کاٹتے ہوئے وہ بولا۔

”کمر توڑ دی ہے؟ پتہ نہیں تمہیں ان کیڑوں مکوڑوں پر کیوں رحم آتا ہے۔ ان کم بختوں کی کمر میں ذرا بھی خم نظر نہیں آتا۔ دیکھو کیسے سینہ تان کر نعرہ بازی کر رہے ہیں۔ ہاں وہ دیکھو، اِس منظر میں دھواں کہاں سے اُٹھ رہا ہے؟“

”سر! مظاہرین نے کسی سرکاری عمارت کو نذرِ آتش کر دیا ہے۔“ سیکرٹری نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے جلانے دو۔ ڈٹ کر جلائیں۔ عمارتیں کون سی ہماری ہیں۔ ہم نے اپنے محلات اسی لیے سات سمندر پار بنا رکھے ہیں۔ ان کیڑوں مکوڑوں کی اپروچ سے باہر۔“ اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور دھواں اگلتے ہوئے ریموٹ پر انگلی دباتے ہوئے چینل تبدیل کر دیا۔ دوسرے چینل پر بھی ملک کا ایک معروف صحافی حکومت کے خلاف شعلہ بیانی میں مصروف تھا۔ سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے اس نے سیکرٹری (ب) کو بلایا اور صحافی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”تم اسے قابو نہ کر سکے۔“ سیکرٹری نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ اور بولا۔

”سر واقعی یہ بہت ظالم ہے۔ ہمارے اندر کی باتیں بھی باہر لے آتا ہے۔ بڑی کوشش کی اسے فالو کرنے کی ----- چلو آج خفیہ والوں سے بات کرتا ہوں۔“

”نہیں نہیں -- خفیہ والوں سے نہیں۔ یہ جمہوری دور ہے۔ اسے ہڈی پھینکو -- ہڈی۔ اُسے نہیں اس کے ظالم ضمیر کو مارو۔“ وہ سیکرٹری کی بات کاٹتے ہوئے گرجا۔

”سر بات کی تھی -- دس پر نہیں مانتا -- بیس پر اڑ گیا ہے۔“ سیکرٹری نے شرمندگی سے جواب دیا۔

”بیس مانگتا ہے پچیس دے دو -- پیسے کون سے ہمارے باپ کے ہیں؟ جو مانگتا ہے دے دو لیکن اس کا منہ ضرور بند ہونا چاہیے۔ اس نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور انگلی سے ریموٹ کو دبانے لگا۔ سکرین پر ایک نوجوان آگ کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا اور اس کے جسم سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ارد گرد لوگوں کا جمِ غفیر

تھا۔ اس نے دانشور کو پاس بلا لیا اور پوچھا۔

"یہ مداری کیا تماشا کر رہا ہے؟"

"سر کسی بے روزگار نے خودسوزی کر لی ہے۔"

اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں رکھا اور تالیاں بجانے لگا۔

"بہت خوب ---- بہت خوب۔ بھئی بہت خوب ---- زندہ باد ---- یہ ہوئی نا بات کرنے والی۔ ہمیں ایسے جری جوانوں کی ضرورت ہے۔ جو ایسے دلیرانہ اقدامات کر سکیں۔ جب بجلی نہیں پانی نہیں۔ آٹا چینی اور گھی ہی نہیں تو پھر جی کر کیا کرنا؟ --- ویل ڈن --- جوان ویل ڈن۔"

اپنے بیڈ نما دفتر میں بڑی ٹی۔ وی سکرین کے سامنے بیٹھ کر وقت گزارنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنے نیچے گھومنے والی شاہی کرسی کی طرح ریموٹ پر اس کی انگلیاں بھی گھومتی رہتیں۔ فائلز کو نمٹانے کے لیے دو سیکرٹری ہمہ وقت اس کے دفتر میں موجود رہتے۔ سیکرٹری ارشد اور سیکرٹری بشیر وہ انھیں ہمیشہ (اے) اور (بی) کے ناموں یاد کرتا۔ سپیچ رائٹر مسٹر کامران بھی کاتبین کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتا۔ اسے اس نے (دانش ور) کا نام دے رکھا تھا۔

"سر! یہ سائن کر دیں۔" سیکرٹری بی نے اچانک فائل آگے بڑھاتے ہوئے عرض کیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"سر! یہ ملک کے جنوبی علاقے میں ایک یونیورسٹی کے قیام کی منظوری کا مسودہ ہے۔" سیکرٹری نے کہا۔

"نہیں نہیں --- رہنے دو۔ ابھی اس یونیورسٹی کی منظوری موخر رکھو۔ دیکھ نہیں رہے ہو؟ پہلے ہی تعلیم یافتہ نوجوان خودسوزی کر رہے ہیں۔ ان حالات میں یونیورسٹیوں کا قیام چہ معنی دارد؟ ویسے یار دانش ور یہ جو فلموں، ڈراموں کے لیے میک اپ کر کے حلیہ چینج کرتے ہیں، ان میں سے کسی کو بلاؤ۔ ذرا میرا بھی حلیہ چینج کرے۔ میں اس چھوٹی مخلوق کو ذرا قریب سے چیختے چلاتے، روتے پیٹتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ قسم ہے بڑا مزہ آئے گا ان کو قریب سے دیکھ کر -- کوئی ان کم بختوں سے یہ پوچھے -- بتاؤ بھئی! تم پیدا ہی رونے دھونے کے لیے ہوئے ہو اور ہم صرف حکمرانی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ صبر کرو برداشت کرو۔ بھلا یوں ہائے ہائے کرنے سے کیا حاصل؟"

"ویسے سر جی! میں مشورہ دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ حالات گذشتہ کئی ادوار سے ابتر ہیں۔ میرا مطلب ہے، ذرا آٹے میں نمک کے برابر -----" دانشور اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔

"دانشور تم بھی اس چھوٹی مخلوق کی باتوں میں آ گئے ہو۔ ہمیں اپنا کام کرنا ہے۔ اُنھیں اپنا کام۔ اور تم ہمارا کام ہی کرو گے اور اس کے تم پیسے لیتے ہو۔ ذرا یہ بتاؤ ہمارے فارم ہاؤس پر سوئمنگ پول کی رپیئرنگ کا کیا بنا؟ کام مکمل ہوا یا نہیں۔"

”جی سر مکمل ہو گیا ہے۔ کل آپ کو بتایا تھا۔“ سپیچ رائٹر نے جواب دیا۔

”تو پھر مسٹر قریشی سے کہو، کہ اس ویک اینڈ پر پارٹی کا انتظام کرے۔ بیگم صاحبہ اگلے ہفتے اپنی بہن سے ملنے بیرونِ ملک جا رہی ہیں۔ اُن کی غیر موجودگی کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کچھ خصوصی مہمان بھی آ رہے ہیں۔ مسٹر قریشی سے کہو، صاف ستھرے اور تازہ انتظامات ہونے چاہییں۔ رنگین اور موسمِ گل کی طرح تروتازہ اور رنگین۔ ہم اگلا ہفتہ فارم ہاؤس پر ہی گزاریں گے۔“

سپیچ رائٹر نے جان کی امان پاتے ہوئے عرض کی۔

”سر اگلے ہفتے آپ کا آفس میں رہنا بہت ضروری ہے۔ اپوزیشن جماعتوں نے ملک گیر احتجاجی مظاہروں کا اعلان کر رکھا ہے۔ زلزلے کی وجہ سے بھی کچھ مسائل سر اٹھا رہے ہیں۔ سرحدوں کے حالات بھی ٹھیک نہیں۔“

”اوہو! دانش ور تم تو ہمیشہ رنگ میں بھنگ ڈالتے ہو۔ اپوزیشن کو دل کھول کر احتجاج کرنے دو۔ سب طے ہے۔ ہم نے اپنی باری پوری کرنی ہے۔ پھر زلزلہ۔۔۔ زلزلہ تو ہمارے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔ اس سے مسائل نہیں وسائل پیدا ہوئے ہیں۔ وفاقی وزیرِ تجارت کی کارکردگی میں کمیٹی کام کر رہی ہے۔ بھرپور بیرونی امداد آ رہی ہے۔ اب ہم جا کر اپنے ہاتھوں سے لوگوں کو مکان تو نہیں بنا کر دے سکتے؟ رہی بات سرحدوں کی تو فوج کس مرض کی دوا ہے؟ ملک کا دفاع اس کی ذمہ داری ہے۔ ہم تو جا کر توپ نہیں چلا سکتے۔ خود سیکرٹریز کو ساتھ رکھ کر معاملات ہینڈل کرنے کی کوشش کرو۔ اگلے ہفتے ہمیں انجوائے کرنے دو۔ بات چل رہی تھی کہ سیکرٹری بی ایک اور فائل سائن کروانے کے لیے لے آیا۔

”یہ کیا ہے؟“

”سر یہ ڈینگی بخار کی ویکسین بیرونِ ملک سے منگوانے کے لیے بل کی منظوری ہے۔“

”سیکرٹری! میں نے کچھ عرصہ پہلے اربوں روپے کی ویکسین کے بل پر دستخط نہیں کیے تھے۔“ اس نے حیرانی سے سیکرٹری کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”سر! وہ تو گذشتہ برس ویکسین منگوائی تھی۔ محکمہ صحت نے دوبارہ ویکسین طلب کی ہے۔ کیوں کہ موسمِ بہار کی آمد آمد ہے۔ اس بار ڈینگی بخار کا پھر شدید خطرہ ہے، ایک تو پتہ نہیں ہماری قوم پنگے کیوں لیتی ہے؟ قدرت ہماری مدد کرنا چاہتی ہے۔ زلزلوں سے، سیلاب سے، ڈینگی بخار سے، مدد کرنا چاہتی ہے۔ قدرت کو ہماری بہتری مقصود ہے، اور وہ ہے آبادی کنٹرول۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور فائل نیچے دھکیل دی اور پھر فارم ہاؤس میں جشن شروع ہو گیا۔ صاحب اس کی رنگینوں میں کھو گئے۔ سوئمنگ پول کی تیراکی اور گُل گلزار کی رنگینیوں میں ہفتے جیسے پل بھر میں گزر گئے۔

سپیچ رائٹر اور دونوں سیکرٹری مقررہ دن فائل لے کر فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ تینوں اپنی جگہ خجالت

محسوس کر رہے تھے۔ بقول صاحب کے اس ہفتے نہ آسمان گرا تھا اور نہ ہی قیامت ٹوٹی۔ ہم خوامخواہ صاحب کی موج مستی میں مخل ہو رہے تھے۔ تینوں خجالت کو دل میں دبائے دوپہر تک صاحب کے آفس میں منتظر رہے لیکن صاحب خلوت خانے سے باہر نہ آئے۔ ملازموں سے پوچھا گیا، سب نے کہا کہ ہم نے صاحب کو گذشتہ رات مہمانوں کے جانے کے بعد خلوت خانے میں جاتے تو دیکھا تھا مگر باہر آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سیکرٹری کو مجبوراً صاحب کے خلوت خانے میں مخل ہونا پڑا۔ صاحب اوندھے پڑے تھے، منہ اور نتھنوں سے خون بہہ رہا تھا۔ سیکرٹری اے نے پولیس افسر کو حکم دیا کہ یہ پائزننگ کیس معلوم ہوتا ہے۔ فارم کے سب ملازمین کو گرفتار کر لیا جائے۔ ہسپتال میں ابتدائی اور فوری طبی امداد ملنے سے صاحب کے حواس کچھ بحال ہوئے وہ کبھی کراہتے کبھی چلانے کی ناکام کوشش کرتے۔ نقاہت سے ان کی آواز اپنی آواز ہی میں ڈوب جاتی۔ ارے کوئی ہے؟ ارے بیگم۔ ارے دانش ور۔ ارے سیکرٹری اے۔ او سیکرٹری بی۔ تم سب مجھے دیکھو۔ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میرا جسم بے جان ہو چلا ہے۔ ہائے بخار۔ ارے کم بختو! میرا سر پھٹ رہا ہے۔ ارے کم بختو تم سب کدھر مر گئے ہو؟

سب زندہ ہیں۔ صرف تم مر رہے ہو۔۔۔ ایک چھوٹے سے مچھر نے بھوں بھوں کرتے ہوئے اس کے کان میں کہا اور اڑ گیا۔

☆☆☆☆

پوٹھوہاری تخلیق و ترجمہ: ماجد وفا عابدی

نقاب زادی

میں جوں ہی گلی کی نکڑ پر پہنچا۔ اس کی اونچی ہیل کی جوتی کی ٹک ٹک کہیں دور سے آتے گھوڑے کے ٹاپوؤں کی آواز کی طرح میرے کانوں سے ٹکرائی۔ دور سے آتے تانگے کی آواز، بچپن سے میرے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ رہی تھی۔ سینما جاتے، سکول جاتے یا کبھی گاڑی پر سوار ہونے اسٹیشن جاتے؛ یہ آواز مجھے ہمیشہ بھلی معلوم ہوتی۔ میں رک گیا؛ آواز میری ہی طرف آ رہی تھی۔ یہ آواز گلی کی دوسری نکڑ سے آ رہی تھی۔ آواز مانوس سی تھی۔ ہاں آپا رضیہ کی بیٹی فرحؔ، میں جب صبح دکان پر جانے کے لیے گھر سے نکلتا، وہ بھی گھر سے کام کے لیے نکلتی۔ پھر یہ میرا معمول بن گیا۔ مگر میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا، بل کہ کوئی بھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ محلے میں آپا رضیہ کی بہت عزت تھی۔ ہم سب بچے اس کے ہاں سے سپارے کا سبق پڑھے ہوئے تھے۔ وہ ہر گھر میں ہونے والے میلاد میں سرفہرست ہوتی۔ اس کے بغیر میلاد کی محفل کا سماں نہ بن پاتا۔ فرحؔ بھی کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ میلاد میں آ جاتی تو محلے کی عورتیں اس سے درود شریف پڑھنے کی فرمائش کرتیں۔ اس کے معصوم چہرے پر نور کا ہالہ پھیل جاتا۔ باریک باریک ہونٹوں پر صلِ علیٰ کا ورد شروع ہو جاتا۔ پڑھتے پڑھتے وہ کہیں ڈوب جاتی۔ نور میں ڈھلی ایک پری کا حسن اس کے اندر داخل ہو جاتا۔ عورتوں کا جی چاہتا کہ وہ اپنے اپنے کان اس کے گلابی گلابی ہونٹوں پر رکھ دیں۔ پیاری، معصوم اور نازک کلی۔

نجانے کیوں آج میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس کے انتظار میں کھڑا رہوں۔ آواز اب بہت قریب آ چکی تھی۔ فرحؔ کا پورا سراپا میری نظروں کے سامنے تھا، آواز اس کے سراپے میں گم ہو گئی تھی۔ لانبی گردن، اُچکے ہوئے کندھے، سڈول جسم، نقاب میں لپٹی عقابی آنکھیں، ہرنی کی سی چال۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ چلی گئی، جہاں اس نے جانا تھا۔ مگر میرے دل میں اس سے ملنے کا اشتیاق بڑھنے لگا، مگر کسی اجنبی لڑکی سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ جب بھی اس سے آمنا سامنا ہوتا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور ہونٹوں پر چپ کی مہر لگ جاتی۔ میں اسے ایک نظر دیکھنے کے سوا میں کچھ نہ کر پاتا۔ اشتیاق اور بڑھنے لگتا اور رات کو اکثر اس کا خیال ستانے لگتا۔ اس کا سراپا نگاہوں میں اتر آتا۔ کبھی کبھی مجھے خود پر حیرانی ہوتی، اور میں سوچنے لگتا، میں نے خود کو ایک خود ساختہ اور یک طرفہ محبت (جسے میں محبت کا نام تو نہیں دے سکتا) کے چکر میں ڈال کر خود کو فریب تو نہیں دے رہا۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ اسے دیکھتا ہی رہوں۔ اب شام کو واپسی پر بھی میرا اس سے آمنا سامنا ہو جاتا۔ کبھی کبھی وہ میری طرف اچٹتی نظروں سے دیکھتی، تو میری نظریں جھک

جاتیں یا میں ادھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ مگر دل کی عجیب حالت ہونے لگتی، دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ پہروں اس کے بارے میں سوچتا۔ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ پاتا۔ اس کی پُروقار شخصیت کا رُعب، جو مجھ پر طاری تھا، مجھے ریزہ ریزہ کر کے بکھیر کر دیتا اور میں پھر سے اپنے آپ کو سمیٹنے لگتا مگر آج تو میں پتھر کا ہو گیا تھا۔

کیا بات ہے جیلے؟ آج کل تم کام پر نہیں جا رہے؟ روزانہ میں تمھیں یہاں کھڑا دیکھتی ہوں۔ اچانک اس نے میرے پاس رُک کر مجھ سے سوال کیا۔ میں ہکا بکا سا رہ گیا۔ ایک دم مجھ سے جواب نہ بن پڑا، میں تو سمجھا تھا میں اس کے گمان میں بھی نہیں لیکن وہ تو میرے وہاں کھڑے رہنے کا نوٹس لے رہی تھی۔ توقف کے بعد بولا:

‘‘جی۔ وہ آج کل میں گھر میں ہوں۔ دفتر میں کام ختم ہو گیا ہے۔’’

‘‘تو ابھی کیا کر رہے ہو؟’’

‘‘ابھی۔۔۔ ابھی تو کچھ نہیں۔’’ میرے منہ سے نکلا۔ مگر میں تو دکان کھولنے جا رہا تھا۔ میرے منہ سے جھوٹ نکل گیا تھا۔

‘‘تم میرے ساتھ چلو۔ ہمارے آفس میں بھی کچھ لوگوں کی ضرورت ہے۔ میں باس سے تمھاری سفارش کر دوں گی۔’’ میں کسی بھی بات پر راضی نہ تھا، نہ ہی مجھے نوکری کی ضرورت تھی۔

‘‘جی۔ چلے چلتے ہیں۔’’ میں نے کہا۔ اس کے ساتھ چلنا بھی تو میرے لیے کسی شان سے کم نہیں تھا۔ میں بار بار اس کی طرف دیکھتا، اور پھر نگاہیں نیچی کر لیتا۔ وہ کوئی بات کرتی تو میں متوجہ ہو جاتا۔ ڈبل روڈ پر چڑھتے ہی اس نے ٹیکسی پکڑی۔ وہ آگے بیٹھ گئی اور میں پیچھے۔ اس کے بالوں بسی سُوندھی سوندھی خوش بو مجھے مدہوش کرنے لگی۔ کئی بار شیمپو میں دُھلے اس کے بالوں کی ایک لٹ جو نقاب سے آزاد ہونے کی سعی کر رہی تھی۔ ہوا سے لہراتی تو چھونے کو جی کرنے لگتا۔ اچانک اس نے پیچھے مُڑ کر میری طرف دیکھا، شاید وہ کُچھ کہنا چاہتی تھی۔ میں ذرا آگے کو جھک گیا، اس کے سانسوں کی گرمی کا احساس مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگا۔ میں نے ایک دم اس تاثر کو زائل کرتے ہوئے کہا۔

‘‘آپ بہت اچھی نعت پڑھتی ہیں۔’’

‘‘تم نے مجھے کہاں سنا ہے؟’’ اس نے پھر ایک بار پیچھے مُڑ کر دیکھا۔

‘‘ماں کہتی ہے۔ خالہ رضیہ کی بیٹی بہت اچھی نعت پڑھتی ہے۔ میں نے سنی نہیں ہے۔’’

‘‘تو میری تعریف سنی ہے؟’’ وہ مسکرائی۔ میں بھی مسکرا دیا۔۔ دھیما دھیما۔

تم بھی اپنے گھر میلاد کی محفل کا اہتمام کروانا۔ تم بھی سن لینا۔ میں خاموش رہا۔ اور سوچنے لگا: فرح کتنی اچھی ہے؟ اس میں کوئی تکلف نہیں ہے۔ بڑا پن بھی نہیں ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور متوجہ ہونا چاہتا تھا کہ فرح نے ٹیکسی رکوائی۔ میریٹ ہوٹل کا گیٹ آ گیا تھا، اس نے شاید میریٹ ہوٹل ہی جانا تھا۔ جو میری توقع سے باہر

تھا۔ وہ سیدھی ہوٹل میں داخل ہو گئی۔ میں اس کے پیچھے۔ میرے لیے یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ مگر میں اسے فالو کرتا رہا۔ ہوٹل میں اس کی بہت عزت تھی۔ سبھی اسے سلام کر رہے تھے۔ اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر نقاب والا بُرقعہ اتارا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کیا یہ وہی فرح ہے؟ اس نے شارٹ قمیض کے نیچے جین کی پینٹ پہن رکھی تھی۔ جیسے کسی چینل پر کمرشل چل رہا ہو۔ اس نے میری انگلی پکڑی اور گیسٹ روم میں بٹھاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بس تھوڑی دیر کا کام ہے، میں آتی ہوں، پھر تمہیں اپنے باس سے ملاتی ہوں بہت اچھے انسان ہیں۔''

وہ چلی گئی تو میں نے اپنے اردگرد ایک طائرانہ سی نظر ڈالی۔ شاہانہ قسم کا کمرہ تھا اور اعلیٰ قسم کا فرنیچر۔ چند لمحے میں مبہوت سا بیٹھا رہا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا۔ ہلکی ہلکی موسیقی۔ میری آنکھوں میں خمار سا اترنے لگا۔ مگر چند لمحوں بعد ہوٹل کی ایک بلا کی حسین ملازمہ اندر آتے ہی مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''پلیز! کیا لینا پسند کریں گے؟''

''جی، کچھ نہیں۔'' میں نے سیدھا سادا جواب دیا۔ اس نے پھر بھی مشروب اور چند کھانے کی چیزیں رکھ دیں۔

''میں مس فرح کے ساتھ آیا ہوں۔'' لفظ جلدی سے میرے منہ سے ٹپک پڑے۔

سوری! ان کی تو آج بکنگ بڑھ گئی ہے۔ وہ ذرا دیر سے فارغ ہوں گی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے خوبصورت ہاتھوں میں پکڑا البم میری طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ کال گرل گائیڈ ہے۔۔ آپ چوائس کیجیے، میں آتی ہوں۔'' میں نے البم کوئی بار اُلٹ پلٹ کر دیکھا، مگر۔۔۔۔ گلی کی نکڑ پر کھڑی نقاب میں لپٹی وہ لڑکی کہیں نظر نہیں آئی۔

☆☆☆☆

ثاقب امام رضوی

پوٹھوہاری سے ترجمہ: جہانگیر عمران

سُونے آنگن

شریف آنگن کے عین وسط میں بچھی چارپائی سے کہنیوں کے بل بڑی مشکل سے اٹھا۔ کچھ دیر سانس اوپر نیچے رہے تھوڑی دیر بعد طبیعت سنبھلی تو اپنی بیوی فاطمہ کو آوازیں دینے لگا۔ کیا کہتے ہو نیک بخت! فاطمہ صحن کے ایک کونے سے بولی۔ ایک تو آپ مجھے جھاڑو بھی لگانے نہیں دیتے۔ جانے کب تک یہ جنجال ختم ہوں گے۔ بوڑھی ہڈیوں کے ساتھ کب تک ویران صحنوں سے جھاڑ جھنکار چنتی رہوں گی۔

شریف کہنے لگا! میں نے تو چھوٹی سی بات پوچھنے کے لیے آواز دی تھی۔ آگے سے تم اپنے اُلٹے سیدھے نصیبوں کا رونا رونے لگی ہو۔ شریف یہ بات کہہ کر کھانسنے لگا۔ گھر میں پہلے ہی کیا غم کچھ کم تھے کہ اوپر سے شریف کی دمے کی وجہ سے کھانستے کھانستے بُری حالت ہوگئی۔ فاطمہ کے اوسان خطا ہوگئے۔ کتنی بار کہا کہ اتنا اونچا نہ بولا کریں فاطمہ نے سر سے دوپٹا اتارا اور شریف کی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

کھانسی کیا تھی میرے آگے! مجھے تو مشکل وقت کے ہاتھوں مار پڑ گئی ہے۔ شریف تھوڑی دیر بعد سُر میں آیا تو کہنے لگا۔ جو بات میں پوچھنا چاہتا تھا وہ تو درمیان میں ہی رہ گئی۔ اچھا! بتائیں کیا کہتے تھے آپ۔ فاطمہ سرہانے کی طرف بیٹھ کر کہنے لگی۔ میں تنویر اور شبیر کے بارے میں پوچھنے لگا تھا کیا اُن کا خط نہیں آیا۔ روز بھاگ حسین ڈاکیا! ہمارے گھر کے پاس سے شُوں کر کے گزر جاتا ہے۔ جانے ہمارے بیٹے بہت مصروف ہیں یا کوئی اور بات ہے۔

کیا کریں وہ سب کچھ بیچ بٹا کے سات سمندر پار گئے ہیں۔ اب وہ کچھ کمائیں گے تو ہمارا خیال کریں گے۔ فاطمہ کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔

جھلیے! ہم نے اُن کی کمائی کا کیا کرنا ہمارے لیے تو پنشن ہی بہت ہے۔ میں نے تو اس صحن کی رونقوں کی بات کی ہے۔ گھر اپنے رہنے والوں کی آسوں امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ہوتا ہے لیکن انسان اپنی مجبوریوں اور ضرورتوں کے رستے پر چلتے ہوئے اپنے گھروں سے محبت اور رشتہ بھول جاتے ہیں۔ روپے پیسے کے لیے اپنی زمین کے ساتھ سچا اور گہرا رشتہ ختم کر دیتے ہیں۔ دیکھو ناں فاطمہ! پھولوں سے بھرے ہوئے پودے ٹنڈ منڈ ہو گئے ہیں۔ صحن ویرانی کا منظر پیش کر رہا ہے۔ گھر کی دیواریں گھر والوں کی انتظار میں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں۔ جانے کب وہ وقت آئے گا جب آرزوؤں کا سفر ختم ہوگا اور اس گھر کے وارثوں کی مسکراہٹیں

اس ویران گھر کے صحن میں رونق لے کر آئیں گی۔ ہم مسکین کب تک یادوں کی زنبیل کھول کر اُس میں سے پٹولے پھرولتے رہیں گے۔ شریف یہ باتیں کرتا کرتا روہانسا ہوگیا اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور فاطمہ ہاتھ میں جھاڑو اٹھائے ہوئے دُور یادوں میں گُم ہوگئی۔

وقت گزرتا رہا۔ شریف اپنے بیٹوں کے انتظار میں اپنی اُکھڑی سانسوں کے ساتھ وقت سے لڑتا رہا لیکن آخر ایک دن صبح سویرے وہ زندگی کی بازی ہار گیا۔

فاطمہ نے اپنے بیٹوں کو تار بھیجی اور خود سارا دن شریف کی چارپائی کے ساتھ لگ کے روتی رہی۔ آنکھوں سے آنسو ختم ہوئے تو بین کر کر کے بیٹوں کو آوازے دیتی رہی۔ عصر کا وقت ہوا تو گاؤں کے لوگوں نے شریف کی چارپائی اٹھائی۔ ہوا سے چارپائی پر پڑی ہوئی کڑھائی والی چادر اپنی جگہ سے ہٹی تو فاطمہ نے دوڑ کر کونا سیدھا کیا۔ پھر کسی نے اونچی آواز میں کہا! کلمۂ شہادت! اور اس کے بعد فاطمہ نے گھر کی دہلیز پر جاتے ہوئے مسافر کو دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا۔

وقت کی رفتار کب کسی کے اوکھے یا سوکھے سانسوں کو دیکھتی ہے۔ ایک رات فاطمہ نیند کے شہر میں گئی تو نہ لوٹی۔ بیٹوں کے انتظار میں وہ کب تک دکھوں بھری زندگی کا بوجھ اٹھائے پھرتی۔ لوگوں کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ محلے کی لڑکیاں چارپائی کے ساتھ سپارے لے کر پڑھنے لگیں۔ محلے کے نمبردار نے شریف کے بیٹوں کو تار روانہ کی اور کفن دفن کا انتظام کیا۔ اتنی دور سے ایک دن میں کون پہنچ سکتا ہے۔ عصر کے وقت فاطمہ رشتے داروں کی محبتوں کو لے کر شریف کے ہمسائے میں جا کر آباد ہوگئی۔

کچھ عرصے بعد شریف کے بیٹوں نے بھاگ دوڑ کر کے امریکہ کی شہریت حاصل کر لی۔ اُن کو اپنا گاؤں بہت یاد آرہا تھا۔ ماں باپ کی باتیں اور اُن کی لوریاں یاد کر کے وہ دکھی ہو جاتے۔ اُن کی بیویاں اُن کو دلاسے دیتے ہوئے کہتیں کہ قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ آپ کے نصیبوں میں ماں باپ کا مُنہ دیکھنا نہیں تھا سو آپ نہیں جا سکے۔ انسان کو روزگار کے لیے اکثر گھر بار چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔

ایک دن دونوں بھائی بیٹھ کر اماں ابا کی باتیں کرنے لگے۔ چھوٹے شبیر نے کہا۔ بھائی جان! قبریں ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی۔ تنویر کہنے لگا۔ دوست! تم نے سچ کہا ہے اب ہم دیر نہیں کرتے۔ جلدی کوئی جانے کا بندوبست کرو۔ عصر کا وقت تھا۔ اڈے سے ایک کالی کار گاؤں کی طرف مُڑی۔ کار کیا تھی۔ ایک جہاز دکھائی دیتی تھی۔ گاؤں کے بچے اُس گاڑی کے پیچھے بھاگنے لگے۔ کار کے ساتھ کیا مقابلہ وہ دُھواں اڑاتی شاں شاں کرتی دُور نکل گئی۔

گاؤں کی بڑی گلی میں کار رُکی۔ تنویر نے پچھلے دروازے کھولے تو شریف کی بہوئیں نیچے اُتر کے کہنے لگیں۔ خاصا پسماندہ گاؤں ہے یہ آپ کا ہی حوصلہ ہے جو آپ اس گاؤں میں رہتے رہے ہو۔

وہ اپنے گھر کی دہلیز پر پہنچے۔ آگے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر سے پوچھنے لگے۔ آخر ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور کہنے لگا آپ شریف کے بیٹے تو نہیں؟

جی بابا جی ہم شریف اور فاطمہ کے بیٹے ہیں لیکن بابا جی گھر پر تو تالا لگا ہوا ہے۔ چابی کس کے پاس ہے؟

بابا کہنے لگا۔ بیٹو! ویران گھروں کے تالے کیا تالے ہوتے ہیں۔ تھوڑا سا جھٹکا دو تو کھل جاتے ہیں۔

تنویر نے کوشش کر کے تالا کھولا۔ صحن میں سَر سَر تک اونچی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ تھوڑا سا دروازہ دھکا لگا کر کھولا ہی تھا کہ چھوٹے شبیر نے کہا بھائی جان! اندر جا کر کیا کریں گے۔ آئیں قبروں کی طرف چلتے ہیں اور پھر واپس بھی تو جانا ہے۔

☆☆☆☆

شاہد لطیف ہاشمی

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

روشن شیشے پر آنکھ

یادیں کیا ہیں؟

مرغی کے معصوم بچوں کی طرح ۔ جب جی چاہا گٹ گٹ کی اور یادوں کے چوزے پاس بلا لیے ۔

آج وہی یادوں کے چوزے مجھے گھیرے ہوئے ہیں ۔ یہ میرے بلانے پر آئے ہیں ۔ ڈرتا ہوں ، ڈر کر بھاگ نہ جائیں ۔ معصوموں کے دل بھی تو بہت چھوٹے ہوتے ہیں ۔ کانپنے لگتے ہیں ۔

بعض اوقات بڑوں کے دل بھی کانپنے لگتے ہیں ، جیسے میرا دل ۔۔۔۔ میں نے کانپتے دل پہ ہاتھ رکھا تو یادوں کے بے شمار رنگ دار چوزوں میں ظفری کا چہرہ گڈمڈ سا ہو کر ابھرنے لگا ۔ گاؤں کی خبریں ، گاؤں میں ہونے والے سچے جھوٹے تذکرے ، گاؤں کی ہر خوشی اور غمی کی داستانیں ، لہلہاتی فصلوں کی پگڈنڈیوں پہ کاسنی دوپٹوں کے لہراتے آنچلوں میں بندھے پیار کے قصے ، میرا دل بھر آیا ۔ ظفری کا چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا ۔ جی چاہا کہ اُڑ کر شہر پہنچ جاؤں اور باتوں کا بھرا ہوا انبار ظفری کے آگے خالی کر دوں ۔ کئی بار موبائل پہ یہ بھڑاس نکلی مگر کم کم ۔ سامنے بیٹھ کر باتیں کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے جیسے کتاب اور کمپیوٹر کا مزہ ۔ کتاب تو ایک دوست ہے ساتھی ہے ۔ مگر یہ ساتھی بہت دور چلے گئے ہیں گاؤں خالی خالی سا لگتا ہے ۔ سب یار پنچھیوں کی طرح اُڈاری مار پردیس جا پہنچے ۔ جو بچ گئے ، وہ کمروں میں اس طرح بند جیسے پیکٹ میں بند اشیا ۔ کبھی ملاقات جو ہو تو گاؤں میں ہونے والی کسی شادی کی تقریب میں یا جنازہ گاہ میں ۔ موبائل آنے سے ملاقاتوں کے یہ سلسلے اب اور بھی مختصر ہونے لگے ہیں ۔

ظفری ایک ایسا دوست تھا ، جسے میں بھلا نہیں سکتا تھا ، بچپن سے لے کر جوانی تک کے سفر میں وہ میرے ساتھ رہا تھا ۔ بچپن میں وہ بہت رویا تھا ۔ اُس کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی ۔ ماں ایک دائمی مریضہ رہنے کے بعد اسے اکیلا چھوڑ گئی تھی ۔ میں اس کے دکھ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا ۔

اس کے آنسو پونچھتے پونچھتے خود بھی رو پڑتا تھا ۔ وقت اسے شہر لے گیا تو وہ سب کچھ بھول گیا ۔ مجھے بھی ۔ خود کو بھی ۔ آوازوں کی مختصر ملاقاتوں سے میرا جی کبھی نہیں بھرا تھا ۔ ملنے کی خواہش ہمیشہ سر اٹھائے رکھتی ۔ مجھ سے نہ رہا گیا ۔ شہر چلا آیا ۔

ظفری سے ملا تو یوں لگا جیسے دل میں کسی نے ایک نئی بیٹری ڈال دی ہو ۔ میرا انگ چارج ہو

گیا تھا۔ دل اندر سے مچل رہا تھا۔ باتیں لہروں کے مانند کناروں کو توڑنا چاہتی تھیں۔

“دیکھو کون آیا ہے۔” ظفری نے حسبِ عادت اپنی بیوی کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ وہ مجھ سے لپٹنا چاہتا تھا کہ بھابی آڑے آ گئی۔

“خوب مل لو۔ میں اندر چلی جاتی ہوں۔ اتنے برسوں بعد بھی تمہارا پیار ختم نہیں ہوا؟” بھابی نے جھوٹ موٹ مڑتے ہوئے کہا اور پھر اپنا سر میرے آگے رکھ دیا۔ مگر ظفری نے میرا بازو تھام رکھا تھا۔ سیدھا اپنے کمرے میں لے گیا۔

“یہاں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔” باتوں سے میرا منہ قے کی طرح بھرا ہوا تھا، مگر میں پی گیا۔ ظفری اُٹھ کر ٹی۔ وی آن کرنے چلا گیا۔

“آج تو خوب مزہ آئے گا۔”

“کوئی خاص بات ۔۔۔” میں نے حیرانی سے پوچھا۔

“پاکستان اور انڈیا کا فائنل ہے۔ آج تمھارے ساتھ بیٹھ کے دیکھوں گا۔ ریموٹ لے کر وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔

“خوبصورت چائے ہونی چاہیے۔ اپنے پیارے بھائی کی طرح۔”

“جی میں جانتی ہوں، ذرا بھائی سے کچھ باتیں تو ہو جائیں۔”

“بھائی پانی لے آؤں؟”

“ہاں بھابی۔ ذرا ٹھنڈا ہو۔ راستے بھر پیاس لگی رہی ہے۔”

“رخشندہ کیسی ہے؟” بھابی نے خیر خیریت کی بات چھیڑی تو ظفری پھر بول پڑا۔

“بھائی ادھر ہی ہے۔ باتیں ہوتیں رہیں گی۔ تم چائے بناؤ اور اچھا سا کھانا تیار کرو۔ سب باتیں میچ کے بعد ہوں گی۔” باتیں میرے پیٹ میں چوہوں کی طرح دوڑنے لگیں مگر ظفری کی آنکھیں ٹی۔ وی سیٹ پر لگی تھیں۔ اتوار تھا ظفری کے بچے بھی میچ دیکھنے آ بیٹھے۔ تھوڑی دیر میں چائے اور بسکٹ بھی آ گئے لیکن میرے منہ میں باتوں کے نوالے بھرے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے چائے کا زہر اندر اتارا اور قریب تھا کہ میرا دل میرے قابو سے نکل جاتا، میں نے ظفری سے اجازت لینا چاہی۔ بھابی میرے اس رویے سے شاید خوش نہیں تھیں لیکن میرے دل میں جو ایک شدید خواہش تھی کہ ظفری مجھ سے گاؤں کی ایک ایک بات کو سو سو بار پوچھے گا اور میں اس کو ترسا ترسا کر بتاؤں گا، رفو چکر ہو گئی تھی۔ ظفری کو دوپہروں میں خاموش گاؤں کی سنسان گلیاں اور کنوئیں کی کھنکھاتی ہنسی تک یاد نہیں تھی۔

وہ کہاں کھو گیا تھا؟ اس کی نظریں روشن شیشے پر جمی تھیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا:

''یار! آج ہی تو تُو آیا ہے ایک رات تو رہتا جا۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے؟''

''بس میں نے تجھے دیکھنا تھا دیکھ لیا۔ بہت مدت ہو گئی تھی دیکھے ہوئے۔ اب میں چلتا ہوں۔''

بھابھی بھی میری طرف دیکھنے لگی، لیکن میں نے دل پکا کر لیا۔ ''کم از کم کھانا تو اکٹھے کھا لیتے۔'' ظفری نے تکلفاً کہا۔

''پھر کبھی سہی۔'' میں نے بھابھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلو تمھاری مرضی۔ کبھی کبھی چکر لگا لیا کرو۔''

''اور تم بھی۔'' میں نے دل ہی دل میں جواب دیا اور باتوں کی کھلی ہوئی گٹھڑی کو دوبارہ گانٹھ لگا کر کندھے پر رکھ لیا تا کہ ظفری کے میچ کا مزہ کرکرا نہ ہو۔ شہر آتے ہوئے بھی ظفری جیسے بہت سے لوگ موبائل کانوں سے لگائے ایک دوسرے سے بے پروا اپنے اپنے خیالوں میں مگن تھے۔

ہر ایک اپنی دنیا میں مست، پاس بیٹھے ہوئے شخص سے دور اور دور والے سے نزدیک۔۔۔ عجیب کیفیت سے دوچار۔۔ شہر سے جاتے ہوئے بھی وہی عالم تھا۔ کہ پاس بیٹھا ہوا شخص بھی بہت دور دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ میں نے بہت کوشش کی کہ واپسی کا سفر کسی اچھے شخص سے بات چیت میں گزر جائے، مگر ہر شخص کہیں نہ کہیں کسی دور والے سے رابطہ کیے ہوئے تھا۔۔۔ جیسے وہ اکیلا اس گاڑی میں بیٹھا سفر کر رہا ہو۔ میں نے تمام سیٹوں پر بیٹھے لوگوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا،، سب کی یہی حالت تھی، کئی لڑکوں نے ہینڈفری کانوں سے لگا رکھے تھے۔ کئی باہر کا نظارا کر رہے تھے۔ ایک تو اس موبائل نے بندے کو بندے سے دور کر دیا ہے۔ جدھر دیکھو لوگ اپنی دنیا میں مست۔۔۔ وقت نے ایسی چھلانگ لگائی کہ دکھ درد بانٹنے والے ایک دوسرے سے اجنبی نظر آنے لگے ہیں۔ لڑکے پاس بیٹھے بھی ہوں دور کسی ناواقف بندے سے باتوں میں لگے رہتے ہیں، یا ایس ایم ایس پر پیغام رسانی کا سلسلہ شروع کر رکھا ہوتا ہے۔ جس کے پاس ٹچ موبائل ہو وہ فیس بک کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ وجود چاہے ایک جگہ کیوں نہ ہوں لیکن باتیں بہت دور سے آتی جاتی رہتی ہیں۔ یہی حال گاؤں اور شہروں میں یکساں نظر آتا ہے، انٹرنیٹ کیفے میں بیٹھے گھنٹوں ضائع کر دیتے ہیں۔ وقت نے ایسی چھلانگ لگائی کہ کوئی شخص کسی کے پاس بیٹھ کر اپنا دکھ درد بانٹنے کو تیار نہیں۔ فیس بک اور انٹرنیٹ کی دنیا نے حقیقی دنیا چھین لی ہے۔ خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیا جہاں خوابوں کے سوا کچھ نہیں۔

سوچتے سوچتے میرا ذہن ماضی کی دہلیز پہ جا کھڑا ہوا۔ سوچا تھا کہ تئیس (۲۳) سال نوکری کرنے بعد گاؤں جا کر اپنے پرانے ساتھیوں سے مل بیٹھوں گا۔ جدائی کے بکھرے ایک ایک لمحے کو قرب کی چادر میں سمیٹنے کی کوشش کروں گا۔ وائے ناکامی۔۔۔ اب سوچتا ہوں کی ساٹھ سال تک نوکری کر لیتا تو بہت اچھا ہوتا، سوائے پچھتاوے کے اب کچھ حاصل نہیں ہے۔ جن خیالوں کی تسبیح میں نے پروئی تھی اس کا دھاگہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ لڑکوں نے اپنی الگ راہ نکال لی تھی۔ لڑکیاں غیر ملکی ڈراموں کی دلدادہ ہو گئی تھیں۔۔۔ ایک گھر کے

اندر کئی گھر بن گئے تھے۔ جنھیں میڈیا نے اور پُختہ کر دیا تھا۔ میری عمر کے لوگوں کا جینا دوبھر ہو گیا تھا۔۔ جنھوں نے پرانے وقت کو دیکھا تھا۔۔ اور اب نئی روشنی کی چندھیاہٹ میں زندگی گزار رہے تھے۔ پلِ صراط کا منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ یادوں کے بلائے ہوئے چوزے ڈر کر بھاگنے لگے۔

بھائی جان! گاڑی خالی ہو گئی ہے۔ کنڈکٹر کی بھاری اور بھدی آواز پر میں شرمندہ سا ہو کر نیچے اتر آیا۔۔ مگر میرا دل گھر جانے کو نہ چاہا۔۔ ظفری کا خیال بار بار دل کو کچوکے مارتا۔۔

کتنی باتیں لے کر میں اس کے پاس گیا تھا۔۔

کتنی خوشیاں بانٹنے گیا تھا۔۔ دل میں ایک ہول سا اٹھا اور گانٹھ میں بندھی ہوئی خوشیاں دم توڑنے لگیں۔۔ شام اتر آئی تھی۔۔ اندھیرا اچھل رہا تھا۔ میں خاموشی کی تصویر بنا گھر میں داخل ہوا۔ ساری رات نیند نہ آ سکی، نیند کہیں کوسوں دور تھی۔۔ میں نے تب اپنے دل سے سوال کیا۔ کیوں تنگ کرتا ہے؟ زندگی کو مشکل کیوں بنا رہا ہے۔ تیز دھار پر چلنے کو کیوں مجبور کر رہا ہے۔

وقت بول پڑا۔۔۔۔ کہنے لگا میں تو ہمیشہ سے انسان کے ساتھ ساتھ ہوں۔ میں تو کبھی نہیں ٹھہرتا۔

ہاں انسان خود ٹھہر جائے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ تجھے نئے زمانے کے ساتھ چلتے ہوئے ڈر لگتا ہے ناں۔

ہاں ہاں مجھے ڈر لگتا ہے۔۔۔ ڈر لگتا ہے میں حواس کھونے لگا۔ چند لمحوں کے بعد جب حواس ذرا بحال ہوئے تو میں نے یادوں کی بندھی ہوئی گٹھڑی پر نظر دوڑائی۔۔۔ اٹھائی اور ماضی کے پرانے کمرے میں بند کر کے نئے خیالوں کا تالا لگا دیا۔۔۔ چوں چوں کرتی یادیں، کُڑکُڑ کرتی مرغی کے پروں میں چُھپ گئیں۔۔۔ میرے اندر سناٹا چھا گیا۔۔۔ میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔۔۔۔

اگلے روز میں دوبارہ شہر چلا گیا۔ لیکن اس بار کسی جگری یار سے نہیں ملا بلکہ شہر سے نیا لیپ ٹاپ خریدا۔۔۔ ایوو کا پیکج کرایا۔۔۔ اور گھر چلا آیا۔۔۔ گھر آتے ہی ایسے لگا، جیسے میرے وجود پر رکھا، گزرے ہوئے کل کا سارا بوجھ اتر گیا ہو۔

☆☆☆☆

شیراز اختر مغل

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

ڈر

لاجو شادی کے نام سے یوں ڈرتی تھی جیسے کوا پتھر سے۔

اس کے ساتھ کی لڑکیاں چار چار پانچ پانچ بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔ ایک وہ تھی کہ آس پاس ڈھول باجوں کی آوازیں سن کر اس کے منہ پر دسمبر کے مہینے میں بھی پسینہ آ جاتا تھا۔ چوہدری حکم داد جو گاؤں کا بڑا تھا، کوئی بھی مسئلہ ہو، اسے یوں لگتا تھا جیسے یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ اپنی بیٹی کے مسئلے پر پتہ نہیں وہ اس قدر مجبور کیوں تھا۔ یہ مسئلہ اس کے بائیں ہاتھ سے کیا دائیں سے بھی ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔

کبھی کبھی اسے اپنی بیوی بھی بہت یاد آتی تھی، اگر وہ ہوتی تو اپنی بیٹی کے دل کو ٹٹول لیتی کہ اس کے من میں کیا چل رہا ہے۔ اس کے ارمانوں کی راکھ سے امید کی کوئی چنگاری ڈھونڈ لیتی۔ مگر یہ بات اب خواب ہو گئی تھی۔۔۔۔ وقت تھا کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ خود کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا پاتا۔ کون سا حربہ تھا جو اس نے نہیں آزمایا تھا۔ اس نے لاجو کی سہیلیوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا، سہیلیوں نے بھی بہت زور لگایا مگر اس کے منہ سے نکلی ہوئی نہ، ہاں میں نہ بدل سکی۔

بیٹی کا دُکھ اور اپنی تنہائی کئی بار اُسے ڈسنے لگتی۔ اس کی نیند اُڑ جاتی۔ اس کی آنکھوں کے گرد پڑے گہرے سیاہ حلقے دور ہی سے نظر آنے لگ جاتے، جن کے اندر اس کے ارمان دکھائی دیتے رہتے۔ لاجو بھی اپنے باپ کا دکھ بخوبی جانتی تھی۔ ایک تو اسے اپنے باپ کا دُکھ اور دوسرا اپنے اندر دھنسا خوف، ان دونوں چیزوں نے اسے مریض سا بنا دیا تھا۔ چوہدری حکم داد نے جب اپنی بیٹی کی یہ حالت دیکھی تو اسے سینے سے لگا لیا۔ کہنے لگا۔

”میری پیاری بیٹی! دیکھ تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟ میری جان تم خوش رہا کرو۔ تمھاری خوشی سے میری خوشیاں وابستہ ہیں۔ تو شادی نہیں کرنا چاہتی تو نہ کر۔ کم از کم ہنس لیا کر، اپنی سیلیوں سے ملا کر۔ گھر کے کاموں میں لگی رہا کر، تیرا دل بہلا رہے گا! اور کچھ نہیں تو پودوں کو پانی ہی دے دیا کر، کبھی لسی بلو لی، کبھی مرغوں کو دانہ پانی ڈال دیا۔ بیٹا دل کو بہلائے رکھو۔

مرغوں کا نام سُنتے ہی لاجو کو الرجی سی ہونے لگی، اسے مرغوں سے سخت نفرت تھی، کہنے لگی۔

اِن کو چُھری لگاؤ، میری ان مرغوں سے جان جاتی ہے۔ میں تو ان کو دیکھنا ہی پسند نہیں کرتی۔ آپ

کہتے ہیں کہ میں ان کو دانہ پانی ڈالوں ۔

چوہدری حکم داد بیٹی کی ان باتوں کو سن کر پہلے تو ہکا بکا رہ گیا ۔ پھر اپنی بیٹی کے تھرکتے ہونٹوں کو دیکھ کر سب کچھ سمجھ گیا ۔ اسے ایسے لگا جیسے اس نے اپنی بیٹی کا دل ٹٹول لیا ہو ۔ جیسے امید کی کوئی کرن نظر آ گئی ہو ۔ دوسرے دن اس نے صحن کے ایک کونے میں کھمبیل (زمین دوز ڈربہ) کھدوائی ، تمام مرغوں کو بیچ کر شہر سے کبوتروں کے بہت سے جوڑے لے آیا ۔

☆☆☆☆

منور حسین عاصی

پوٹھوہاری سے ترجمہ: مریم حیات ناگی

ڈنگر اور ڈنگر سوچ

صبح پو پھٹنے سے قبل دریائے سواں کے کنارے ایک بھاری بھرکم آواز آئی:

"ادھر ہی پڑاؤ کرو"۔

لاٹھیوں اور سوٹیوں والے آدمی چاروں طرف ایسے پھیل گئے جیسے آندھی جھکّو بُھوسے کو بکھیرتی ہے۔ ہر طرف سے جانوروں کو ہانکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

پھر وہی آواز گونجی:

"جانوروں کو کھیت میں اکٹھا کرو اور اِن کا دھیان رکھنا"

جانوروں کی طرح طرح کی آوازیں آئیں اور کچھ دیر بعد مدھم پڑ گئیں۔ ساری رات چلنے کی وجہ سے جانور تھک چکے تھے۔ اِن میں سے کچھ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور کچھ بیٹھنے کی تیاری کر رہے تھے۔ بھینس تھک ہار کر بیٹھ گئی تھی جبکہ کتّا قریب کھڑا ڑیں ڑیں کر رہا تھا یقیناً اُسے بھوک نے نڈھال کیا ہوا تھا، گائے اپنے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی، بکروٹا بکری کا دُودھ پی رہا تھا، بھیڑیں ایک طرف اکٹھی کھڑی جگالی کر رہی تھیں، گھوڑا بار بار گردن کی انگڑائیاں لے کر تھکاوٹ اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا اور گدھا اپنے بڑے بڑے کانوں سے مچھر اُڑا رہا تھا۔ صبحِ صادق کے ہوتے ہی جب بکروٹا دُودھ پی کر فارغ ہوا تو پُھدکتا ہوا ایک دَم کھڑا ہو کر، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حیرانی کے ساتھ کیا دیکھتا ہے، کہ ایک گھنا جنگل، گول گول چھوٹے بڑے پتھر، اُونچی نیچی پہاڑیاں اور بہتے پانی کا شور، اُسے یہ جگہ کچھ نئی سی لگی تو وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا بچھڑے کے پاس جا کر پوچھنے لگا:

"بھائی! ہم کہاں ہیں، یہ کون سی جگہ ہے، یہ اَن دیکھے دو ٹانگوں والے کون ہیں؟

وہ بہت تھکا ہوا تھا بُرا سا منہ بنا کر کہنے لگا:

"کسی اور سے پوچھو! مجھے نہیں پتا"

کٹّے کے پاس گیا وہ بھوکا تھا اُس نے بھی اپنا موٹا سر نہ میں ہلا دیا۔ بکروٹا پریشان سا ہو کر گائے کے پاس گیا:

"خالہ خالہ!"

وہ ساری باتیں پہلے ہی سُن چکی تھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ایک آواز آئی:

”بڑ بیے بڑ بیے“

ایک دَم سب جانوروں نے پیچھے مُڑ کر اُدھر دیکھا، کیا دیکھتے ہیں کہ مُونچھوں والا آدمی بھیڑ کے ایک بھیڈو کو گردن سے پکڑے گھسیٹتا ہوا لے جا رہا ہے اور داڑھی والا آدمی ایک بڑا سا چُھرا لیے اُس کے استقبال کے لیے کھڑا ہے۔ مونچھوں والے نے بھیڈو کو اُس کے آگے جا کر لٹا دیا۔ داڑھی والے نے چُھرے پر کچھ پڑھ کر پھوک ماری پھر بھیڈو کو گھٹنوں کے نیچے دبا کر اُس کا گلا کاٹنے لگا۔ یہ دیکھتے ہی بکروٹا پاگلوں کی طرح سر پٹ دوڑا اور جا کر گائے کی ٹانگوں میں چُھپ گیا وہ بہت گھبرایا ہوا تھا کیوں کہ اُس نے یہ سب کچھ پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ اُس نے وہاں سے کانی آنکھ سے دیکھا، کیا دیکھتا ہے کہ بھیڈو خون میں لت پت پڑا تڑپ رہا ہے اور داڑھی والا اُس کے ریشم جیسے نرم و نازک گھنگھریالے بالوں پر اپنا چُھرا صاف کر رہا ہے۔ اتنے میں ایک اور وردی والا آدمی گھوڑے پر سوار کندھے کے ساتھ بندوق لٹکائے نمودار ہوا۔

دھوتی والے آدمی کو بُلا کر کہنے لگا:

”اوئے تُو اور وہ!“

مونچھوں والے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”تم دونوں اس کی کھال اُتارو اور اچھی سی تکہ بوٹی بناؤ“۔

دھوتی والا ”رائٹ سر“ کہہ کر اپنے کام میں جُت گیا۔

”آگ جلاؤ اور کرارا سا گوشت بھونو میں ذرا ستالوں“۔

وہ اس بار ریش کو حُکم دے کر گھوڑے کو پکڑے ایک طرف چلا گیا۔ بکروٹے کو جب ہوش آیا تو ٹانگوں سے باہر آ کر گائے خالہ سے پوچھنے لگا، اُس نے بیل کی طرف اشارہ کیا کہ جو پوچھنا ہے اپنے ماموں سے پوچھو۔ اُس نے پریشانی کی حالت میں بیل سے پوچھا:

”ماموں! ہم کہاں ہیں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ یہ اَن دیکھے دو ٹانگوں والے کون ہیں؟ داڑھی والے نے چُھرے پر کیا پڑھ کر پھونکا؟ بھیڈو کو کیوں مارا؟ اُس کا کیا قصور تھا؟ ہم پہلے کُھلے میدان میں تھے اب یہاں ہیں؟ یہ کیا ماجرا ہے؟ بتائیں ناں ماموں جان!“

بکروٹے نے اپنے سارے سوال ایک ہی سانس میں کر ڈالے تو بیل نے کہا:

”تُو نے سچ کہا ماموں کی جان! یہ سچ مچ نئی جگہ ہے اور آدمی بھی اَن دیکھے ہیں بھیڈو کو گوشت کے لیے ذبح کیا گیا، داڑھی والے نے چُھرے پر تکبیر پڑھ کر پُھونک ماری تھی جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے تکبیر پڑھی جاتی ہے۔ ہم پہلے کُھلے میدان میں تھے اب یہاں پانی کے پاس تنگ سی گھاٹی میں ہیں یہ سب کچھ ایک ہی رات میں ہوا ہے لگتا ہے بھانجے ہمارے مالکوں نے ہمیں بیچ ڈالا ہے“۔

یہ سُن کر گائے فوراً بول پڑی:

"یہ کیسے ممکن ہے، مالک ہمیں الگ الگ کر کے بیچتے ناں، ہمیں اکٹھا کیوں بیچا؟ دوسری بات یہ ہے کہ مالک ہمیں رات کے اندھیرے میں کیوں بیچتے؟ ہم اپنے مالکوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ جنہوں نے ہمیں بڑے پیار سے پال کے رکھا ہوا تھا وہ ہمارا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ مالکوں نے ہمارے لیے دھوپ سے بچنے کے لیے چھپر، بارشوں اور سردیوں کے لیے ایک کمرہ بنوا رکھا تھا۔ سخت سردیوں میں مالک ہمارے کمرے میں آگ جلا کر رکھتے تھے اور رات کو اُٹھ اُٹھ کر ہماری خبر گیری بھی کرتے تھے کہ کہیں ہم میں سے کسی کو سردی تو نہیں لگ رہی، ہمیں خوب صورت رنگ دار رسی کے ساتھ باندھا جاتا تھا، ہمارے گوبر کو بر وقت ٹھکانے لگایا جاتا تھا اور ہمارے بیٹھنے والی جگہ کو جھاڑو سے صاف ستھرا کر کے رکھا جاتا تھا تا کہ ہم گندے نہ ہوں اور سکون میں رہیں، مکھیوں مچھروں سے بچاؤ کے لیے دھواں لگایا جاتا تھا، تھن دھو کر دودھ دھویا جاتا تھا، جس برتن میں دودھ رکھتے تھے اُسے کپڑے سے ڈھانپ کر رکھا جاتا تھا، وہاں گائے کے بچھڑوں، میمنوں اور بھینس کے کٹے کو اپنی ماؤں کا دودھ پینے کی مکمل آزادی تھی۔ ہمارے مالک ہمیں صبح کے وقت نمک کی چاٹ چٹا کر، کھیتوں اور چراگاہ میں چرا کر، چھپڑ سے پانی پلا کر شام کو گھر لاتے تھے۔ صبح اور شام کے وقت ہماری کھرلی میں کھل والا چارہ ڈالا جاتا تھا۔ اپنے مالکوں کی کون کون سی صفتیں بیان کروں وہ بہت ہی اچھے آدمی تھے۔ یہ تو لگتا ہے چور ہیں اور ہمیں یہاں چوری کر کے لائے ہیں۔ یہ ہمیں خرید کر نہیں لائے"۔

یہ سُن کر بیل نے ذرا سوچ کر کہا:

"تُو ٹھیک ہی کہتی ہے جان! اِن کے طور طریقے بتلا رہے ہیں کہ یہ چور ہیں"۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہیں تھیں، کیا دیکھتے ہیں کہ دھوتی والا آدمی اپنے ہاتھ میں بالٹی لیے لنگڑاتا ہوا بھینس کی طرف آ رہا ہے بھینس کے قریب پہنچ کر اُسے پاؤں سے زوردار ٹھوکر مار کر اُٹھایا پھر کٹے کو گلے سے پکڑ کر بھینس کے نیچے چھوڑا جب بھینس دودھ اُتار چکی تو اُس نے کٹے کو بے دردی سے دُور دھکیل دیا اور خود دودھ دوہنے لگا۔ مُونچھوں والا آدمی بھی بالٹی لے کر آیا اُس نے بچھڑے کو پکڑ کر گائے کے نیچے ڈالا، دودھ اُترنے پر بچھڑے کو اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ مار کر دور کیا اور دودھ چونے لگ پڑا۔ بکروٹے نے جب یہ کچھ دیکھا تو اُسے فکر لاحق ہوئی کچھ خیال آتے ہی سرپٹ دوڑا اور اپنی ماں کا غٹا غٹ دودھ پینے لگ گیا۔

بکری نے پوچھا:

"نامرادُو تو ابھی ابھی دودھ پی کر گیا تھا کیا تُجھے پھر بُھوک لگ گئی ہے"؟

وہ چُپ کر کے دودھ پیتا رہا۔

بکروٹا جب سیر ہو چُکا تو گردن کو اُوپر کی طرف کر کے انگڑائی لیتے ہوئے بولا:

"ماں جی آج کٹا اور بچھڑا دونوں بھوکے مریں گے۔ میں نے سوچا کہ کہیں یہ آدمی تیرا دودھ بھی نہ دوھ لیں"۔

سب جانور یہ شُغل دیکھتے رہے۔ داڑھی والا جو گوشت بھون رہا تھا ایک ڈول اُٹھا کر بھینس اور گائے کے قریب رکھ کر واپس آ گیا۔ مُونچھوں والا جب دودھ دوھ کر فارغ ہوا تو دودھ والی بالٹی ڈول میں انڈیل دی۔ اِسی طرح دھوتی والے نے بھی اپنی دودھ والی بالٹی کو ڈول میں اُلٹ دیا۔ پھر دونوں اپنی اپنی بالٹیوں میں پانی لے کر آئے اور باری باری پانی دودھ والے بڑے ڈول میں ڈال دیا۔ بھینس اور گائے نے بیک وقت حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یقیناً سوچتی ہوں گی کہ ہمارے دودھ میں اِنھوں نے پانی کیوں ڈالا؟ پر اِس کسب کا راز اُن پر تھوڑی دیر بعد کُھلا جب وردی والا آدمی بندوق گُھماتا ہوا آیا اور پُوچھنے لگا:

”دودھ دوھ لیا ہے کیا“؟

”جی سرکار دوھ لیا ہے“۔

دونوں نے جواب دیا:

”ٹھیک ہے اب اِسے شہر کے ہوٹلوں پر جا کر بیچ آؤ“

”رائٹ سر“ کہہ کر دونوں دُودھ والی بالٹیاں اُٹھا کر ہوٹلوں کی طرف بھاگے۔ سارے جانور یہ سُن کر حیرت سے ایک دُوسرے کو دیکھنے لگے۔

بھینس نے اپنی گردن کو زور سے جھٹکا اور گائے سے پوچھا:

”بہن دُودھ میں پانی ڈالنے کے بعد بھی کیا یہ دُودھ ہی رہتا ہے“؟

”ماموں ماموں!“

بکروٹے کی آواز سُن کر بیل نے پُوچھا:

”بھانجے اَب کیا ہوا“؟

بکروٹا کہنے لگا:

”ماموں! ہمیں تو جانور کہا جاتا ہے پر یہ دو ٹانگوں والی کون سی مخلوق ہے جو ہم جانوروں کو بھی نہیں بخشتی“۔

بیل کے بولنے سے پہلے ہی گائے دانت رڑک کر بولی:

”بھانجے یہ اِنسان کہلواتے ہیں“۔

بیل نے ذرا زور دے کر کہا:

”بھانجے یہ بھی اِنسان کہلواتے ہیں اِن سے بچ کر رہنا۔ یہ جانوروں کے لیے بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ ہم سے کام بھی لیتے ہیں اور ہمیں ذبح کر کے ہمارا گوشت، یہاں تک کہ ہمارے سری پائے بھی کھا جاتے ہیں اور مزید یہ کہ اپنی جیبیں گرم کرنے کے لیے ہمارے چمڑے تک کو بیچ ڈالتے ہیں“۔

بکروٹا چُپ نہ رہا پھر پُوچھنے لگا:

"ماموں جی! مان لیا یہ اِنسان ہیں مگر اِن کا حُلیہ ایک جیسا کیوں نہیں ہے؟

گائے ایک دم بول پڑی:

"اِس کو میں بتاتی ہوں"

بھانجے! ماما اِن کا قد کاٹھ ایک جیسا نہیں ہے، اِن کا حُلیہ ایک دوسرے سے مُختلف ہے، کسی نے دھوتی باندھی ہوئی ہے، کسی نے شلوار قمیض پہنی ہوئی ہے، کسی نے وردی پہن رکھی ہے، کسی نے داڑھی رکھی ہوئی ہے، کسی نے مُونچھیں رکھی ہوئی ہیں، کسی نے بندوق اور کسی نے لاٹھی اُٹھائی ہوئی ہے۔ یہ ایک دوسرے سے مُختلف ہیں اور یہ بھی مانا کہ اِن میں نا اتفاقی کی وجہ سے بہت سے جھگڑے ہیں مگر ہم جانوروں کے لیے یہ سب ایک ہیں۔ جہاں کہیں اور جب بھی جانوروں کی بات ہوتی ہے تو یہ سب ایک جان ہو کر ہم پر وار کرتے ہیں۔ رہی بات انسانوں کی تو ہم نے دیکھا اِنسان بہت اچھی مخلوق ہے وہ اِنسانوں اور جانوروں دونوں سے مُحبت کرتی ہے۔ بکروٹے کو شاید گائے خالہ کی باتوں سے تسلی نہ ہوئی تو وہ بیل سے سر رگڑ کر لاڈلے انداز میں پُوچھتا ہے:

"ماموں جی! یہ دو ٹانگوں والے بچ میں اِنسان ہی ہیں"!

بیل نے مُڑ کر جواب دیا:

"بھانجے سچ جھوٹ کا تو پتا نہیں پر یہ کہلواتے اِنسان ہی ہیں، سُنا ہے دو ٹانگوں والے کو ہی اِنسان کہتے ہیں"۔

گائے فوراً بول پڑی:

"یہ کب اِنسان ہیں؟ اِن کے تو وصف ہی اِنسانوں جیسے نہیں ہیں، سُنا ہے اِنسان بہت اچھے ہوتے ہیں، وہ کبھی کوئی غلط کام نہیں کرتے، وہ کسی کو دغا نہیں دیتے، کبھی کسی کا حق نہیں کھاتے، کبھی کسی کو تنگ نہیں کرتے، دوسری مخلوق کے لیے بھی شاکر ہوتے ہیں، وہ کبھی بھی چوری نہیں کرتے اور ملاوٹ کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"۔

بکروٹا اُچھلا خوب اُچھلا اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوا۔ پھر کہنے لگا:

"واہ ری میری بھولی ماسی! چوری کے جانور پر تکبیر پڑھ کر ذبح کرنا اور اُس ذات کے پاک نام سے شروع کر کے مزے مزے سے اور چسکے لگا کر کھانا کہاں کا اصول ہے۔؟ دُودھ میں پانی ملانا کیا ملاوٹ نہیں ہے؟ اِنہیں تکبیر پڑھنے کا تو بہت شوق ہے مگر ان کو کسی نے یہ نہیں بتایا کہ جس ذات پاک کی یہ تکبیر پڑھتے ہیں اُس ذات نے چوری چکاری اور ملاوٹ کرنے سے سختی سے منع کیا ہے"۔

بکروٹا ذرا رُک کر پھر کہنے لگا:

"ماموں! ہم بیشک گھاس اور چارہ کھانے والی مخلوق ہیں مگر ہم ملاوٹ تو نہیں کرتے۔ یہ دو ٹانگوں

والے جو اپنے آپ کو اِنسان کہتے ہیں اور اپنے ہاتھ مُنہ کے ساتھ گِٹے گوڈے مُل مُل کر دھوتے ہیں اور پرایا مال دیکھتے ہی اِن کے منہ میں پانی کے ساتھ اِن کی رالیں بھی ٹپکتی ہیں۔ اپنے برتنوں کو مانجھ کر اور پاک کر کے اُس میں بُھنا ہوا ہمارا گوشت چسکے لگا لگا کر کھاتے ہیں اور کیا کیا بتاؤں ماموں جی، یہ نام نہاد اِنسان چُھپ چُھپ کر وہ کرتوت کرتے ہیں جس سے ہم جانوروں کو بھی شرم آتی ہے۔ یہ دو ٹانگوں والے جو اپنے آپ کو اِنسان کہتے ہیں۔ ہم سے اپنی مرضی کا کام بھی لیتے ہیں اور ہمارے گوشت سے اپنے اعضاء بھی سینکتے ہیں۔ ہمارے گوشت کے علاوہ چمڑے اور اعضاء کا بیوپار کر کے اپنا اُلو بھی سیدھا کرتے ہیں" ذرا بتاؤ ناں ماموں جان یہ سب کچھ جائز ہے"؟ بکروٹے کی سچی کھری باتیں سُن کر، گائے اور بیل کے منہ پر تالا پڑ گیا لیکن گھوڑے نے اپنے اگلے پاؤں زمین پر زور زور سے مارے اور ہی ہی کر کے ہنسا۔ گدھے نے دو چار ٹیٹنے مارے اور کھر کھر کر کے ہینگتے ہوئے کہنے لگا:

"اُوئے اُوئے دیکھ! اور سچ نہ بولنا ورنہ تُو بھی عاصی ہو جائے گا اور تجھے ایک خاص بات اور بتاؤں جو ایک بار گنہ گار ہو جائے وہ سیدھا دوزخ میں جاتا ہے"۔

☆☆☆☆

نعیم اختر اعوان

پوٹھوہاری سے ترجمہ: نعیم اختر اعوان

رکی سانسیں

گُلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے، وارے نے گلی کو ڈنڈا لگایا تو صادق حسین اٹی کے پیچھے بھاگا۔ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ او صادقا تیرا باپ مَر گیا ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا! تو اس کی نیچے کی سانسیں نیچاور اوپر کی اوپر رہ گئی۔ آواز دینے والے نے دوبارہ آواز دی۔

تیرا باپ مَر گیا ہے اور تم یہاں گُلی ڈنڈا کھیل رہے ہو؟
پہلے تیری ماں نہیں تھی، اب باپ بھی مَر گیا ہے۔
تم بھی سائیں ہی ہو۔ جاؤ گھر جاؤ۔

صادق حسین شاید اسی وقت سائیں صادق ہو گیا تھا! خوشیوں کے پیچھے اِٹی کی طرح بھاگا ساری زندگی دُکھوں نے ڈنڈے مارے، اور رونا نصیب بن گیا۔ سانسوں کے درمیان خواہشوں کا سمندر رکا رہا، جس سے بھاپ اُٹھتی رہی اور آنسوؤں کی برسات ہوتی رہی۔

صادق حسین اپنی پانچ بہنوں اور دو بھائیوں میں سب سے بڑا تھا! اس کے باپ کے چالیسویں پر اس کے چچا نے کھانا کھانے کے بعد تری والے ہاتھ داڑھی پر پھیرتے ہوئے کہا تھا! پتر جی تمھارا باپ، اب دنیا سے گزر گیا ہے! اب تم ہی سب سے بڑے ہو! اپنے گھر کو سنبھالو اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو پالو۔

صادق حسین نے اسی دِن سے خاموشی اختیار کر لی اور عمر کے ایک ایسے حصے ہی میں مزدوری کرنا شروع کر دی جب اس کے ہاتھ اینٹوں کے ٹکڑوں سے بھی چھوٹے تھے!

موسم آتے جاتے رہے، لوگ ہنستے بستے اور اپنے خوابوں کی تعبیریں پاتے رہے!

لیکن صادق حسین کی زندگی سانسوں کے درمیان پھنسی رہی! اسی حال میں وہ سائیں صادق بن کر جوان ہو گیا! اس کے جوتے کپڑے پھٹے رہتے اور اس کا جثہ ہمیشہ گرد آلود رہتا۔

کچھ دِن پہلے اُسے خیال آیا کہ وہ بھی لوگوں کی طرح زندہ رہ سکتا ہے، اگر لالاں اُس کی زندگی میں آجائے۔ لالاں اس بستی کی ایک خوبصورت لڑکی تھی، بچپن میں وہ اس کے ساتھ کھیلا نہیں تھا، لیکن اسے اچھی طرح پہچانتا تھا ہاں کبھی اس سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس سے بات کرنے کے بہانے وہ پچھلی سات، آٹھ جمعراتوں سے بابا شہید کے دربار پر چراغاں کرنے بھی جاتا رہا تھا کہ وہ بھی دربار پر دیا جلانے آتی

تھی۔ آج صادق حسین نے نئے کپڑے جوتے پہن رکھے تھے۔ آنکھوں میں سُرمہ لگائے، سر میں تیل ڈالے تیار ہو چکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ٹھان چکا تھا کہ آج وہ اس سے بات کر کے ہی رہے گا۔ اُس نے چراغ گاہ میں آکر اُس کے نام کا چراغ روشن کیا! اور اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بھی آ گئی۔ جوں ہی وہ اس کے قریب آئی، قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتا وہ خود ہی بول پڑی:

''او سائیں میرے لیے بھی دعا کیا کر! کیا پتہ تیری دعا قبول ہو جائے؟''

صادق اپنی بات بھول گیا اور حیرت سے بولا۔

''کیا دعا کیا کروں؟''

اُس نے تیلی جلا کر چراغ کی طرف بڑھائی اور بولی۔

''میں جس کے نام کا دیا جلاتی ہوں، وہ میرا ہو جائے۔''

صادق پھر بولا۔

''کون ہے وہ؟''

لالاں چراغ جلا کر اٹھتے ہوئے بولی۔

''وہ میرا خالہ زاد ہے، جس کے ساتھ میں کھیل کر بڑی ہوئی ہوں۔ دُعا کرو میرا رشتہ اُس کے ساتھ طے ہو جائے۔'' وہ اپنی بات ختم کر کے تیز قدموں سے چراغ گاہ سے باہر نکل گئی۔ صادق کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے نیچے اوپر کی سانسوں پر کسی نے کیل ٹھونک دی ہو! اس نے اپنے جلائے ہوئے چراغ کو دیکھا، جس کی آگ اس کے دل پر شعلہ زن تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کھول کر دیکھے، جن پر موجود قسمت کی لکیریں وقت نے بہت پہلے مٹا دی تھیں؛ اس نے اپنا ہاتھ چراغ پر رکھ کر جلانا شروع کر دیا۔ دربار کے متولی نے دیکھا تو بھاگا ہوا آیا اور اُس کے ہاتھوں کو پیچھے کرتے ہوئے بولا: ''او سائیں یہ کیا کر رہے ہو۔ سائیں تو میں بھی ہوں، مگر اتنا بھی سائیں نہیں کہ اپنا آپ جلا دوں۔'' صادق اس کی بات سُن کر کہنے لگا: ''سائیں اپنا کچھ ہو گا تو جلے گا ناں۔ مجھے تو غموں نے بہت پہلے ہی خود میں بانٹ دیا تھا۔ ایک حصہ رہتا تھا، وہ بھی آج بٹ گیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔''

یہ کہہ کر وہ دربار کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ پھر کبھی اُس نے نہ تو نئے کپڑے اور جوتے پہنے اور نہ ہی آنکھوں میں سُرمہ ڈالا۔

پانچ بہنوں کی شادی کے بعد اس نے اپنے چھوٹے دونوں بھائیوں کی بھی شادی کر دی تھی۔ سب اپنے اپنے گھروں میں خوش تھے۔ صادق کو وقت نے فالتو کپڑے کی طرح کاٹ کر علاحدہ کر دیا تھا۔ گزرتے وقت نے اس کے نام کے ساتھ ایک اور سابقے کا اضافہ کر دیا تھا! اور وہ تھا باوے کا سابقہ۔ اب تمام بستی والے اُسے باوا سائیں صادق کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ جب بھی کسی گلی سے گزرتا، چھوٹے بچے اُس پر

آوازیں کستے اور پتھر مارتے لیکن وہ خاموش گزر جاتا اور جب بہن بھائیوں کے گھر جاتا تو اُن کے بچے بھی باوے کو تنگ کرتے، اور اُس کے بہن بھائی بھی اس سے کترانے لگتے۔ سب کے لیے روٹی کمانے والا آج خود بھوکا مرنے لگا تھا۔ وہ کبھی ایک بھائی کے گھر اور کبھی دوسرے کے گھر پڑا رہتا اور روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتا، اور اپنی بھابھیوں کے طعنے سنتا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب اس کے دونوں بھائی اس بات پر لڑ پڑے کہ باوے کو کون اپنے پاس رکھے گا۔ صادق حسین جھگڑا نمٹاتے ہوئے کہنے لگا: ''میری وجہ سے مت لڑو میں اپنا بندوبست کر لیتا ہوں۔''

باوا گھر سے نکل کے بابا شہید کے دربار پہ جا بیٹھا۔ دوسرے ہی دن دربار کے متولی کو اپنی گدی خطرے میں گھری محسوس ہونے لگی۔ سائیں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

''رات کو بابا شہید سرکار میرے خواب میں آئے؛ کہہ رہے تھے کہ باوے سائیں صادق سے کہو کہ یہاں سے چلا جائے، نہیں تو کام بہت خراب ہو جائے گا، اس لیے آپ سرکار کا حکم مانیں اور یہاں سے چلے جائیں۔''

باوا اپنی کانپتی ٹانگوں پر اٹھ کھڑا ہوا اور لرزیدہ جسم کو لیے دربار سے باہر نکل کر قبرستان میں موجود اپنے ماں باپ کی قبروں پہ آ کھڑا ہوا، اس نے دونوں کی قبروں سے مٹی اُٹھائی اور اپنے سر میں ڈالنا شروع کر دی، اور روتے ہوئے کہنے لگا: ''اب تم ہی بتاؤ میں سانس بحال رکھوں یا نہیں؟ بولو ناں۔ بولتے کیوں نہیں۔ کچھ تو بولو!'' قبرستان میں موجود ایک بزرگ اُس کی آواز سُن کر دوڑتے ہوئے آئے اور کہنے لگے: ''او سائیں اگر مردے بولتے تو دنیا پھر روتی کیوں؟ جاؤ گھر جاؤ۔'' لیکن اسے کیا معلوم کہ سائیں کا تو گھر ہی نہیں تھا۔

وہ اسی کھلاڑے پہ آ گیا، جہاں بچپن میں اٹی ٹلہ کھیلتے ہوئے، اس نے اپنے باپ کے مرنے کی خبر سنی تھی، اور اس کی سانس رک گئی تھی! اُس نے دور اپنی بستی کو دیکھا جہاں اُس کا کوئی بھی اپنا نہیں تھا۔ اُس نے آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر دیکھا اور زور زور سے کہنے لگا:

''رُکی سانس، رکی رہنے دے ربا۔ اب اسے بحال نہ کر۔''

اگلے دن اس کے بھائیوں کے صحن میں ایک چارپائی پر اس کی میت پڑی تھی جس پر گاؤں کی عورتیں رو رہی تھیں اور اسی صحن کے ایک کونے میں اس کے دونوں بھائی کفن دفن کے اخراجات پر لڑ رہے تھے۔

☆☆☆☆

باقی صدیقی

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

جوبن

جوبن پکی بیری
جو بھی دیکھے
سنگ اُلارے
صحن میں جیسے
بن گئی
پتھر ڈھیری
جوبن پکی بیری

☆☆☆☆

باقی صدیقی

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

کل

آج تو گزرا
کل آئے گا
وقت ایسے ہی آئے، جائے
آج کی راکھ سے
کل کی چنگاری نکلے
نئی آگ لگائے
کل اک آس
کل اک میٹھا دھوکا

جیسے
دور کہیں پر چاند
من پر چھائے
کل کے آس بھروسے پر
بندہ
سارے دکھ جھیلے،
سارے بھار اٹھائے
لیکن کل
کل ہی رہے
آج کبھی نہ آئے

☆☆☆☆

اختر امام رضوی

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

‘‘پُرا’’

تیری یاد "پُرے" کی ہوا
جب بھی آئے
مردہ جسموں میں پھونکے روح
تازہ کردے
بادل گرجیں
مینہ برسے
سوئی مٹی جاگے
ارمانوں کے سوکھے ہونٹوں سے پپڑی اترے
کیکر، کا ہو اور پھلاہی
سارے بوٹے بولیں
بھید دِلوں کا کھولیں

☆☆☆☆

سید طارق مسعود

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

بجھارت

کب جاگو گے؟
میرے بیٹو!
جب سورج تھر تھر کانپے گا
اور
اپنی جلتی بلتی میت کو
میرے صحن دوارے میں
دے مارے گا
تب!!

☆☆☆☆

شیراز طاہر

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شاہد لطیف ہاشمی

اُس رات

جب شام ڈھلے گی
اور
رات پڑے گی
میرا باپ
میرے چہرے کو دیکھ نہ پائے گا
میری ماں
میری لاش پہ بین کرے گی
اس رات
کوئی بارات سجے گی

☆☆☆☆

یاسر کیانی

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شاہد لطیف ہاشمی

مان

تو
جس دیے کا مان کر رہا ہے
تیرے لیے
جس کی لو ہے
دنیا بھر میں چانن ہے
اس دیے کی لو سے
بُو آ رہی ہے
جلتی ہوئی لاشوں کی
جلتے ہوئے لہو کی بُو
اس لو کو
بہتر ہے
اپنے پاس ہی رکھ
اور خوب سنبھال

☆☆☆☆

علی ارمان

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

چیخیں

کبھی کبھی
میں سنتا ہوں
اپنے گھر کے
پکے فرش کے نیچے سے
کچے فرش
اور
روتی گھاس کی چیخیں

☆☆☆☆

تخلیق وترجمہ: جہانگیر عمران

ڈرتے ڈرتے کب تک جیتے رہیں گے ہم
مرتے مرتے کب تک جیتے رہیں گے ہم

آخر اک دن دوست! ہماری جیت بھی ہو گی
ہرتے ہرتے کب تک جیتے رہیں گے ہم

سائیں پشوری کر گئے جو باتیں وہ یارو!
کرتے کرتے کب تک جیتے رہیں گے ہم

یاروں نے جو زخم لگائے ہیں عمرانؔ
بھرتے بھرتے کب تک جیتے رہیں گے ہم

☆☆☆☆

شاہد لطیف ہاشمی

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

آس

باپ
آس لگائے بیٹھا تھا
مونگ پھلی کی فصل آئے گی
بیچ کے
بیٹی کے کانوں میں بُندے
پہنائے گا
مٹی میں مٹی ہو کر
فصلوں کو ڈھو ڈھو کر
منڈی پہنچا
تو
منشی نے پیسوں کی جگہ
ہاتھوں میں چِٹ
پکڑا دی
گُڑیا اور بابل کی
آس مٹا دی

☆☆☆☆

آلِ عمران

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

اللہ

جہاں تک ہو سکے
اس کے نام کی
تسبیح جاپو
وہ جو رہتا ہے
دل کے نزدیک
جو مانگو
وہ دیتا ہے
پر جو مانگو
دل میں مانگو
منہ سے کچھ نہ بولو

☆☆☆☆

شیراز اختر مغل

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

جلتی ہتھیلی

دوست
اور دشمن
اک جیسے دیکھے ہیں
کچھ
برف کے گولے
کچھ
آگ انگارے
جس سے بھی ہم ہاتھ ملائیں
ہاتھ جلائیں
ہاتھ جلائیں

☆☆☆☆

مختار کربلائی

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

یاد

بادل اب کے پھر گرجے ہیں
دل کی ویراں کھیتی پر
اُس سے ملنے کی حسرت
دل سے پُھوٹ کے بہہ نکلی ہے
آنگن کے اک کونے میں
ننھا سا اک پھول کھل اُٹھا ہے

☆☆☆☆

حمید کامران

پوٹھوہاری سے ترجمہ: نعمان رزاق

نوحہ

دل کو
دھوکے سے مت لگانا
جو آسان لگتا ہے
یہ نہ ہو
کہ وہ گانا جو آج اچھا لگتا ہے
کل وہی
دل کا نوحہ نہ بن جائے

☆☆☆☆

شکور احسن

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

دائرے

جب بھی
میں نے پوچھا
مقصد
اس حیاتی کا
بے ثباتی کا
کچھ نہ بولا
ہنس دیا
پتھر مار کے پانی میں

☆☆☆☆

عمران عامی

پوٹھوہاری سے ترجمہ: رفاقت رازی

نئے نویلے کپڑے لوگ پہنتے ہیں
میرے بچے روکھا سوکھا کھاتے ہیں

خوں میں ایندھن وہی پرانا جلتا ہے
حاکمِ وقت کے وہی پرانے قصے ہیں

ان کو بھی گردانتے ہو تم چوروں میں
جو کوڑے سے صرف کھلونے چنتے ہیں

اس میدان کے رگیروں کو علم نہیں
آگے جانے والے پیچھے آتے ہیں

میں نے اس کو پہلی بار ہی دیکھا تھا
شہر کے لوگ تو یوں ہی باتیں کرتے ہیں

وہ بیوی کو پیزا لا کر دیتا ہے
اور ماں باپ ہیں بھوکے بیٹھے رہتے ہیں

☆☆☆☆

پوٹھوہاری تخلیق وترجمہ: **فیصل عرفان**

خوابوں کی گٹھڑی

جب کوئی
خوابوں کی گٹھڑی
سر پہ رکھ کر
قریہ قریہ
گھومنے کا فن سیکھ لیتا ہے
تو آسودہ ہو جاتا ہے
لیکن
اکا دکا خواب لے کر
تعبیر ڈھونڈنے والے
اکثر پاگل ہو جاتے ہیں

☆☆☆☆

اختر رضا سلیمی

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

مست جوانی

اس کی
مست جوانی
جیسے
بہتے ہرو کا ٹھنڈا پانی
انت روانی
میں بھی اک تالاب بناؤں
مار کے ڈبکی
ڈوبا جاؤں
ہاتھ نہ آؤں
سارے گاؤں کو
ناچ نچاؤں

☆☆☆☆

اختر رضا سلیمی

پوٹھوہاری سے ترجمہ: شیراز طاہر

صوفی اور شاعر

اک دن دونوں آسماں کی سیر کو نکلے
دونوں کی آنکھوں نے دیکھا
دونوں کے کانوں نے سنا
دونوں نے
:کُن:
کی بجھارت کو بوجھا
دونوں رمز کتابیں
پڑھتے پڑھتے
آسماں سے اترے
ایک نے شور شرابا ڈالا
ڈوجا ذات کے اندر ڈوبا
دونوں نے ہی انت مچائی
حیرت میں ہے ساری خدائی

☆☆☆☆

ادبیات اور پاکستانی لٹریچر کے دستیاب شمارے

سہ ماہی ادبیات

نمبر شمار	شمارہ نمبر	دورانیہ	قیمت
1	22 (خصوصی شمارہ)	سرما 1993	40 روپے
2	23 (خصوصی شمارہ)	بہار 1993	40 روپے
3	24 (خصوصی شمارہ)	خزاں 1993	40 روپے
4	25 (خصوصی شمارہ)	سرما 1993	40 روپے
5	26 (خصوصی: پشتو، کھوار، ہندکو افسانہ)	بہار 1994	40 روپے
6	27 تا 30 (سالنامہ: خصوصی)	سرما، بہار، خزاں، گرما 1994	160 روپے
7	31 تا 34 (سالنامہ: خصوصی)	سرما، بہار، خزاں، گرما 95-96	300 روپے
8	35 تا 36 (بین الاقوامی ادب 1)	بہار گرما 1996	150 روپے
9	37 تا 38 (بین الاقوامی ادب 2)	1996	150 روپے
10	39 تا 40 (بین الاقوامی ادب 3)	بہار، گرما 1997	150 روپے
11	41 تا 42 (بین الاقوامی ادب 4)	خزاں، سرما 1997	150 روپے
12	43 تا 44 (بین الاقوامی ادب 5)	1998	150 روپے
13	47 (شیخ ایاز کی یاد میں)	بہار 99	50 روپے
14	50-49-48	1999	50 روپے
15	52-51	2000	50 روپے
16	53	خزاں 2000	50 روپے
17	54	2001	50 روپے

18	55	2001	50 روپے
19	56	2001	50 روپے
20	57	2002	50 روپے
21	58	2002	50 روپے
22	60-59	2002	350 روپے
23	75-74	2007	100 روپے
24	76	2007	50 روپے
25	78-77	2007-08	100 روپے
26	80-79	2008	
27	86-85 (امرتا پریتم نمبر)	اکتوبر 2009۔ مارچ 2010	300 روپے
28	89-88 (پرواسی ادب)	جولائی دسمبر 2010	200 روپے
29	91-90 (پاکستانی زبانوں کے چار اہم شاعر)	جنوری۔ جون 2011	200 روپے
30	93-92 بچوں کا ادب (نثر)	جولائی۔ دسمبر 2011	200 روپے
31	95-94 بچوں کا ادب (نظم)	جنوری۔ جون 2012	200 روپے
32	96	جولائی۔ ستمبر 2012	100 روپے
33	97	اکتوبر۔ دسمبر 2012	100 روپے
34	98	جنوری۔ مارچ 2013	100 روپے
35	99	اپریل۔ جون 2013	300 روپے
36	100 (خصوصی شمارہ)	جولائی۔ دسمبر 2013	200 روپے
37	101 (نعت نمبر)	جنوری۔ جون 2014	200 روپے
38	102	جولائی تا ستمبر 2014	100 روپے
39	103	اکتوبر تا دسمبر 2014	100 روپے
40	104: الطاف حسین حالی نمبر	جنوری۔ مارچ 2015	100 روپے
41	105	اپریل تا جون 2015	100 روپے
42	106	جولائی تا ستمبر 2015	100 روپے

43	107	اکتوبر تا دسمبر 2015	100 روپے
44	108: احمد ندیم قاسمی نمبر	جنوری تا جون 2016	200 روپے

شش ماہی پاکستانی لٹریچر

S #	Vol No	Issue	Price
1	Vol: 1 1992 No. 1	Regular	Rs.100
2	Vol: 2 1993 No. 2	Regular	Rs.100
3	Vol: 3 1994 No. 1	Regular	Rs.100
4	Vol: 3 1994 No. 2	Special (Women Writings)	Rs.150
5	Vol: 5 2000 No. 1	Regular	Rs.100
6	Vol: 6 No. 2 2001	Regular	Rs.100
7	Vol: 7 2002 No. 1	Regular	Rs.100
8	Vol: 7 2002 No. 2	Regular	Rs.100
9	Vol: 8 2003 No. 1	Literature from Pakistani languages	Rs.100
10	Vol: 8&9 2003-04 No. 2-1	Special (writings from SAARC countries)	Rs.150
11	Vol: 9 No. 2 (Book One)	50 Year Literature	Rs.100
12	Vol: 10 No. 1 (Book-2)	50 Year Literature	Rs.100
13	Vol: 10 No. 2 (Book-3)	50 Year Literature	Rs.100
14	Vol: 11 No. 1 2006	Literature from Pakistanni languages	Rs.100
15	Vol: 11 No. 2 2006	Regular	Rs.100
16	Vol: 12 No. 1 2007	New English Writings from Pakistan	Rs.100
17	Vol: 12-13 No. 2-1 2007-08	Special (Women Writers)	Rs.200
18	Vol: 13-14 No. 2-1 (Selection 1947-2010)	Regular	Rs.500

19	Vol: 14 2009 No. 2	Regular	Rs.200
20	Vol: 15 2012 No. 1	Regular	Rs.100
21	Vol: 16 No. 1- 2013	Regular	Rs.300
22	Vol: 18 , No 15, 2015	Regular	Rs.300

☆☆☆☆

شمارے حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے

میر نواز سولنگی

اسسٹنٹ ڈائریکٹر (سیلز اینڈ ایڈورٹائزمنٹ)

اکادمی ادبیات پاکستان، پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد۔

فون:051-9269711

ہر تشنۂ سُخن کو سبو دے دیا گیا

(نظمیں)

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
اللّٰہ نور السمٰوٰت والارض

فبای آلاء ربکما تکذبٰن

اعجاز ماند ہو، وہ ہنر ہو عطا مجھے
(عقیدت)

یہ وہ قصہ جو ہمارا ہی سنایا ہوا ہے

(افسانے)

کوئی اندازِ بیاں چھوڑ کے جانا اپنا

(غزلیں)

اُس نے تفویض کیے اپنے مطالب مجھ کو

(عالمی ادب)

مری داستان عجیب ہے

(خودنوشت، سفرنامہ)

آنے والوں کی امانت ہیں تمھاری سوچیں

(خصوصی گوشہ: پوٹھوہاری ادب)

میرے جذبوں کو میسر تھی قیادت میری

(پاکستانی زبانوں کے تراجم)

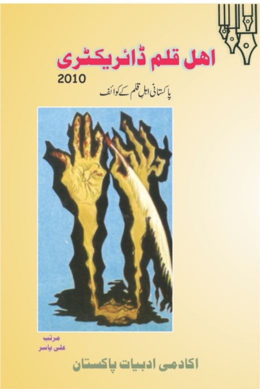
اہل قلم ڈائریکٹری
2010
پاکستانی اہل قلم کے کوائف
مرتب
علی یاسر
اکادمی ادبیات پاکستان

اہلِ قلم ڈائریکٹری ۲۰۱۶ء

اکادمی ادبیات پاکستان ''اہلِ قلم ڈائریکٹری'' کا نیا ایڈیشن مرتب کر رہی ہے۔ جس میں حسبِ روایت تمام پاکستانی زبانوں کے زندہ ادیبوں اور شاعروں کے کوائف شائع کیے جائیں گے۔ تمام پاکستانی اہلِ قلم سے گزارش ہے کہ اپنے درج ذیل کوائف بذریعہ ڈاک یا ای میل فوراً ارسال کریں تا کہ اُنھیں اہلِ قلم ڈائریکٹری میں شائع کیا جا سکے۔

قلمی نام ____________________ اصل نام ____________________

تاریخ پیدائش ____________________ مقام پیدائش ____________________

صنفِ ادب ____________________ زبان ____________________

مطبوعات (بمعہ صنف، سالِ اشاعت، ایڈیشن) ____________________

____

____

اعزازات ____________________ پتا ____________________

فون نمبر ____________________ ای میل ____________________

علی یاسر
انچارج: اہلِ قلم ڈائریکٹری
فون: 051-9269712
ای میل: directory@pal.gov.pk

Quarterly **Adabiyaat** Islamabad

July to September 2016

ISSN: 2077-0642

اکادمی ادبیات کی نئی مطبوعات

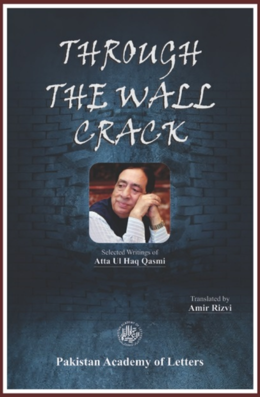
THROUGH THE WALL CRACK
Selected Writings of
Atta Ul Haq Qasmi
Translated by
Amir Rizvi
Pakistan Academy of Letters

نوبیل انعام یافتہ ادیبوں کی منتخب کہانیاں
(۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۵ء)
انتخاب و ترجمہ: نجم الدین احمد
اکادمی ادبیات پاکستان

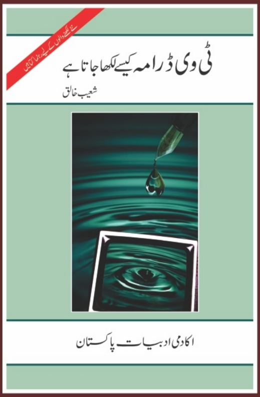
ٹی وی ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے
شعیب خالق
اکادمی ادبیات پاکستان

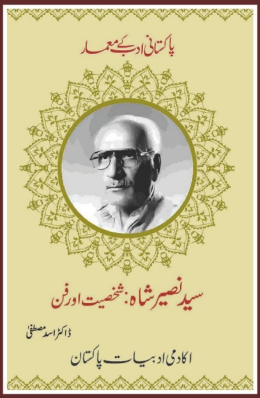
پاکستانی ادب کے معمار
سید نصیر شاہ: شخصیت اور فن
ڈاکٹر اسد مصطفیٰ
اکادمی ادبیات پاکستان

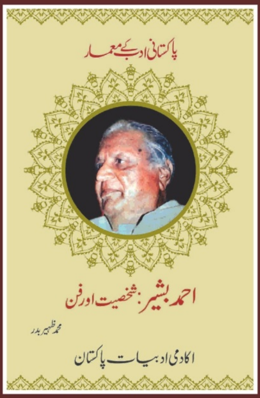
پاکستانی ادب کے معمار
احمد بشیر: شخصیت اور فن
محمد ظہیر بدر
اکادمی ادبیات پاکستان

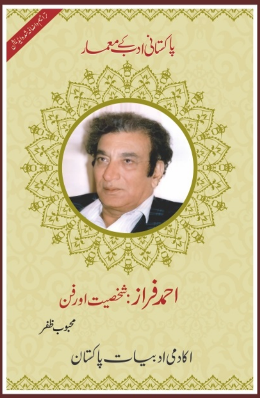
پاکستانی ادب کے معمار
احمد فراز: شخصیت اور فن
محبوب ظفر
اکادمی ادبیات پاکستان

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS
Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: adabiyaat@pal.gov.pk